روح کی پکار

خواجہ شمس الدین عظیمی

روح کی پکار

خواجہ شمس الدین عظیمی

انتساب

اُس روح

کے

نام

جو اللہ تعالیٰ

کا عرفان

حاصل کر لیتی

ہے

فہرست

باب اول 9

مراقبہ کیا ہے؟ 9

زمان و مکان کیا ہے.. 14

لوحِ محفوظ 17

خالقِ خدا.. 19

اللہ تعالیٰ نظر کیوں نہیں آتے 22

اللہ تعالیٰ کی امانت کے حصول کے بعد ظالم اور جاہل کیسے 24

کونسی طرزِ فکر اللہ کے قریب کرتی ہے؟.. 26

روحانی طرزِ فکر کا تجزیہ.. 30

روحانیت میں سب سے پہلے کیا ضروری ہے؟ 32

طرزِ فکر کی منتقلی کس قانون سے ہوتی ہے؟ 34

باب دوم 36

زمان (Time) کی حدود.. 36

نفس کیا ہے؟.. 37

درست طرزِ فکر کونسی ہے؟ 40

مرشد کو ظاہری آنکھ سے نہ دیکھا ہو 41

کیا مراقبہ خواب کا تسلسل ہے؟.. 44

اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب 47

اللہ تعالیٰ بہترین خالق ہیں......49
اللہ تعالیٰ ہر چیز پر محیط ہیں......52
اللہ تعالیٰ کے علم کا عکس......56
کائنات کے تخلیقی خدوخال......58
باب سوم......63
کسی چیز کو سمجھنے کے لئے بنیادی عمل نظر ہے......63
اللہ تعالیٰ کی صفات......67
علم استدراج اور علم نوری میں فرق......72
روحانی تصرّف کیا ہے؟......77
اختیاری اور غیر اختیاری طرزِ فکر......79
بخیلی اور سخاوت......83
زندگی کی بنیاد......85
حقیقت مُطلَقہ کیا ہے؟......90
یقین کے کیا عوامل ہیں؟......94
اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان سب مسخر کر دیا؟......99
باب چہارم......104
شُہود کی قسمیں......104
سائنسی ایجادات......110
علم کی حیثیت......115

کیا قرآنی آیات پڑھنی چاہئیں؟ 117
تعویذ کے اندر کونسی طاقت ہے؟ 118
فقہی علم کیا ہے؟ 119
سلطان کیا ہے؟ 121
مٹھاس یا نمک 123
خیالی اور حقیقی خواب 124
دعا آسمان سے کیوں پھینکی جاتی ہے؟ 125
باب پنجم 128
مرشد کس طرح فیض منتقل کرتا ہے؟ 128
کتنی نیند کرنی چاہئے؟ 133
کیا رنگین روشنیاں غذائی ضروریات پوری کرتی ہیں؟ 136
طریقت اور شریعت 140
روح کا عرفان 147
عام آدمی اور مؤمن میں فرق 149
حساب کتاب کیا ہوتا ہے؟ 150
استغنائی طرزِ فکر 153
خود ترغیبی کیا ہے؟ 155
کیفیت اور خیال میں فرق 159
باب ششم 163

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد 163
تدلّیٰ اور علم الاسماء 166
ارتقائی منازل 167
نورِ باطن 169
ذہن بیمار یا جسم بیمار 170
روح کہاں جاتی ہے؟ 172
علم الغیب کیا ہے؟ 172
اللہ کا پسندیدہ بندہ 174
فنا و بقا کیا ہے؟ 176
رنج و غم کیوں جمع ہوتے ہیں؟ 177
باب ہفتم 180
وَحدت الوجود اور وَحدت الشُہود 180
دماغ میں دو کھرب خانے 181
قلم خشک ہو گیا 183
ترقی کا فسوں 185
کون سا رنگ کون سا پتھر؟ 186
نماز میں حضورِ قلب پیدا ہو 187
روحانی تفسیر 188
روح سے وُقوف حاصل کرنا 190

نظر کا قانون..191
زمان و مکان(Time And Space)..192
باب ھشتم..194
شجرِ ممنوعہ کیا ہے؟..194
کائنات کا بنیادی مسالہ..195
اِرتکازِ توجّہ..196
جسم میں لطیفے..198
مادری زبان میں خیالات..199
تصوّرِ شیخ..201
کشش کیوں ہوتی ہے؟..204
معجزہ، کرامت، اِستدراج کیا ہے؟..204
قوّت ارادی کیا ہے؟..205
تخلیقی اختیارات..206
باب نھم..209
بغیر استاد کیا نقصان ہوتا ہے؟..209
سورج بینی کا کیا فائدہ ہے؟..210
رِحمۃلّلِعالمین..211
وہاں کی زبان کو سمجھنا..214
مراقبہ کا حکم..218

انسانی کوشش کا عمل دخل.......... 221

اسفل زندگی سے نکلنا.......... 223

اسمِ اعظم کیا ہے؟.......... 225

ہر شئے دور خوں پر ہے.......... 226

مؤکل کیا ہوتے ہیں؟.......... 230

باب دھم.......... 235

مذہب کی حقیقت کیا ہے؟.......... 235

حواس کہاں سے آتے ہیں؟.......... 238

شرحِ صدر کیا ہے؟.......... 239

تفکر کی صلاحیت.......... 240

عشاء کا وقت افضل کیوں ہے؟.......... 242

سعید روح اور شقی روح کیا ہے؟.......... 244

حافظے کی سطح.......... 245

حسبِ خواہش نتیجہ نہ ملنا.......... 248

نیگیٹیو بینی کیا ہے؟.......... 251

اس کتاب میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے.......... 255

یاحي یاقیوم کا کیا مطلب ہے؟.......... 256

بابِ اول

مراقبہ کیا ہے؟

سوال: مراقبہ ایک ایسا لفظ ہے جسے ہر خاص و عام جانتا ہے مگر مراقبہ کسے کہتے ہیں اور مراقبہ کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: جب ہم کوئی علم سیکھتے ہیں یا کسی چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم ایک طریقہ اختیار کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اس چیز کو سمجھنے اور جاننے کے لئے تفکر کرتے ہیں اور ہمارے ذہن میں یہ تجسّس پیدا ہو جاتا ہے کہ اس چیز کی اصلیت کیا ہے اور یہ کیوں اور کس لئے ہے۔ اگر چھوٹی سی بات کی بڑی اہمیت ہے اور اگر کسی بڑی سے بڑی بات پر غور و فکر نہ کیا جائے تو وہ بڑی بات غیر اہم اور زائد بن جاتی ہے۔ تفکر سے ہمیں کس شئے کے بارے میں علم حاصل ہوتا ہے اور پھر تفکر کے ذریعہ اس علم میں جتنی گہرائی پیدا ہوتی ہے اسی مناسبت سے کسی چیز اور اس کی صفات سے ہم باخبر ہو جاتے ہیں۔

مراقبہ دراصل اس تفکر کا نام ہے جس تفکر سے انسان اس علم کو حاصل کر لیتا ہے جو اس کی اپنی انا، ذات، شخصیت یا روح کا علم ہے۔ یہ علم حاصل ہونے کے بعد کوئی انسان اپنی انا یا روح سے وقوف حاصل کر لیتا ہے۔

بظاہر مراقبہ کا عمل ایسا لگتا ہے کہ کوئی شخص آنکھیں بند کر کے اور گردن جھکا کر بیٹھا ہوا ہے لیکن صرف آنکھیں بند کر کے اور گردن جھکا کر بیٹھنا مراقبہ کے مفہوم کو پورا نہیں کرتا۔ مراقبہ دراصل ایک طرز فکر ہے جس کے ذریعہ مراقبہ کرنے والا فرد خود کو ظاہری حواس سے لاتعلق اور آزاد کر کے باطنی حواس میں سفر کرتا ہے۔

اب ہم یہ تلاش کریں گے کہ مراقبہ سے ملتی جلتی کیفیت مراقبہ کی ایک مخصوص نشست کے بغیر بھی ہم میں موجود ہے یا نہیں۔

ظاہر حواس سے آزادی یادوری کی کیفیت ہماری زندگی میں ارادتاً یاغیر ارادی طور پر دونوں طرح ظاہر ہوتی ہے مثلاً ہم سوتے ہیں۔ سونے کی حالت میں ہمارا دماغ ظاہری حواس سے تعلق منقطع کرلیتاہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ قطع تعلق عارضی ہوتا ہے لیکن اس کیفیت کو ظاہری حواس سے قطع تعلق کے علاوہ اور کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مراقبہ دراصل نیند کو بیداری میں منتقل کرنے کادوسرا نام ہے۔

ہر انسان پیدائش سے موت تک دو کیفیات میں سفر کرتا ہے۔یعنی انسانی دماغ پر ہر آن اور ہر لمحہ دو کیفیات متحرک رہتی ہیں۔ایک کیفیت کانام بیداری اور دوسری کیفیت کانام نیند یاخواب ہے۔ بیداری کی حالت میں وہ زمان و مکان میں مقید ہے لیکن خواب کی حالت میں زمان و مکان کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مراقبہ کے ذریعہ خواب کو بیداری میں منتقل کرکے زمان و مکاں کی حدبندیوں سے آزادی حاصل کرنے کی مشق کی جاتی ہے۔ مراقبہ میں کم و بیش وہ تمام حالتیں انسان کے اوپر وارد ہو جاتی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ سو جاتا ہے یاخواب دیکھتا ہے۔

یہ اعتراض کہ خواب کی حیثیت محض خیالی ہے، صحیح نہیں ہے۔ تمام آسمانی کتابوں اور قرآن پاک میں خوابوں کالامتناہی سلسلہ بیان ہوا ہے۔قرآن شریف میں خوابوں کاذکر واضح طور پر نشان دہی کرتا ہے کہ خواب کی دنیا زمان و مکاں سے آزاد ہوتی ہے۔ جب کوئی انسان مراقبہ کے ذریعہ خود کو خواب کی کیفیت میں منتقل کرتا ہے تو اس پر سے زمان و مکان کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور مشق کرکے وہ خواب کی کیفیات میں اسی طرح سفر کرتا ہے جس طرح بیداری کی کیفیات اور واردات سے گزرتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور جناب خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کے ارشادات عالیہ ہیں جو موصوف نے محفل مراقبہ میں بیان فرمائے ہیں۔

اب میں ان محافل مراقبہ کاتذکرہ کرتاہوں۔ جو حضرت قبلہ کی سرپرستی میں منعقد ہوتی ہیں۔

موجودات کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کوئی بنیاد ہو۔ بنیاد کے بغیر کسی چیز کا قیام ممکن نہیں ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں ابہام ہو اور سمجھ میں نہ آتی ہو۔ مثلاً کرسی کی پہچان کا ذریعہ اس کے چار پیر

ہیں۔ کوئی مکان اس وقت مکان ہے جب زمین کے ایک مخصوص رقبہ پر بنیاد قائم کر کے ان بنیادوں پر دیواریں تعمیر کی جائیں۔ ہم کسی علم کو اس وقت سیکھ سکتے ہیں جب ہمیں اس کے فارمولے معلوم ہوں اور یہ فارمولے ہی اس علم کی بنیاد قرار پاتے ہیں۔

اللہ تعالٰی نے قرآن پاک میں ارشاد کیا ہے:

"اللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" (سورۃ النّور – آیت نمبر ۳۵)

یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کائنات اور کائنات کے اندر بے شمار عالمین اور کہکشانی نظام ہیں۔ اللہ تعالٰی کی مشیئت اور حکمت کیا ہے؟ یہ بات اللہ تعالٰی جانتے ہیں یا وہ مقربین جانتے ہیں جنہیں اللہ تعالٰی نے خود بتادیا ہے۔ اللہ تعالٰی نے کائنات کے تخلیقی فارمولے اپنے مقربین کو کس حد تک اور کتنے بتائے ہیں یہ بات زیر بحث نہیں ہے۔ بہر کیف ہم اتنا جانتے ہیں کہ یہ ساری کائنات اللہ تعالٰی نے انسان کے لئے تخلیق کی ہے اور اس کا تذکرہ بارہا قرآن پاک میں کیا گیا ہے۔ کائنات کی بنیاد اللہ کا نور ہے۔ کائنات کے قیام کی بنیاد کے پیش نظر یہ بات لازم اور ضروری ہو گئی کہ انسان خود اور انسان کے اندر کام کرنے والی تمام صلاحیتیں ایک بنیاد اور ایک مرکز پر قائم ہوں۔

ہمارا روز مرّہ کا مشاہدہ ہے کہ ہماری تمام حرکات و سکنات، توہمات، خیالات، تصورات اور احساسات گوشت پوست کے ڈھانچہ کے تابع نہیں ہیں۔ کیونکہ جب جسمِ انسانی سے روح اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے تو گوشت پوست کے جسم میں کوئی حرکت واقع نہیں ہوتی۔ جب تک روح جسم کے ساتھ موجود ہے زندگی کے تمام تقاضے اور زندگی میں کام آنے والی سب تحریکات موجود ہوتی ہیں یعنی جسمِ انسانی کی بنیاد روح ہے۔

اللہ تعالٰی کے ارشاد کے مطابق روح کا علم قلیل دیا گیا ہے لیکن محلِ نظر یہ بات ہے کہ قلیل اور لامحدود بھی ایک علم ہے۔ واضح یہ کرنا ہے کہ لامحدود علم کے قلیل لامحدود علم کو جاننے والوں نے اس علم کو سمجھنے کے لئے چند فارمولے بنائے ہیں اور ان فارمولوں کے اندر رہتے ہوئے اپنے شاگردوں کو اس علم سے روشناس کرایا ہے، اگر اس پر روشنی ڈالی جائے کہ:

یہ علم کہاں سے شروع ہوا؟اور

یہ فارمولے کس کس طرح ارتقاپذیر ہوئے؟

تو بات طویل ہو جائے گی۔ دراصل ہم بتانا یہ چاہتے ہیں کہ انسان فی الواقع وہ انسان نہیں ہے جسے ہم انسان کہتے یا سمجھتے ہیں۔ ہم گوشت پوست اور ہڈیوں کے پنجر کو آدمی کہتے ہیں۔ جبکہ یہ سب مفروضہ ہے۔ اصل انسان وہ ہے جو اس گوشت پوست کے جسم کی حفاظت کرتا ہے اور اسے متحرک رکھتا ہے اور جس کو قرآن پاک نے ‘‘روح’’ کا نام دیا ہے۔

****

ہر انسان اس بات سے واقف ہے کہ اس کی زندگی کا دارومدار گوشت پوست کے جسم پر نہیں ہے اور وہ زندگی میں دو باتوں کا تجربہ ضرور کرتا ہے۔

ایک یہ کہ وہ اپنے پورے شعوری حواس میں ہے اور زندگی رواں دواں ہے۔ دوسرا تجربہ یہ کہ وہ سو جاتا ہے لیکن پھر سانس کی آمد و شد کے ساتھ زندگی کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ انہی دو حالتوں میں وہ زندگی گزارتا ہے۔

سونے کی حالت میں اس کا رشتہ گوشت پوست کے جسم سے غیر شعوری رہ جاتا ہے۔

ان دو حالتوں کے علاوہ تیسری حالت جو ہر انسان پر وارد ہوتی ہے وہ موت ہے۔ موت ایسی حالت ہے کہ جس میں روح اس خاکی جسم سے رشتہ منقطع کر لیتی ہے۔ اس گفتگو کا حاصل یہ ہوا کہ انسان کے اوپر تین حالتیں وارد ہوتی ہیں۔ ایک بیداری، دوسری نیند، اور تیسری موت موت اور نیند میں یہ قدر مشترک ہے کہ نیند میں جسم سے روح کا واسطہ براہ راست ہوتا ہے، اور بیداری میں بالواسطہ یعنی شعور کی معرفت، اور موت میں روح اس جسم سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے۔ بات وہی ہے کہ زندگی کا قیام روح پر ہے اور جسمانی تقاضے جن بنیادوں پر قائم ہیں وہ روح کی تحریکات ہیں۔

روح زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لئے اپنا ایک میڈیم (Medium) بناتی ہے۔اس میڈیم کو ہم کروموسوم (Chromosome) کا نام دے سکتے ہیں۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔''

یعنی روح نے اپنے لئے ایک میڈیم بنالیا۔اور اس میڈیم کو پروان چڑھا کر حواس بخش دیئے۔روح دراصل اللہ تعالیٰ کا ایک جزو ہے اور اس جزو میں اللہ کی وہ تمام مشیئت اور وہ تمام اوصاف جس کا علم اللہ نے ودیعت کرنا پسند فرمایا۔اس میں موجود ہے۔یہ علم جزو کو کس طرح حاصل ہوا یہ اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔

انسان کے اندر تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار لطیفے (جنریٹر) کام کرتے ہیں۔صوفیائے کرام پر جن اسمائے الٰہیہ کا انکشاف ہوا ہے ان کی تعداد بھی تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار ہے۔اللہ کا ہر اسم اللہ کی ایک صفت ہے اور یہی علم شاخ در شاخ لامحدود دائروں میں پھیل کر اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بن جاتا ہے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے:

''تمہارے تمام سمندروں کا پانی روشنائی بن جائے اور سارے درخت قلم بن جائیں پھر بھی اللہ کی باتیں پوری نہیں ہوں گی۔''

(سورۃ لقمان—آیت نمبر 47)

زمان و مکان کیا ہے

سوال: زمان و مکان سے انسان کس طرح آزاد ہو سکتا ہے؟

جواب: غیب کے عالم میں داخل ہونا ہونا یا زمان و مکان سے ماوراء کسی چیز کو دیکھنا اس وقت ممکن ہے جب آدمی خود زمان و مکاں سے آزاد ہو جائے۔ زمان و مکاں سے آزاد ہونا اس وقت ممکن ہے جب کہ زمان و مکاں کو دیکھنے والی نظر زمان و مکاں کی حد بندیوں سے آزاد ہو جائے۔ زمان و مکاں سے آزادی کو متحرک کرنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جن سے انسانی ذہن اگر پوری طرح آزاد نہ ہو تو ایسی صورت حال ضرور پیدا ہو جائے کہ وہ آزادی سے قریب تر ہو جائے۔

اب یہ تلاش کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ آدمی کے حواس زماں و مکاں کی گرفت سے کب اور کس صورت آزاد ہوتے ہیں؟ اس کی ایک صورت ہمارے اوپر خواب کی کیفیت کا مسلّط ہو جانا ہے۔ سونے کا مطلب دراصل بیداری کے حواس یعنی زمان و مکاں کے تسلّط سے آزادی ہے۔ ہم جب سو جاتے ہیں تو بیداری کے حواس وہاں منتقل ہو جاتے ہیں جہاں زمان و مکاں کی کیفیت تو موجود ہے لیکن فی الواقع لمحات کے وہ ٹکڑے موجود نہیں ہیں جن لمحوں میں ہم قدم بہ قدم زندگی گزارتے ہیں۔ دوسری صورت جو بیداری میں واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کا ذہن پوری یکسوئی کے ساتھ کسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو جائے۔ مثلاً ہم کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں اور وہ کتاب ہمارے لئے اتنی دلچسپی رکھتی ہے کہ ہم ماحول سے بے خبر ہو جاتے ہیں تو بھی زمان و مکاں کسی حد تک ہمارے ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ اور جب ہم کتاب رکھ کر یہ دیکھتے ہیں کہ کئی گھنٹے گزر گئے اور وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اتنا طویل وقفہ گزر گیا۔

قرآن پاک میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو زمان و مکاں سے ماوراء انکشافات یعنی تورات عطا فرمانے کا ذکر ہے وہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

''ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور چالیس راتوں سے اسے پورا کر دیا۔'' رات اور دن کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں ''ہم داخل کرتے ہیں رات کو دن میں اور داخل کرتے ہیں دن کو رات میں۔'' دوسری جگہ ارشاد ہے ''ہم نکالتے ہیں رات کو دن میں سے اور نکالتے ہیں دن کو رات میں سے۔'' تیسری جگہ ارشاد ہے ''ہم ادھیڑ لیتے ہیں رات پر سے دن کو اور دن پر سے رات کو۔'' اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات میں تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ رات دن دو حواس ہیں اب ہم اس بات کو یوں کہیں گے کہ ہماری زندگی دو حواس میں منقسم ہے یا ہماری زندگی دو حواس میں سفر کرتی ہے۔ ایک حواس کا نام دن ہے اور دوسرے کا رات۔ دن کے حواس میں ہمارے اوپر زمان و مکاں کی جکڑ بندیاں مسلّط ہیں اور رات کے حواس میں ہم زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمایا کہ ''ہم نے موسیٰ سے تیس (۳۰) راتوں کا وعدہ کیا اور چالیس) ۴۰ (راتوں میں اسے پورا کر دیا۔''

بہت زیادہ فکر طلب ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طُور پر صرف چالیس راتیں نہیں رہے بلکہ آپ کا قیام وہاں چالیس دن اور چالیس راتیں رہا۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ وہ دن کے وقت کوہِ طُور سے نیچے آجاتے ہوں اور رات کے وقت دوبارہ تشریف لے جاتے ہوں۔ وہ مسلسل چالیس دن اور چالیس رات کوہِ طُور پر قیام فرما رہے۔ فکر طلب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دن کا تذکرہ نہیں کرتے بلکہ صرف رات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر چالیس دن اور چالیس راتیں رات کے حواس غالب رہے۔ وہی رات کے حواس جو زمان و مکاں سے کسی انسان کو آزاد کر دیتے ہیں۔

قانون یہ بنا کہ اگر کوئی انسان اپنے اوپر رات اور دن کے وقفے میں رات کے حواس غالب کرے تو وہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور زمان و مکاں سے آزادی دراصل غیبی انکشافات کا ذریعہ ہے۔

قرآن پاک اس پروگرام اور اس عمل کا نام ''قیامِ صلوٰۃ'' رکھتا ہے جس کے ذریعے دن کے حواس سے آزادی حاصل کر کے رات کے حواس میں سفر کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نماز قائم کرنے کا

لازمی نتیجہ دن کے حواس کی نفی اور رات کے حواس میں مرکزیت حاصل ہونا ہے۔ نماز کے ساتھ لفظ ''قائم کرنا'' اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ اگر کوئی نماز اپنی اس بنیادی شرط کو پورا نہیں کرتی کہ وہ کسی شخص کو رات کے حواس سے متعارف کرادے تو وہ حقیقی نماز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں حضرت علیؓ کا ایک مشہور واقعہ سامنے لانا بھی نماز کی تشریح اور وضاحت میں معاون ثابت ہوگا۔

کسی جنگ میں دشمن کا ایک تیر حضرت علیؓ کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ جب اس تیر کو نکالنے کی کوشش کی گئی تو حضرت علیؓ نے تکلیف محسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ ''میں نماز قائم کرتا ہوں۔'' حضرت علیؓ نے نیت باندھی اور لوگوں نے تیر کو کھینچ کر نکال لیا۔ اور مرہم پٹی کر دی۔ لیکن حضرت علیؓ کو اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ تیر نکال کر مرہم پٹی کر دی گئی ہے۔

اس واقعہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قیام نماز میں ان حواس کی نفی ہو جاتی ہے جن میں تکلیف اور پابندی موجود ہے۔ حضرت علیؓ نے جب نماز کی نیت باندھی تو وہ دن کے حواس سے نکل کر رات کے حواس میں پہنچ گئے۔ اور جیسے ہی ان کا ذہن رات کے حواس میں مرکوز ہوا ان کی توجہ دن کے حواس) پابندی ور تکلیف) سے ہٹ گئی۔

روحانیت کی بنیاد اس حقیقت پر قائم ہے کہ انسان میں دو حواس، دو دماغ اور دو زندگیاں سرگرم عمل ہیں۔ جیسے ایک ورق کے دو صفحات۔ یعنی دو رخ۔ دو زندگیوں میں سے ایک کا نام پابندی ہے اور دوسری زندگی کا نام آزادی۔ پابند زندگی دن، بیداری اور شعور ہے جبکہ آزاد زندگی کا دوسرا نام رات، راحت، سکون اور اطمینان قلب ہے۔

اس زندگی کو حاصل کرنے کے لئے روحانیت میں ایک بہت آسان طریقہ مراقبہ ہے۔ مراقبہ دراصل اس کوشش اس مشق اور اس طرز فکر کا نام ہے جس کے ذریعہ کوئی روحانی آدمی بیداری کے حواس کو قائم رکھتے ہوئے رات کے حواس میں داخل ہو جاتا ہے۔ چونکہ بیداری کے حواس سے رات کے حواس میں داخل ہونا اس کی عادت طرز

فکر اور ماحول کے خلاف ہے اس لئے جب وہ اس راستے پر قدم بڑھاتا ہے تو بیداری کے حواس اور شعور پر ضرب پڑتی ہے۔ اور بعض اوقات یہ ضرب اتنی شدید ہوتی ہے کہ نہ صرف شعوری توازن خراب ہو جاتا ہے بلکہ شعور بکھر جاتا ہے۔ اور انسان شعوری زندگی کی کڑیوں کو آپس میں ملانے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ اسی کو عرف عام میں پاگل پن کہا جاتا ہے۔

شعور کو اس ضرب سے محفوظ رکھنے کے لئے کسی ایسے آدمی یا ایسے استاد کی ضرورت پیش آتی ہے کہ جو صاحب نظر ہو اور اس راہ سے گزر چکا ہو اور اس طرح وہ کسی شخص کو قدم بہ قدم ضرب شدید سے بچاتا ہوا لاشعور میں داخل کر دے۔ اسی راہ سلوک سے واقف تجربہ کار استاد کو پیر یا مرشد کہا جاتا ہے۔ اور جب کوئی شخص کسی ایسے عرفان کے قانون سے واقف استاد کے دستِ حق پر بیعت کرتا ہے تو مرید کہلاتا ہے۔

لوحِ محفوظ

سوال: کائنات کا پروگرام لوحِ محفوظ سے کس طرح نزول کرتا ہے؟

جواب: کائنات کا یکجائی پروگرام لوحِ محفوظ پر ثبت ہے اور یہ پروگرام اللہ تعالیٰ کے ذہن کے مطابق مسلسل اور پیہم جاری و ساری ہے۔ لوحِ محفوظ پر جو کچھ ہے اس کی نشریات کا قانون یہ ہے کہ لوحِ محفوظ سے پورا پروگرام یکجا اور پیہم نزول کر کے لوح دوئم پر آ جاتا ہے۔ لوح دوئم کو تصوف میں عالم برزخ یا علم "جُو" کہتے ہیں۔ لوح دوئم سے یہی پروگرام انفرادی طور پر نشر ہوتا ہے اور لوح دوئم کی نشریات کا قانون یہ ہے کہ اس میں انسانی ارادے شامل ہوتے ہیں یعنی یہ کہ لوحِ محفوظ سے یہ پروگرام نشر ہوا کہ کسی آدمی کو ایک کام کرنا ہے۔ یہ کام ذہن انسانی پر بالکل اسی طرح وارد ہوتا ہے۔ اب انسان اپنا ذاتی ارادہ استعمال کرتا ہے۔ یہ ارادہ صعود کر کے لوح دوئم میں لوحِ محفوظ کے اس پروگرام کے ساتھ ہو جاتا ہے اور لوح دوئم سے یہ مخلوط دوبارہ نزول کر کے انسانی ذہن پر وارد ہوتا ہے اور وہ اس کام کو سر کر لیتا ہے۔ یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ لوحِ محفوظ سے نازل ہونے والے کسی پروگرام کے پورا ہونے کا

دارومدار اگر انسانی ارادوں پر ہے تو انسان لوحِ محفوظ کا تابع نہیں ہوا بلکہ لوحِ محفوظ کی تشریحات میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ انسان کو نیت اور ارادہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔اس کی مزید تشریح یہ ہے کہ لوحِ محفوظ پر پوری کائنات بشمول فرشتے، جنّات، سیارے، کہکشانی نظام، ہماری حرکات و سکنات اور ہماری پوری زندگی ریکارڈ ہے۔ یہ پوری کائنات نشر (Display) ہو کر جب لوح دوئم کی اسکرین پر آتی ہے تو یہاں ایک اور فلم بن جاتی ہے اور جب یہ فلم نشر ہوتی ہے تو کائنات میں موجود ہر تخلیق الگ الگ ہو جاتی ہے۔یعنی کہکشانی نظام الگ، نوعِ جنّات الگ، نوعِ ملائکہ الگ، نوعِ انسان الگ، نوعِ نباتات الگ اور نوعِ حیوانات الگ خدوخال میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ بات بہت ہی عجیب ہے کہ کائنات کی ہر تخلیق باہم دیگر ایک مخفی رشتہ کے ساتھ منسلک ہے یعنی جس طرح انسان کے اندر پوری کائنات موجود ہے اسی طرح فرشتہ کے اندر بشمول انسان پوری کائنات موجود ہے اور بکری اور کبوتر کے اندر بھی پوری کائنات موجود ہے۔اگر کائنات کی موجودگی اس طرح نہ ہو تو کوئی فرد دوسرے فرد کو پہچان نہیں سکتا۔ہم ستاروں کو اس لئے پہچانتے ہیں کہ ستاروں سے ہمارا ایک مخفی رشتہ ہے۔ان دیکھی مخلوق، ملائکہ اور جنّات کا یقین کرنے پر ہم اس لئے مجبور ہیں کہ ان کا تشخص اور تمثل ہمارے اندر موجود ہے۔ کوئی صاحب اگر یہ اعتراض کریں کہ ایک مکتبِ فکر جنّات کو مانتا ہی نہیں ہے تو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اس لئے کہ انکار بجائے خود اس بات کا اقرار ہے کہ کوئی چیز موجود ہے۔اگر کسی چیز کا وجود ہی نہیں تو انکار یا اقرار دونوں ہی زیرِ بحث نہیں آتے۔واضح یہ کرنا ہے کہ انسان کے اندر پوری کائنات تو موجود ہے لیکن چونکہ وہ اس بات سے واقف نہیں کہ وہ کائنات کا ایک حصہ ہے یا پوری کائنات کے اجزائے ترکیبی میں سے ایک جزو ہے اس لئے وہ اس بات کا مشاہدہ نہیں کر پاتا۔

شیخ یا مراد اس بات کو جانتا ہے کہ مرید کائنات کا ایک جزو ہے اور کائنات میں موجود ہر تخلیق کے ساتھ اس کا قریبی رشتہ قائم ہے۔ مراد مرید کی شعوری صلاحیت کے پیشِ نظر ایسا پروگرام ترتیب دیتا ہے جس پر قدم بہ قدم مرید کو چلا کر اس بات سے واقف کر دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تخلیقی کنبے کا ایک فرد ہے اور اس کا اس کے ساتھ ربط ضبط، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، محسوس کرنا، دیکھنا، سننا اور سمجھنا سب مشترک ہے یعنی تخلیقی اجزاء میں سے وہ ایک جزو ہے

اور ظاہر ہے کہ اجزاء میں سے ایک جزو کو الگ کر دیا جائے تو تخلیق نامکمل رہ جاتی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ کائنات میں موجود ہر تخلیق ایک دوسرے سے رشتہ رکھتی ہے اور ایک دوسرے کو پہچانتی ہے۔ جاننا اور پہچاننا اس وقت ممکن ہے جب جاننے اور پہچاننے کی صلاحیت موجود ہو اور صلاحیت کا پیدا ہونا اس وقت ممکن ہے جب صاحب صلاحیت کی طرف سے جاننے اور پہچاننے کی یہ صلاحیت منتقل ہو کہ صاحب صلاحیت دراصل اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات ہی سننے، دیکھنے، سمجھنے اور پہچاننے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا ایک کنبہ بنایا اور اس کنبے میں کھربوں کہکشانی نظام اور ان نظاموں میں سنکھوں نوعیں اور ان نوعوں میں انسانی شماریات سے باہر مخلوق پیدا کی اور ان کے اندر سوچنے سمجھنے اور زندہ رہنے کی تحریکات عطا کیں۔ اصل میں پہچان کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور وہ اس لئے کہ مخلوق جداگانہ ہیں اور ان تمام مخلوق کا پیدا کرنیوالا خالق یکتا اور ایک ہے۔

خالقِ خدا

سوال: ہر انسان جب اللہ کے بارے میں تفکر کرتا ہے تو ایک سوال اس کے ذہن میں ضرور آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے تخلیق کیا۔ آپ اس سوال کی وضاحت فرمادیں۔

جواب: یہ بات اس لئے ذہن میں آتی ہے کہ ہم زندگی کو شعوری پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ مثلاً ہر آدمی کے ذہن میں یہ بات ہے کہ میں پیدا ہوا اور میری پیدائش کا ذریعہ والدین بنے۔ علیٰ ہذالقیاس ہر مخلوق کے بارے میں اس کا شعوری مشاہدہ یہی ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان شعوری حواس یعنی شک، وسوسہ اور بے یقینی کی دنیا سے آزاد ہو کر یقین کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اس کے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ وہ اور پوری مخلوقات کو ایک ہستی نے بنایا ہے تو یہ بات اس کے ذہن سے حذف ہو

جاتی ہے۔یعنی اس لایعنی بات کا خانہ ہی ختم ہو جاتا ہے اور جب اس بات سے کہ خدا کو کس نے بنایا ہے، ذہن آزاد ہو جاتا ہے تو اس کی طرز فکر یہ بن جاتی ہے کہ وہ ہر بات اور ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتا ہے اور اللہ ہی کی طرف موڑ دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا (سورۃ آلِ عمران–آیت نمبر 79) ترجمہ: ''وہ لوگ جو راسخ فی العلم ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں ہمارا ایمان ہے اور اس بات پر یقین ہے کہ ہر چیز ہمارے رب کی طرف سے ہے۔''

جتنے پیغمبر علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ان سب کی طرز فکر یہی رہی کہ ہمارا بشمول کائنات اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک رشتہ براہ راست قائم ہے اور یہ رشتہ ہی کائنات کو جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔پیغمبروں کی تعلیمات بھی یہی رہیں کہ بندے کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ بندہ ذاتِ باری تعالیٰ کے رشتہ کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔یعنی اللہ تعالیٰ کے رشتہ کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔یعنی اللہ تعالیٰ جو کچھ جس طرح اور جب کرنا چاہتے ہیں وہی انسان کا عمل بنتا ہے۔پیغمبران علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اسی طرز فکر میں ایک اور طرز فکر شامل کی ہے وہ یہ کہ انہوں نے اچھائی اور برائی کا تصور عطا کیا اور اچھائی اور برائی کا یہ تصور اس لئے ظاہر فرمایا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ یہی چاہتے ہیں۔ اگر اچھائی اور برائی کا تصور نہ ہوتا تو اختیارات اور نیکی اور بدی نا قابل تذکرہ ہو جاتے ہیں۔اس بات سے کوئی آدمی انکار کی مجال نہیں رکھتا کہ شیطان کو بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ کہنا یہ ہے کہ شیطان یا شر کو ہم اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے جدا نہیں کر سکتے۔لیکن شیطان زندگی کا ایک ایسا رخ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے

ناپسندیدہ ہے اور شیطنت کے برعکس اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری اللہ تعالیٰ کے لئے پسندیدہ عمل ہے۔ لیکن جو لوگ تخلیق کے اس رخ سے واقف ہیں اور جن کا ایمان، یقین اور مشاہدہ ہو جاتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو وہ یہ بات بھی سمجھ لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کو اپنی زندگی بنا لیتے ہیں تو ان کے اندر سے شر نکل جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر شیطان ان پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت رابعہ بصریؒ سے کسی نے سوال کیا کہ آپ نے شادی نہیں کی۔ کیا آپ کو شیطان سے ڈر نہیں لگتا؟ حضرت صاحبہؒ نے فرمایا۔ ''مجھے رحمان سے ہی فرصت نہیں۔'' جب رحمان سے ہی فرصت نہیں تو شیطان کا خیال ہی نہیں آتا۔ اسی بات کو خواجہ غریب نوازؒ نے یوں فرمایا ہے ''یار دم بہ دم و بار باری آید۔'' حضور غریب نوازؒ فرماتے ہیں کہ ''میری سانس کے ساتھ اللہ بسا ہوا ہے اور میری ہر سانس اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔'' ظاہر ہے کہ جب ہر سانس کی وابستگی براہ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو تو وہاں شیطان کا عمل دخل نہیں ہو سکتا۔ بات مشکل ہے لیکن واقعتاً ایسا ہوتا ہے کہ ایسے برگزیدہ اور پاک نفس بندے موجود ہوتے ہیں جن کے ذہن سے شر کا خانہ نکل جاتا ہے۔ اور جب شر کا خانہ نکل جاتا ہے تو خیر کا خانہ بھی حذف ہو جاتا ہے۔ شر اور خیر دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے روشنی اور تاریکی، گرم و سرد، تلخ و شیریں، راحت اور تکلیف، خوشی اور غم، غصہ اور محبت وغیرہ لازم و ملزوم ہیں۔ بظاہر یہ بات خلاف عقل اور خلاف شرع معلوم ہوتی ہے لیکن ایسا ہی ہے۔ یہ وہ پاکیزہ نفوس ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہمارے بندے ایسے بھی ہیں جو ہماری آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ہماری زبان سے بولتے ہیں اور ہمارے ہاتھوں سے کام کرتے ہیں۔ ان بندوں کی طرز فکر میں یہ بات یقین کا درجہ حاصل کر لیتی ہے کہ ہماری حیثیت ایک معمول کی سی ہے اور ہم اللہ تعالیٰ

کی مشیئت کے تابع ہیں۔ مشیئت جو چاہتی ہے اور جیسا حکم دیتی ہے وہی ہوتا ہے۔ اگر مشیئت یہ چاہتی ہے کہ کسی زمین پر آباد بستی کو ختم کر دیا جائے تو ایسے بندے کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ قتل عام ہے۔ بس اس کے ذہن میں ایک ہی بات آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت یہ ہے کہ زمین کا تختہ الٹ دیا جائے۔ یہ تعریف ہے ان لوگوں کی جن کو صاحبِ خدمت کہا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس کے اندر اچھائی اور برائی کا تصور ہے اور وہ اچھائی کو اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتے ہیں اور برائی سے اس لئے بچتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ عمل ہے۔ خاتم النبیین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ دونوں طرز ہائے فکر ان کی امّت کو منتقل ہوئی ہیں۔

علم کے بارے میں گفتگو کے دوران حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ مجھے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے علم کے دو لفظ ملے ہیں۔ ایک کو میں نے ظاہر کر دیا اور دوسرے کو چھپالیا۔ لوگوں نے پوچھا کیا علم بھی چھپانے کی چیز ہے؟ آپؓ نے اس کو کیوں ظاہر نہیں کیا؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ میں اگر وہ لفظ ظاہر کر دوں تو تم لوگ مجھے قتل کر دو۔

اللہ تعالیٰ نظر کیوں نہیں آتے

سوال: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں تمہاری رگ جان سے بھی قریب ہوں۔ براہِ کرم اس کی تشریح کریں کہ جب اللہ تعالیٰ ہم سے اتنے قریب ہیں تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتے؟

جواب: سائنسدان کہتے ہیں کہ زمین نارنگی کی شکل کی ہے اور مستقل گردش میں رہتی ہے اور ہم اس کے اوپر بستے ہیں لیکن روحانیت میں جب زمین کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے یا روحانی لوگ جس طرح زمین کو دیکھتے ہیں تو زمین

انہیں پپیتے کی طرح نظر آتی ہے۔ فی الواقع ایسا پپیتا جس کے اطراف میں دیوار اور بیچ میں خلاء ہے اور ہم اور ہماری دنیا کے دوسرے موجودات یعنی درخت، حیوانات، چرند، پرند، درند، جنّات اور ملائکۂ عنصری (وہ فرشتے جو اس دنیا کو سنبھالے ہوئے ہیں) اس خلاء میں بستے ہیں۔ فرشتے اور جنّات اپنے وجود کے بارے میں کیا علم رکھتے ہیں اور اس زمین کے اوپر کس طرح رہتے اور چلتے پھرتے ہیں، یہ ایک الگ علم ہے۔ البتہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ ایک سطح یا فرش ہے جس پر وہ چلتا پھرتا ہے۔ وہ اس سطح پر بنیادیں اور دیواریں بنا کر مکان بناتا ہے اور اس میں رہتا ہے جس گھر یا کمرہ میں رہتا ہے وہاں بھی اس کا یہ تصوّر ہوتا ہے کہ میں زمین پر ہوں اور زمین سے چھت تک خلاء ہے اور مکان کی اونچائی ہے۔ چاہے وہ ایک منزل ہو یا بیس منزل۔ آسمان تک پھر خلاء ہے۔ اسی طرح جب فرشتوں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو بھی پہلے خلاء ذہن میں آتا ہے۔ پھر فرشتوں اور اللہ تعالیٰ کا تصوّر قائم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ میں زمین پر ہوں، زمین اور آسمان کے درمیان خلاء ہے، فرشتے آسمان کے اوپر ہیں۔

خلاء فی الحقیقت ایک راز ہے۔ اس راز سے ناواقفیت کی بنا پر ہمارے سمجھنے کی طرز میں یہ نقص واقع ہو گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا تذکرہ کرتے ہیں تو اللہ اور اپنے درمیان اربوں، کھربوں سال کا فاصلہ سمجھ کر بات کرتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اربوں کھربوں سال دور ایک مقام پر تشریف فرما ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں ''میں تمہاری رگِ جاں سے زیادہ قریب ہوں۔'' اللہ تعالیٰ نہ کبھی بندے سے دور ہوئے اور نہ ہی اللہ اور بندے کے درمیان کوئی فاصلہ ہے۔ سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ السلام کا ارشاد گرامی ہے ''جہاں تم ایک ہو وہاں دوسرا اللہ ہے، اور جہاں تم دو ہو وہاں تیسرا اللہ ہے۔'' قرآن کریم کی اس آیت اور حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی حدیث سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اللہ اور بندہ کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔

ہم چاہے ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالیں یا سینکڑوں بار قرآن پاک کی تلاوت کریں اور تمام وہ اعمال کریں جن کو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی سنت کہا جاتا ہے لیکن اللہ اور بندے کے درمیان دُوری کا تصوّر قائم رہے تو ان اعمال کے

اندر کام کرنیوالے انوار سے ہم بے خبر رہتے ہیں۔ ذرا تفکر کریں تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ جن دلوں میں ایمان موجود ہے ان کی نظروں کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے اور وہ اس بات سے واقف ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری رگ جان سے زیادہ قریب ہیں۔

شیطان ہمیشہ چھپ کر پردے کے پیچھے سے وار کرتا ہے مگر جس آدمی کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے وہ شیطان کو بھی دیکھ لیتا ہے اور ساتھ ہی واقف ہو جاتا ہے کہ یہ شیطان ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اللہ اور بندہ کے درمیان دُوری پیدا کردے۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک شخص جس کے بارے میں پورا یقین ہے کہ آپ کا دشمن ہے، آپ کے سامنے آجائے اور کہے کہ میرے ساتھ چلو۔ میں تمہاری دعوت کروں گا۔ بہت اچھی اچھی چیزیں دوں گا، تفریح کراؤں گا۔ باغ کی سیر کراؤں گا وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ آپ کو یقین ہے کہ وہ آپ کا دشمن ہے اور فوراً سمجھ جائیں گے کہ اس بہانے وہ آپ کو کسی سخت پریشانی میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ آپ اس کے فریب میں نہیں آئیں گے۔ یہی معاملہ شیطان کا بھی ہے۔ شیطان جب یہ دیکھ لیتا ہے کہ شخص اپنے چھپے ہوئے ازلی دشمن کو دیکھ سکتا ہے وہ خود ہی آپ کے سامنے نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ اگر اس نے ورغلانے کی کوشش بھی کی تو آپ اس کی بات نہیں مانیں گے۔ یہ نشانی ہے ان حضرات کی جن کے دلوں میں ایمان راسخ، مستحکم اور قائم ہے اور جو نظر کے قانون سے واقفیت رکھتے ہیں۔

امانت کے حصول کے بعد ظالم اور جاہل کیسے

سوال: قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''ہم نے سماوات، زمین اور پہاڑوں کو اپنی امانت پیش کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس امانت کے متحمل نہیں ہو سکتے اور اگر ہم امانت کا یہ بار اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھالیں گے تو ہمارا وجود عدم ہو جائے گا۔ اور ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور اس امانت کو انسان نے قبول کر لیا۔ بے شک یہ ظالم اور جاہل ہے۔ سوال یہ ہے کہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی امانت کے حصول کے بعد ظالم اور جاہل کیسے ہو سکتا ہے؟

جواب: تخلیقی فارمولوں کے تحت اللہ کی ہر مخلوق باشعور اور باحواس ہے اور اپنی خداداصلاحیتوں سے قائم زندہ اور متحرک ہے۔ آسمان، زمین اور پہاڑوں کی گفتگو ہمارا ذہن اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ انسان کی طرح آسمان، زمین اور زمین کے اندر تمام ذرّات اور زمین کے اوپر تمام تخلیق اور پہاڑ شعور رکھتے ہیں۔ جس طرح آدمی کے اندر عقل کام کرتی ہے اسی طرح مٹی کے ذرّات بھی اپنی موجودگی سے باخبر ہیں۔ کیونکہ کسی بات کا اقرار یا انکار بجائے خود فہم و ادراک اور شعور کی دلیل ہے۔ آیات مقدسہ میں تفکر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایسی زندگی جس میں بصیرت شامل نہ ہو وہ ظلم اور جہالت سے تعبیر کی جاتی ہے۔ پہاڑوں، آسمانوں اور زمین نے تفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ امانت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس طرح وہ ظلم و جہالت کے دائرے سے باہر نکل گئے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ کی جو امانت حاصل ہے اس سے صرفِ نظر اگر انسانی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ انسان مٹی کے ذرّات سے کم عقل اور کوتاہ نظر ہے۔ زمین کی صلاحیت اور قوتوں پر نگاہ ڈالنے سے جن مظاہرات کے خاکے سامنے آتے ہیں وہ اپنی جگہ بجائے خود اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ زمین ایک ہے، دھوپ ایک ہے اور پانی بھی ایک ہے۔ لیکن جب زمین تخلیق کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو ایسے ایسے رنگ بکھیرتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک ہی پانی زمین کی کوکھ میں جذب ہونے کے بعد اتنی تخلیقات میں جلوہ گر ہوتا ہے کہ ان کا کوئی شمار و قطار نہیں۔ لگتا ہے کہ زمین کے بطن میں بے شمار سانچے نصب ہیں، جس سانچے میں پانی ٹھہر جاتا ہے وہاں نیا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی کیلا بن جاتا ہے، کبھی سیب بن جاتا ہے، کہیں انگور بن جاتا ہے، کہیں پھول بن جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک چھوٹا سا بیج جب زمین کے پیٹ میں ڈال دیا جاتا ہے تو زمین اس بیج کو پرورش کر کے تناور درخت بنا دیتی ہے۔ بالکل اس طرح جیسے ماں کے پیٹ میں بچے کی نشو و نما ہوتی ہے۔

انسان اور زمین کا تجزیہ کیا جائے تو ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ زمین انسان سے زیادہ باصلاحیت ہے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق انسان اشرف المخلوقات ہے۔ انصاف اور بصیرت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم تلاش

کریں کہ اشرف المخلوقات ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ عام زندگی میں انسان کی جو صلاحیت مظہر بنتی ہے اور جو اعمال و حرکات اس سے سرزد ہوتے ہیں صرف ان سے اشرف المخلوقات ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ پیدائش، شعور، بھوک، پیاس اور خواہشات چاہے جسمانی ہوں یا جنسی انسان دوسری مخلوقات کے برابر ہے۔ البتہ مظاہراتی زندگی سے ہٹ کر انسان اس درجہ پر فائز ہے جو آسمانوں، پہاڑوں اور زمین کو حاصل نہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا امین ہے۔ کوئی انسان اگر اس امانت سے واقفیت رکھتا ہے۔ تو وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہے۔ بصورت دیگر آدم زاد اور دوسری مخلوقات میں کوئی خطِ امتیاز نہیں کھنچا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمت حاصل ہونے کے باوجود اس نعمت سے بے خبر ہونا سراسر ظلم اور جہل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس خصوصی انعام سے مستفیض ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں اپنی ذات کا عرفان حاصل ہو۔ تصوف میں اس علم کو خود آگاہی کا نام دیا جاتا ہے۔ خود آگاہی کے بعد انسان کے اوپر علوم کے جو دروازے کھلتے ہیں ان میں سے گزر کر بالآخر اللہ کے ساتھ بندے کا رشتہ مستحکم اور مضبوط ہو جاتا ہے اور جب کوئی بندہ مستحکم رشتے کے دائرے میں قدم رکھ دیتا ہے تو وہ اس امانت سے وقوف حاصل کر لیتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اس کو ودیعت فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پیش کردہ اس امانت سے واقف ہونا ہی انسان کو اشرف المخلوقات کے مرتبے پر فائز کرتا ہے اور اگر وہ اس امانت سے واقف نہیں ہے تو بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے۔

کونسی طرزِ فکر اللہ کے قریب کرتی ہے؟

سوال: قرآن پاک کی تعلیمات وارشادات میں تفکر کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن پاک میں دو طرزِ فکر بیان کی گئی ہیں۔ ایک طرزِ فکر وہ ہے جو بندے کو اللہ سے قریب کرتی ہے۔ جہاں وہ تمام مصائب، غم و آلام اور حُزن و ملال سے آزاد ہو کر زندگی گزارتا ہے۔ اطمینان اور علم و آگہی کی روشنی اس کی رگ وپے میں سما جاتی ہے۔ اس کے برعکس دوسری طرزِ فکر وہ ہے جو بندے کو شیطان سے قریب کرتی ہے اور جس کے نتیجے میں وہ پریشانی، افسردگی،

درماندگی، حُزن و ملال کی تصویر بن جاتا ہے۔اس کے ذہن کی وسعت سمٹ جاتی ہے۔ علم و آگہی کے دروازے اس کے اوپر بند ہو جاتے ہیں اور دل زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک کی دعوت یہی ہے کہ بندہ اس طرزِ فکر کو اپنے ذہن میں راسخ کرلے جو اسے اس کے خالق سے قریب کرتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ طرزِ فکر کیا ہے جو بندے کو اس کے ربّ سے قریب کر دیتی ہے؟

جواب: انسان کی زندگی پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ خواہشات کے مجموعہ کا نام آدمی ہے اور خواہشات کے حُصول کے بہت سے ذرائع اس کی زندگی ہیں۔ انسان کے اندر خواہشات ابھرتی ہیں، وہ ان خواہشات کو پورا کرنے کے لئے مختلف ذرائع تلاش کرتا ہے اور ذہنی و عملی جدوجہد کر کے ان کی تکمیل کرتا ہے۔ دراصل زندگی خواہشات اور تقاضوں کا دوسرا نام ہے۔ مثلاً بھوک ایک خواہش ہے، پیاس ایک خواہش ہے۔ آدمی کے دل میں یہ تقاضا پیدا ہوتا ہے کہ وہ کسی سے پیار کرے اور کوئی اس سے پیار کرے، یہ بھی ایک خواہش ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کا نام باقی رہے۔ یہ بھی ایک خواہش ہے۔ مطلب یہ کہ انسان سراپا احتیاج ہے، ضرورت ہے۔

انسان کی عمومی حالت یہ ہے کہ وہ زندگی کے وسائل حاصل کرنے کے لئے اور اپنے تقاضے پورے کرنے کے لئے لوگوں سے توقعات وابستہ کرتا ہے۔ کبھی اس کا رخ والدین کی طرف ہوتا ہے کہ والدین اس کی ضروریات پوری کریں۔ کبھی یہ رخ اولاد کی طرف ہو جاتا ہے کہ اولاد بڑھاپے کا سہارا بنے گی۔ کبھی وہ اپنے قوّتِ بازو پر بھروسہ کرتا ہے اور علم و دانش کو وسائل کے حُصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ کچھ حاصل ہو جاتا ہے تو کہتا ہے ''میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اپنے علم اور اپنی قُوّتِ بازو سے حاصل کیا ہے''۔ کبھی قارون و فرعون بن کر دعویٰ کرتا ہے کہ میں لوگوں کا حاجت روا ہوں۔

اس طرح وہ خود کو فریب دے کر سراب زدہ مسافر کی طرح بھٹکتا رہتا ہے اور نتیجہ میں اس کو خسارے اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ اپنی زندگی کا مقصد اور تمام جسمانی و ذہنی کوششوں کا رخ صرف اور صرف جسمانی تقاضوں اور خواہشات کی تکمیل بنالیتا ہے۔ اور پھر جب اس کی زندگی کا مقصد کوئی نہیں رہتا تو خواہشات کا سلسلہ

اتنا طویل ہو جاتا ہے کہ جو کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں جو کسی اور مقصد کے لئے ودیعت کی گئی ہیں محض خواہشات کی تکمیل میں خرچ ہو جاتی ہیں۔

انبیائے کرام علیہم السّلام کے تذکروں، ان کی طرزِ فکر اور ان کی تعلیمات پر غور کیا جائے تو ایک مشترک بات یہ سامنے آتی ہے کہ ان تمام قدسی نفس حضرات نے نوع انسانی کے اندر یہ طرزِ فکر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ فی الواقع انسان کا اصل رشتہ اللہ سے ہے۔ اللہ ہی اسے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہی زندگی میں کام آنیوالے وسائل تخلیق کر کے انسان کی جملہ ضروریات پوری کرتا ہے۔ زندگی کے تقاضے بھی اللہ کی طرف سے ہیں اور ہم زندگی میں ہر قدم پر یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہمارے اندر زندگی کا جو بھی تقاضا ابھرتا ہے اس کی تکمیل کے لئے وسائل پہلے سے موجود ہیں۔ یعنی زندگی کے تمام تقاضے پورے کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وسائل فراہم کر دیئے ہیں اور وسائل کی فراہمی اس بات کی شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ہر ضرورت کے کفیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص میں اپنی صفات کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا ہے:

"کہو اللہ یکتا ہے، اللہ احتیاج اور ضرورتوں سے مبراء ہے، وہ نہ کسی کا بیٹا ہے اور اور نہ کسی کا باپ اور نہ ہی اس کا کوئی خاندان ہے۔"

اس سورۂ مبارکہ میں پانچ باتوں کا ذکر ہوا ہے (۱۔) اللہ کثرت نہیں ہے۔ (۲۔) وہ احتیاج اور ضرورتوں اور کسی سے توقع قائم کرنے سے پاک ہے۔ (۳۔) وہ نہ کسی کا باپ ہے۔ (۴۔) اور نہ کسی کی اولاد ہے۔ (۵۔) اور نہ اس کا کوئی خاندان ہے۔

تفکر سے بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان پانچ باتوں میں سے صرف ایک بات ایسی ہے جس میں بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست رشتہ ہے۔ بندہ یکتا نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی کا باپ ہوتا ہے یا کسی کا بیٹا ہوتا ہے اور اس کا خاندان ہونا بھی ضروری ہے۔ صرف ایک بات میں یعنی" اللہُ الصَّمَد "کہ اللہ احتیاج اور ضرورتوں سے ماوراء ہے۔ کوئی بندہ اللہ کے ساتھ ہم رشتہ ہو سکتا ہے وہ اس طرح کہ وہ اپنی تمام ضروریات، توقعات اور اپنے ہر عمل کو اللہ کی طرف موڑ

دے اور صرف اسی سے وابستہ ہو کر رہ جائے۔اس عمل کو تصوّف میں اِستغناء کہا جاتا ہے۔اِستغناء اللہ سے قریب ہونے کا اور اللہ کا عرفان حاصل کرنے کا آسان ترین طریقہ ہے۔انبیائے کرام علیہم السّلام اوران کے شاگرد اولیاء اللہ کی طرزِ فکر یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی تمام ضروریات صرف اور صرف اللہ سے وابستہ رکھتے ہیں۔

اِستغناء کی صفَت کا حامل بندہ اپنی زندگی (Routine) میں گزارتا ہے۔یعنی وہ زندگی کے تمام اعمال و حرکات اور تمام تقاضوں کو ضرورت کے تحت پورا کرتا ہے۔اسے مقصد زندگی نہیں بنالیتا۔اس کا مقصد زندگی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔وہ کھاتا ہے تو اس لئے کہ بھوک اللہ کا پیدا کردہ ایک تقاضہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو پورا ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی تعلیم و تربیت مناسب طریقہ پر ہو۔اِستغناء کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ انسان ایک جگہ بے حس و حرکت ہو کر بیٹھ جائے۔اِستغناء کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ہر توقع اللہ کے ساتھ وابستہ کرلے اپنی کوششوں کے نتائج اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے اور اپنی ہر حرکت اور ہر عمل کو اللہ کی ذات کی طرف موڑ دے اور ہر معاملہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھے۔رحمانی طرزِ فکر کے حامل بندے کا طرز عمل یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر شئے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتا ہے اور اپنے تمام معاملات کو اللہ کے اوپر چھوڑ دیتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں انسانی ذہن کا خلفشار اور بے چینی عروج پر ہے۔عامتہُ المسلمین کی ذہنی پریشانی، عدم تحفّظ کا احساس، خوف اور مستقبل کی طرف سے مایوسی کی وجہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہ ہم نے اپنے معاملات کو اللہ پر چھوڑنے کی بجائے مادی وسائل اور ذرائع کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ہم آرزوؤں اور خواہشوں کی تکمیل کے لئے دن رات کوشش میں مصروف ہیں اور ہماری خواہشات ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ایک دوڑ ہے جو ہمیں ہوس پرستی کے خیالی گھوڑے پر آگ کی طرف دھکیل رہی ہے اور ذہنی کرب کے نقوش ہمارے چہرے سے عیاں ہیں۔

ان تمام مسائل سے نجات کا واحد راستہ اِستغناء ہے جو تمام انبیائے کرام علیہم السّلام کی سنت ہے۔اِستغناء کی تفسیر یہی ہے کہ اپنی زندگی کی ڈور اللہ کے سپرد کر دی جائے اور مکمل طور پر اس کو اپنی ضروریات کا کفیل سمجھا جائے۔اپنے ہر عمل اور ہر حرکت کا رخ اسی طرح رکھا جائے۔عمل کے پہلو سے کبھی منہ نہ موڑا جائے۔البتہ اس کے نتائج کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر چھوڑ دیا جائے۔

روحانی طرزِ فکر کا تجزیہ

سوال: روحانی نقطۂ نظر سے اچھائی اور برائی کیا ہے؟

جواب: اچھائی کیا ہے؟ ایک ایسی اطلاع ہے جو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس قسم کا طرزِ زندگی گزارنے اور اس قسم کے اعمال و حرکات سے ہم مطمئن اور پر سکون رہ سکتے ہیں اور اس اطمینانِ قلب کی بنا پر ہم غم آشنا زندگی اور خوف و ہراس سے نجات حاصل کر کے غیب کی پر سکون وادیوں (جنّت) میں گھر قائم کر سکتے ہیں۔ عالمِ غیب کی راہوں پر سفر کرتے ہوئے کائنات اور اللہ تعالیٰ کا تعارف حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ یہ اطلاع ہے۔ ایسی اطلاع جو اللہ تعالیٰ کے نبیوںؑ کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہے۔

دوسرا رخ برائی ہے۔ برائی کیا ہے؟ ایسی اطلاعات کا مجموعہ ہے جو حُزن و ملال، خوف، غم، حسد، طمع، لالچ، مصائب زدہ حیات اور غیر مطمئن طرز عمل پر مشتمل زندگی ہے۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ یہ بھی ایک اطلاع ہے۔ اور یہ اطلاع بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ ہم تک پہنچائی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صدورِ اطلاعات کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کو مبعوث کیا اور ان کے مقابل ایک تشخّص بنایا جس کا نام شیطان رکھا گیا۔ یعنی کائنات میں مکلّف مخلوق کے اندر اطلاعات کا ذریعہ وہ تشخّص ہے۔ ایک تشخّص برائی کا ہے اور دوسرا تشخّص بھلائی کا ہے۔ برائی کا تشخّص اللہ تعالیٰ سے دور کر دیتا ہے اور بھلائی کا تشخّص اللہ تعالیٰ سے قریب کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی دونوں میں امتیازی خط کھینچنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو وہ غیر مکلف کہلاتا ہے۔، وہ ایک ہو یا دس بیس یا پچیس ہزار آدمی ہوں۔ مطلب واضح ہے کہ جب کوئی اطلاع ہمارے دماغ کے لئے قابلِ قبول ہے اور ہمارا دماغ ان اطلاعات میں معنی پہنا سکتا ہے تو ہم مکلّف ہیں۔ بھلائی اور برائی کے دو رخوں میں بند ہیں۔ اور جکڑے ہوئے ہیں۔ ایک بات بہت زیادہ فکر طلب ہے کہ اطلاع ایک ہے اور ایسی اطلاعات کو دو معنوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک اطلاع ہے بھوک۔ اس لئے کہ آدمی کھا پی کر زندگی کو قائم رکھتے ہوئے حرکت کرنے کے قابل ہے۔ بھوک رفع کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ محنت مزدوری کر کے ایماندارانہ اور مخلصانہ

طرزوں سے بھوک کو رفع کیا جائے اور بھوک کے تقاضے اس طرح پورے کئے جائیں جو بھلائی کے دائرے میں نہیں آتے۔ یہ اطلاع میں دوسرے معنی پہنانے کے مترادف ہے۔ایک گائے اور آدمی میں یہی فرق ہے کہ گائے ہر اطلاع میں معنی نہیں پہنا سکتی۔ جہاں چاہے منہ مار دیتی ہے اور پیٹ بھر لیتی ہے لیکن زندگی کے وہ سب تقاضے بھی اس کے اندر موجود ہیں جو انسان کے اندر موجود ہیں۔اس کے اندر ماں کی شفقت اور بچوں کی پرورش کا جذبہ بھی ہے۔ وہ خوش بھی ہوتی ہے اور غمگیں بھی، کوئی رنج پہنچے تو رونے کا مظاہرہ بھی کرتی ہے۔ بچپن میں، میں نے خود دیکھا ہے کہ ایک گائے کا بچہ مر گیا اور گائے مسلسل تین دن تک آنسوؤں سے روتی رہی۔اس کو اپنے تحفّظ کا احساس بھی ہے اور سردی گرمی سے محفوظ رہنے کا طریقہ بھی جانتی ہے۔

”بڑی عجیب بات ہے کہ دانشوروں نے انسان کو حیوانِ ناطق کہا ہے۔ایسا حیوان جو اپنا مفہوم باتوں میں بیان کر سکے۔ لیکن جب ہم بقول ان کے غیر ناطق حیوانوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ وہ بھی زبان رکھتے ہیں۔ خیالات کی لہروں کا تبادلہ ان کے اندر بھی ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہیں۔ یہ جملۂ مُعترضہ ہے۔“

بہرکیف ہم بتا یہ رہے تھے کہ اطلاعات میں معنی پہنانے کا یہ تصوّر انبیاء علیہم السّلام سے منتقل ہوا ہے۔ انبیاء علیہم السّلام کی مقدس زندگی پر غور کیا جائے تو ایک ہی بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ انہوں نے بھلائیوں کو خود اختیار کیا ہے اور اپنی امّتوں کے لئے بھلائی اور برائی میں حد فاصل قائم کرنے کے لئے قاعدے اور ضابطے بنائے ہیں۔ جب ہم کوئی بھلائی اختیار کرتے ہیں تو دراصل پیغمبر ﷺ کی زندگی کو اپناتے ہیں۔ پیغمبر اللہ کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ کے دوستوں کو اس زندگی میں اور مرنے کے بعد کی زندگی میں کوئی خوف نہیں ہوتا نہ غم۔۔۔! دوست کا دوست بھی دوست ہوتا ہے۔انبیاءؑ کا طرز عمل اختیار کرنے والا کوئی بندہ انبیاءؑ کا دوست ہوتا ہے اور انبیاءؑ کے دوست اللہ کے دوست ہوتے ہیں۔

روحانیت میں سب سے پہلے کیا ضروری ہے؟

سوال: بتایا گیا ہے کہ تصوّف یا روحانیت کا منشاء بندے کو غیب کی دنیا سے متعارف کرانا اور اس دنیا میں داخل کر دینا ہے۔ اس راستہ پر چلنے والے کسی مبتدی کے لئے سب سے پہلے کیا چیز ضروری ہے؟

جواب: لا متناہی اور غیب کی دنیا سے متعارف ہونے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہمارے اندر اس دنیا کی موجودگی کا یقین ہو۔ یقین ہونا اس لئے ضروری ہے کہ کیونکہ بغیر یقین کے ہم کسی چیز سے استفادہ نہیں کر سکتے۔

پانی پینے سے پیاس اس لئے بجھ جاتی ہے کہ ہمارے یقین کے اندر یہ بات راسخ ہے کہ پانی پیاس بجھا دیتا ہے۔ ہم زندہ اس لئے ہیں کہ ہمیں اس بات کا یقین حاصل ہے کہ ہم زندہ ہیں۔ جس وقت اور جس لمحہ اور جس آن زندگی سے متعلق یقین ٹوٹ جاتا ہے آدمی مر جاتا ہے۔ تفکر کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہماری زندگی اور ہماری زندگی کا ہر عمل یقین کے اوپر قائم ہے۔ کسی آدمی کے ذہن میں یہ بات آ جائے اور یہ بات یقین کا درجہ حاصل کر لے کہ اگر میں گھر سے باہر قدم نکالوں گا تو میرا ایکسیڈنٹ ہو جائے گا تو گھر کے افراد کتنا ہی یقین دلائیں کہ تمہارا ایکسیڈنٹ نہیں ہو گا، وہ گھر سے باہر نہیں نکلے گا۔ اسی طرح اگر کسی آدمی کے اندر یہ بات یقین کا درجہ حاصل کر لے کہ کھانا کھانے کے بعد بیمار ہو جاؤں گا۔ تو وہ کھانا نہیں کھائے گا۔

مختصر یہ کہ آدمی کی زندگی کا ہر قدم یقین کے دائرے میں محدود ہے۔ یہ تذکرہ اس زندگی کا ہے جو عارضی اور مفروضہ ہے یعنی ایسی زندگی جس کا تعلق اس گوشت پوست سے ہے جو بالآخر مٹی بن جاتا ہے۔ مفروضہ اور فکشن زندگی میں جب یقین کو یہ درجہ حاصل ہے تو غیب کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے یقین کا حاصل ہونا اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔

قانون یہ ہے کہ جب تک کسی بندے کے اندر یہ یقین پیدا نہ ہو جائے کہ فرشتہ موجود ہے، وہ فرشتہ کو نہیں دیکھ سکتا۔ یقین کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ جب آدمی کا ذہن یقین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے تو وہ چیز جس کے بارے میں ذہن نے یقین کا درجہ حاصل کر لیا ہے سامنے آجاتی ہے۔

اگر فی الواقع ہمارے اندر فرشتے کے تشخّص کا یقین پیدا ہو جائے تو ہم فرشتے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کا یقین مستحکم ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل ہو جائے گا۔

سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی ذاتِ اقدس و اطہر کے بارے میں فی الواقع ہمارے اندر یقین پیدا ہو جائے تو ہم حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتے ہیں اور ہماری یہ گناہ گار آنکھیں حضور ﷺ کا دیدار اسی طرح کر لیتی ہیں جس طرح فکشن اور مفروضہ حواس میں رہتے ہوئے کسی چیز کو دیکھتے ہیں۔

یقین ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ایسی زندگی بسر کرتے ہیں جس میں ہر قدم پر آدمی کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسی بات کو قرآن پاک میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ اللہ ابتدا ہے، اللہ انتہا ہے، اللہ ظاہر ہے، اللہ چھپا ہوا ہے، اللہ ہر چیز پر محیط ہے۔ اللہ قادر مطلق ہے۔ اللہ پیدا کرتا ہے۔ اللہ وسائل فراہم کرتا ہے، اللہ حفاظت کرتا ہے، جب تک چاہتا ہے اس دنیا میں رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے اس دنیا سے بلا لیتا ہے۔

زندگی کا محاسبہ کیا جائے تو زندگی کے کسی بھی عمل اور زندگی کے کسی بھی رخ میں ہم اللہ تعالیٰ کی موجودگی سے انکار نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا آنا بھی اللہ کی طرف سے ہے اور ہمارا جانا بھی اللہ کی طرف سے ہے۔

اس یقین کو حاصل کرنے کے لئے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے وارث اولیاء اللہ نے ضابطے، قاعدے اور فارمولے بنائے ہیں۔ یہ ضابطے، قاعدے اور فارمولے قدم قدم چلا کر انسان کے اندر یقین کی وہ دنیا روشن کر دیتے ہیں جس یقین کے اوپر غیب کی دنیا سے متعارف ہونے کا دارومدار ہے۔

طرزِ فکر کی منتقلی کس قانون سے ہوتی ہے؟

سوال: روحانیت کو ایک مخصوص طرزِ فکر کا حُصول (منتقلی) کہہ کر بیان کیا گیا ہے، طرزِ فکر کی یہ منتقلی کیوں کر اور کس قانون کے تحت عمل میں آتی ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت یہ بات ہمارے سامنے ہے کہ ہر نوع میں بچے اس مخصوص نوع کے نقش و نگار پر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک بلی آپ سے کتنی ہی مانوس ہو لیکن اس کی نسل بلی ہی ہوتی ہے۔ کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ بکری سے گائے پیدا ہوتی ہو یا گائے سے کبوتر پیدا ہوتا ہو۔ کہنا یہ ہے کہ شکمِ مادر میں ایک طرف نوعی تصوّرات بچے کو منتقل ہوتے ہیں اور دوسری طرف ماں کے یا باپ کے تصوّرات بچے کو منتقل ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان تصوّرات میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق مقداریں متعین ہیں۔

تیسویں پارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”پاک اور بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے تخلیق کی۔ اور مقداروں کے ساتھ ہدایت بخشی۔“ یہ مقداریں ہی کسی نوع کو الگ کرتی ہیں اور نوعوں میں افراد کو الگ کرتی ہیں۔

اس نقطہ نظر سے جب ہم سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی بعثت کے بارے میں غور کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ حضور ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی اولاد ہیں یعنی حاصلِ کائنات ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام تک تمام انبیائے کرام کی معین مقداریں منتقل ہوئیں یعنی تمام انبیاء کا وہ ذہن جس میں اللہ بستا ہے حضور ﷺ کو بطور ورثے کے منتقل ہوا۔ اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا ذہن مبارک بعثت سے پہلے ہی تمام انبیاء کی منازل طے کر چکا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنا کرم فرمایا تو حضور ﷺ کو وہ مقام عطا ہوا جو کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ دوسری بات یہ بہت زیادہ غور طلب ہے کہ قرآن پاک میں جتنے انبیاء کا تذکرہ ہوا ہے وہ تقریباً سب حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی اولاد ہیں۔ یعنی ایک نسل کی طرزِ فکر برابر منتقل ہوتی رہی۔

چوں کہ نبوت ختم ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ کا قانون جاری و ساری ہے۔ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق اللہ کی سنت میں نہ تعطّل ہوتا ہے نہ تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کو جاری و ساری رکھنے کا پروگرام حضور ﷺ نے اپنے ورثاء کو منتقل کیا جو اللہ کے دوست ہیں اور جن کو عرف عام میں اولیاءاللہ کہا جاتا ہے۔ شیخ یا مراد حضور ﷺ کی ایسی طرزِ فکر کا وارث ہوتا ہے۔ جب کوئی بندہ یا مرید اپنے شیخ کی طرزِ فکر حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ وہ شیخ کی نسبت حاصل کرے۔ شیخ کی نسبت حاصل کرنے میں پہلا سبق ''تصوّرِ شیخ'' ہے۔

جب مرید یا سالک آنکھیں بند کر کے ہر طرف سے ذہن ہٹا کر اپنے شیخ کا تصوّر کرتا ہے تو اس کے اندر شیخ کی طرزِ فکر منتقل ہوتی ہے۔ طرزِ فکر دراصل روشنیوں کا وہ ذخیرہ ہے جو حواس بناتی ہیں۔ شعور بناتی ہیں، زندگی کی ایک نہج بناتی ہیں۔ جب ہم اپنے ارادے کے تحت شیخ کا تصوّر کریں گے تو تصوّر میں گہرائی پیدا ہونے کے بعد شیخ کے اندر کام کرنے والی وہ روشنیاں جو اسے سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سے منتقل ہوئی ہیں، ہمارے اندر منتقل ہو جائیں گی۔

ایسے بے شمار واقعات ہیں کہ جب کوئی مرید اپنے شیخ کے تصوّر میں گم ہو گیا تو اس کی چال ڈھال گفتگو اور شکل و صورت میں ایسی نمایاں شباہت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ پہچاننا مشکل نہیں رہتا کہ یہ اپنے شیخ کا عکس ہے چونکہ شیخ کا تصوّرِ شیخ کے اندر کام کرنے والی طرزِ فکر کی منتقلی کا باعث بنتا ہے۔ اس لئے اس تصوّر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کی طرزِ فکر بھی منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے کہ شیخ حضور ﷺ کی طرزِ فکر کا عکس ہے، تمثّل ہے۔

بابِ دوم

زمان (Time) کی حدود

سوال: روحانیت میں زمان (Time) کو مختصر کرنے کا تذکرہ کیا جاتا ہے، وہ کون سی طاقت ہے جس کی مدد سے زمان کی حدود کو ردّوبدل کیا جاسکتا ہے اور کیا ظاہری زندگی میں بھی ایسا کرنا ممکن ہے؟

جواب: غور کیا جائے تو یہ ظاہری زندگی کا عام مشاہدہ ہے کہ ہم زمان یا ٹائم کی گرفت کو اپنے اوپر سے توڑ بھی سکتے ہیں اور اپنے اوپر مسلّط بھی کر لیتے ہیں۔ مثلاً ہمیں کوئی کام کرنا ہے۔ اس کام کو اگر قاعدے اور طریقے سے کیا جائے تو وہ ایک گھنٹے میں پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم نہ چاہیں تو یہ ایک گھنٹے کا کام ہفتوں اور مہینوں میں بھی پورا نہیں ہوتا۔

ایک کام کرنا ہے اب سوچنا شروع کر دیجئے کہ یہ کام کرنا ہے۔ اس سوچ میں کہ یہ کام کرنا ہے، ہفتوں بھی لگ سکتے ہیں، مہینوں بھی لگ سکتے ہیں۔ سالوں بھی صرف ہو سکتے ہیں اور اگر ہم فوری طور پر کام شروع کر دیں تو یہ کام منٹوں، گھنٹوں یا دنوں میں پورا ہو جاتا ہے بات وہی ہے جو پہلے کہی جاچکی ہے زمان کا مختصر کرنا یا طویل کرنا انسان کا اپنا اختیاری عمل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زندگی کا وقت معیّن ہے۔ لیکن مشاہدات اور تجربات اس بات کا انکشاف کر رہے ہیں کہ زندگی کے ماہ و سال بھی آدمی اپنے اختیار اور ارادے سے گھٹا اور بڑھا سکتا ہے۔ ایک آدمی ان عوامل میں زندگی گزارتا ہے جن میں زندگی میں کام آنے والی طاقتوں اور صلاحیتوں کا اِصراف بیجا ہوتا ہے۔ وہ ایسی غذائیں استعمال کرتا ہے جن سے آدمی کی صحت متاثر ہوتی ہے۔ اس کے دماغ پر غم و فکر کے ایسے خیالات چھائے رہتے ہیں جن کے دباؤ سے اس کے اعصاب مضمحل اور ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، نتیجے میں ایسے آدمی کی عمر کم ہوتی ہے۔

اس کے برعکس ایک آدمی لوازمات زندگی کو بہت مختصر کر دیتا ہے۔ غم و آلام اور فکر کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتا، ایسی غذائیں استعمال نہیں کرتا جو خون کو کمزور کرتی ہیں یعنی تمبا کو، منشیات وغیرہ ایسے صاف ستھرے ماحول میں رہتا ہے۔ جہاں فضا زہر آلود نہیں ہوتی نتیجے میں ایسے آدمی کی عمر بڑھ جاتی ہے۔

یہ وضاحت ہے اس بات کی کہ زمانیت کے بھی دو رخ ہیں۔ ایک رخ وہ ہے جس میں آدمی کے اندر کام کرنے والی انرجی (Energy) یعنی وہ صلاحیت، وہ طاقت یا وہ لہریں جو اس کی زندگی کو قائم رکھتی ہیں اتنی زیادہ خرچ ہوتی ہیں کہ آدمی اعصابی طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں اور وہ بالآخر مر جاتا ہے۔ زمانیت کا دوسرا رخ وہ ہے کہ جس رخ میں کام کرنے والی لہریں ضرورت کے مطابق خرچ ہوتی ہیں۔ اِسراف بیجا نہیں ہوتا چونکہ لہریں اعتدال میں خرچ ہوتی ہیں اس لئے ان کا ذخیرہ محفوظ رہتا ہے۔ ذخیرہ محفوظ رہنے سے آدمی کے اندر صلاحیتیں زیادہ طاقتور ہو جاتی ہیں اور وہ اس طاقت سے زمانیت کو مختصر اور بہت مختصر کر سکتا ہے۔

روحانیت میں مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ انسان کے اندر لہروں کا ذخیرہ زیادہ سے زیادہ حد تک محفوظ رہ سکے اور اس ذخیرے کی طاقت سے اس کا اپنا اختیار اور ارادہ اس طرف سفر کرنے لگے جہاں سکون اور راحت کی زندگی موجود ہے۔

ہم نے جس طاقت کو لہروں کا نام دیا ہے، سائنسدان ان لہروں کا نام (Calories) رکھتے ہیں۔

نفس کیا ہے؟

سوال: حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا ارشاد مبارک ہے: جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے ربّ کو پہچانا۔ سوال یہ ہے کہ یہ نفس کیا ہے جس کو سمجھ کر ہم اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر سکتے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ جب تخلیق کا تذکرہ فرماتے ہیں اور اپنی خالقیت کا اعلان کرتے ہیں تو کہتے ہیں

''وہی ہے جس نے تمہیں تخلیق کیا ہے نفسِ واحد سے''۔

تصوّف میں اس کا اصطلاحی نام ''نسبت وحدت'' اور اس کو ایک نقطہ سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس میں تمام کائنات بند ہے۔

بادی النظر میں جب ہم غور کرتے ہیں کہ نفسِ واحد کیا چیز ہے؟ تو عام طرزوں میں یہ کہہ دیا جاتا ہے نوعِ انسانی آدم سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی نفس واحدہ سے مراد آدم ہے۔ یہ طرزِ فکر اور یہ تاویل صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جب آدم کا تذکرہ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق آدم کا پتلا سڑی اور بجنی مٹی سے تخلیق ہوا۔ حقیقت میں نفسِ واحدہ جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ہم نے تمہیں نفسِ واحد سے تخلیق کیا ہے، وہ نقطہ ہے جو ساری کائنات کی بنیاد ہے اور اس نقطہ میں کائنات کا ایک ایک ذرّہ ریکارڈ ہے۔ کوئی چیز اس سے باہر نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی اپنے اندر موجود اس نقطہ سے واقف ہو جائے اور اس کی نگاہ اس نقطہ کے اندر کام کرنے لگے۔

اسی نقطہ کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا۔''

اللہ تعالیٰ کے فرمان اور حضور اکرم ﷺ کے ارشاد پر تفکر کیا جائے تو اس کے معانی اور مفہوم اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور ہم ان دونوں میں باہمی ربط موجود پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے تمہیں تخلیق کیا نفسِ واحد سے اور حضور اکرم ﷺ اس نفس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا۔ مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جب عرفان نفس کا کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے تو ہم ان قرآنی آیات کو جس میں عرفان نفس کے متعلق واضح اور روشن ہدایات موجود ہیں۔ متشابہات کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کتاب میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ کتاب جس میں کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہیں ان لوگوں کو ہدایت بخشتی ہے جو متقی ہیں اور متقی لوگ وہ ہیں۔ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی غیب ان کے مشاہدے میں ہوتا ہے۔ ان حضرات کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ ان کی عام طرزِ فکر یہ ہوتی

ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں، یہ بات ہمارا یقین ہے۔ یعنی یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ ہر بات، ہر کام، ہر عمل، ہر حرکت خواہ وہ ابتداء ہو یا انتہا، ظاہر ہو یا چھپی ہوئی سب اللہ کی طرف سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے عملدر آمد ہونے میں براہِ راست اللہ تعالیٰ کی مشیئت کا عمل دخل ہے۔

یہ بات سامنے آچکی ہے کہ کائنات میں موجود ہر شئے لہروں کے تانے بانے پر قائم ہے اور یہ لہریں نور کے اوپر قائم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق زمین اور آسمان اللہ کا نور ہیں۔ تخلیق کی ایک حیثیت نورانی ہے۔ اور دوسری حیثیت روشنی ہے۔ ان لہروں اور تخلیق کے نورانی وصف کو تلاش کرنے کے لئے اہل اللہ نے انسانی شعور کی مناسبت سے قاعدے اور ضابطے بنائے ہیں اور ایک نقطہ کو تقسیم کرکے چھ کر دیا ہے۔ تاکہ ایک مبتدی سالک آسانی سے سمجھ سکے۔ اس ایک نقطہ کے چھ حصوں کی تقسیم کا نام تصوّف میں لطائف ستہ یا چھ لطیفے رکھا گیا ہے۔ پانچ لطیفوں کو چھوڑ کر آخری چھٹا لطیفہ جس کو اخفیٰ کا نام دیا گیا ہے، ہر انسان کے اندر نفسِ واحدہ ہے یہی وہ نقطہ ہے جو اللہ کا گھر ہے جس میں اللہ بستا ہے اور جس پر براہِ راست اللہ کی تجلیات کا نزول ہوتا ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس میں داخل ہونے کے بعد کائنات صحیح معنوں میں انسان کے لئے تسخیر ہو جاتی ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد سمجھ لیتا ہے کہ ہم نے مسخر کر دیا سب کا سب تمہارے لئے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ تمہارا محکوم ہے۔ اور تم اس کے حاکم ہو۔ اس ارشاد کی مزید تفصیل یہ سامنے آتی ہے کہ ہم نے تمہارے لئے سورج کو مسخر کر دیا، چاند کو مسخر کر دیا، ستاروں کو مسخر کر دیا۔ مسخر ہونے کا یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ چاند اور سورج کو اللہ تعالیٰ نے ایک ڈیوٹی تفویض کی ہے اور یہ بات ان کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ مخلوق کی خدمت کریں۔ چاند ہو، سورج ہو، ستارے ہوں، نباتات ہوں یا جمادات ہوں، پانی ہو یا گیس، چرندے ہوں یا پرندے سب انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔ یہ مسخر ہونے کی تعریف میں نہیں ہوتا۔ مسخر ہونا، کسی چیز پر حاکمیت قائم ہونا، یہ معنی رکھتا ہے کہ اس چیز پر تصرّف کیا جاسکے۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ نوعِ انسان چاند اور سورج کے تصرّف میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اگر چاند اور سورج اپنا تصرّف ختم کر سکتے ہیں تو زمین کا وجود باقی نہ رہتا۔ مثلاً یہ کہ ہم دھوپ کے محتاج ہیں اور ہم اس بات کے بھی محتاج ہیں کہ چاند اپنی روشنی سے ہماری فصلوں کو پروان چڑھائے۔ ہمیں چاند اور سورج پر کوئی حاکمیت حاصل نہیں ہے۔

درست طرزِ فکر کونسی ہے؟

سوال: انسان کسی بھی ڈھنگ سے زندگی گزارے اس کے پیچھے ایک سوچ، ایک طرزِ فکر کارفرما ہوتی ہے۔ کیا روحانیت ہمیں کوئی ایسی کسوٹی فراہم کرتی ہے جس سے پر کھا جاسکے کہ کون سی طرزِ فکر درست ہے؟

جواب: معاشرے کو سامنے رکھ کر تفکر کیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ معاشرے میں موجود زندگی گزارنے اور زندگی میں سوچ بچار کی طرزیں ایک ہی طرح کام کرتی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ آدمی کی سوچ بچار اور مخصوص طرزِ فکر کی بنیاد پر الگ الگ گروہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ کی طرزِ فکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس گروہ پر کتنا ہی فضل ہو جائے وہ ناشکرا ضرور ہوتا ہے۔ ایک گروہ کی عادت یہ ہے کہ وہ فیاض ہے، سخی ہے۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ کی جبلّت یہ بن گئی ہے کہ وہ بخیل ہے، کنجوس ہے اور اس کے دل میں دولت کی محبت اس حد تک جا گزیں ہے کہ اس کے اوپر دولت کی پرستش کا گمان ہوتا ہے۔ ایک گروہ ایسا ہے کہ اسے اس بات میں خوشی ہوتی ہے کہ وقت ضائع کیا جائے۔

ایک گروہ وعظ و نصیحت سننے کا شوقین ہے، دوسرا گروہ سیاسی تقاریر سننے کا خواہش مند ہے۔ کچھ لوگوں کو ناچ رنگ کا شوق ہوتا ہے۔ اور کچھ لوگوں کو پینے پلانے کا۔ اور ان لوگوں کے برعکس ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو خوش عقیدہ ہیں اور اولیاءاللہ کے مزارات پر حاضری دینے میں لذّت محسوس کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ زمین پر موجود نوعِ انسانی مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ننانوے فیصدی گروہ کی زندگی اور ان کی طرزِ فکر کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ ننانوے فیصدی گروہ شک اور وسوسوں میں مبتلا ہیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ شک اور وسوسہ کی زندگی سے آدمی کے اوپر غم، خوف اور پریشانی مسلّط ہو جاتی ہے۔

روحانیت ہمیں صحیح طرزِ فکر کی جو کسوٹی فراہم کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اندر غم اور خوف موجود نہ ہو۔ دنیا کی چار ارب آبادی (اُس وقت کی معلوم عالمی آبادی) اپنا محاسبہ کر سکتی ہے۔ ننانوے فیصدی افراد ایسے ملیں گے کہ جن کی ساری زندگی خوف اور غم میں گزر گئی ہے۔

تخلیقی فارمولوں کے سلسلے میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ کوئی تخلیق دورخ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔اس تخلیقی قانون کے تحت جس بندے کے اندر شک اور وسوسہ موجود ہے اس بندے کے اندر یقین بھی موجود ہے۔جب کوئی بندہ یقین کی طاقت حاصل کر لیتا ہے تو شک اور وسوسہ والا رخ مغلوب ہو جاتا ہے اور جب کسی بندے پر شک اور وسوسے کا رخ غالب ہو جاتا ہے تو یقین کا رخ مغلوب ہو جاتا ہے۔بے یقینی کا دوسرا نام شک ہے، شک شیطنت ہے اور شیطنت غم اور خوف ہے۔

انبیاء علیہم السّلام کے بنائے ہوئے قاعدوں اور ضابطوں پر اگر عمل کیا جائے تو شک اور وسوسے کا رخ مغلوب ہو جاتا ہے اور یقین کا رخ غالب ہو جاتا ہے۔روحانی طرزِ فکر یہی ہے کہ روحانی علوم سکھانے والا استاد یا مرشد قدم بہ قدم چلا کر اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ شک اور وسوسہ کا رخ مغلوب ہو جائے اور یقین کا رخ غالب ہو جائے۔

أَلا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلا هُمْ يَحْزَنُونَ (سورة يونس – آيت نمبر٦٢)

کی زندہ تفسیر بن جائے۔قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق اللہ کے دوست ایسی طرزِ فکر میں زندگی گزارتے ہیں کہ ان کو نہ خوف ہوتا ہے نہ غم۔

مرشد کو ظاہری آنکھ سے نہ دیکھا ہو

سوال : کیا مرید اپنے مرشد سے سینکڑوں میل دور رہ کر بھی اس طرح فیض یاب ہو سکتا ہے جس طرح نزدیک رہ کر چاہے وہ ساری زندگی مرشد کو ظاہری آنکھوں سے نہ دیکھے ؟

جواب: علم کی دو اقسام ہیں۔علم کی ایک قسم کا نام علمِ حُضوری ہے اور دوسری کا دوسرا نام علمِ حُصولی ہے۔ یعنی ایک علم یہ ہے کہ آدمی اپنی کوشش، محنت وجدّ وجہد اور صلاحیتوں کے مطابق ظاہرہ اسباب میں رہ کر کوئی علم سیکھتا ہے اور اس علم میں مادّی وسائل بروئے کار آتے ہیں۔اس کی مثال یوں ہے کہ ایک آدمی لوہار بننا چاہتا ہے اب اس کے

سامنے تین چیزیں ہیں۔ایک لوہا، دوسری وہ صلاحیت جو لوہے کو مختلف شکلوں میں ڈھالتی ہے اور تیسرا صلاحیت کا استعمال جب وہ اس صلاحیت کو استعمال کرتا ہے تو اس لوہے سے بے شمار چیزیں بن جاتی ہیں۔

کسی علم کے سیکھنے کے لئے ایک کامن فیکٹر (Common Factor) نیّت ہے یعنی وہ علم کس لئے سیکھا جارہا ہے؟ اس علم کی بدولت جو چیزیں تخلیق پارہی ہیں۔ان چیزوں میں تخریب کا پہلو نمایاں ہے یا اس کے اندر تعمیر پنہاں ہے جس طرح لوہا ایک دھات ہے اس طرح صلاحیت بھی ایک ہے یعنی لوہے کو مختلف چیزوں میں ڈھالنا۔ لیکن یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ چیزیں کس مقصد کے لئے بنائی گئی ہیں۔اس کے اندر تعمیر ہے یا تخریب۔لوہے کی دھات سے ایسی چیزیں بھی بنتی ہیں جن کے اوپر انسان کی فلاح و بہبود کا دارومدار ہے۔ مثلاً چمٹا، پھونکنی، توا، ریل کے پہیے، ریل کے ڈبے، ہوائی جہاز اور دوسری بے شمار چیزیں اور اگر نیّت میں تخریب ہے تو یہی دھات نوعِ انسانی کی تباہی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے جیسے بم، میزائل، ٹینک وغیرہ۔

علمِ حصولی ایک ایسا علم ہے جو وسائل کے تعین کے ساتھ سیکھا جاتا ہے وسائل ہوں گے تو یہ علم سیکھا جاسکتا ہے۔وسائل نہیں ہوں گے تو یہ علم نہیں سیکھا جاسکتا۔ قلم ہوگا تو تحریر کاغذ پر منتقل ہوگی۔مطلب یہ ہے کہ قلم وسیلہ ہے اس بات کے لئے تحریر کو کاغذ پر منتقل کیا جائے۔علمِ حصولی کے لئے وسائل کے ساتھ ساتھ استاد کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ایسا جو گوشت پوست سے مرکب ہو۔اور ٹائم اسپیس میں مقید جسمانی خدوخال کے ساتھ موجود ہو اور یہ بتائے کہ قلم اس طرح پکڑا جاتا ہے اور قلم سے الف، ب۔۔۔۔۔۔اس طرح لکھی جاتی ہے۔

علم کی دوسری قسم علمِ حضوری ہے۔علمِ حضوری ایک ایسا علم ہے جو مادّی وسائل کی محتاج نہیں ہے اس علم کو سیکھنے کے لئے کاغذ، قلم، دوات کی ضرورت پیش نہیں آتی۔یہ علم مادّی وسائل سے ماوراء ہے۔جس طرح حصولی علم کو سیکھنے کے لئے استاد کی ضرورت ہے۔اسی طرح حضوری علم کو سیکھنے کے لئے بھی استاد کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ یہ علم ٹائم اسپیس کی حدود سے باہر ہے اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ استاد مادّی خدوخال اور مادّی وسائل کے ساتھ

شاگرد کے سامنے موجود ہو۔ علمِ حُصولی کے طالب کو شاگرد کہا جاتا ہے اور علم سکھانے والے کو استاد کا نام دیا جاتا ہے۔ علمِ حُضوری سیکھنے والے طالب علم کا نام مرید ہے اور سکھانے والے کا اصطلاحی نام مراد ہے۔ جب کوئی مرید اپنے مراد سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنی طرزِ فکر میں تبدیلی پیدا کرنا ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے لئے استاد کی طرزِ فکر حاصل کرنا واجب ہے۔ علمِ حُصولی میں استاد کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ طالب علم کو صلاحیتوں کا استعمال سکھا دے۔ ایک آدمی تصویر بنانے کا فن سیکھنا چاہتا ہے۔ استاد کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ شاگرد کو یہ بتادے کہ تصویر کس طرح بنتی ہے، پنسل کس طرح پکڑی جاتی ہے؟ لکیروں، دائروں اور قوسوں کے تناسب سے تصویر کس طرح تشکیل پاتی ہے؟ شاگرد جب استاد کی ہدایات پر عمل کرتا ہے تو وہ تصویر بنالیتا ہے لیکن یہ تصویر اس کی اپنی صلاحیتوں کا اظہار ہوتی ہے۔ استاد کا کام صرف اتنا تھا کہ اسے تصویر بنانے کا قاعدہ سمجھا دیا۔ جتنی مشق کی جائے گی۔ اسی مناسبت سے تصویر کے خدوخال بہتر اور خوبصورت ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کے متضاد علمِ حُضوری میں مراد مرید کے اندر اپنی صلاحیتیں منتقل کر دیتا ہے۔ مرید جب تصویر کشی کرے گا تو اس تصویر میں مراد کی صلاحیت کا عکس نمایاں ہو گا۔ صلاحیتوں کا منتقل کرنا مادّی وسائل کا محتاج نہیں ہے۔ صلاحیتوں کو قبول کرنے کے لئے اور مراد کی طرزِ فکر کو اپنانے کے لئے صرف اور صرف ایک بات کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ مرید خود کو اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ مراد کے سپرد کر دے۔ اور اپنی ذات کی اس طرح نفی کر دے کہ اس کے اندر بجز مراد کے کوئی چیز نظر نہ آئے۔ جیسے جیسے یہ طرز مرید کے اندر مستحکم ہوتی ہے۔ اسی مناسبت سے مراد کی طرزِ فکر مرید کے اندر منتقل ہوتی رہتی ہے۔ حضرت اُویس قرنیؓ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ حضرت اُویس قرنیؓ کی حضور اکرم ﷺ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن محبت اور قربت کا یہ عالم تھا کہ حضرت اُویسؓ کے تذکرے سے حضور ﷺ کا چہرہ مبارک خوشی سے تمتما اٹھتا تھا۔

دماغ آدمی کے اندر دراصل ایک اسکرین ہے۔ بالکل ٹی وی کی طرح۔ ٹی وی اسٹیشن سے آواز اور تصویر نشر ہوتی ہے اور بغیر کسی وقفہ کے ٹی وی اسکرین پر منتقل ہو جاتی ہے اسی طرح جب مراد اپنے مرید کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو مراد کی ٹائم اسپیس کو حذف کرنے والی صلاحیتیں مرید کے دماغ کی اسکرین پر متحرک ہو جاتی ہیں اور جیسے جیسے یہ

منتقلی عمل میں آتی ہے مرید کے اندر ذہنی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے۔انتہا یہ ہے کہ مرید کی طرزِ فکر مراد کی طرح ہو جاتی ہے۔ مراد کی صلاحیتیں مرید کی صلاحیتیں بن جاتی ہیں اور جب یہ عمل اپنے عروج پر پہنچتا ہے تو مراد اور مرید ایک ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دونوں کی گفتگو ایک ہو جاتی ہے۔ دونوں کی شکل وصورت ایک ہو جاتی ہے اور دونوں کی طرز گفتگو ایک ہو جاتی ہے۔ایسے بے شمار واقعات تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں کہ مراد کے جسم کے کسی حصہ میں درد ہوا تو مرید نے بھی اسی وقت اپنے جسم کے اسی حصہ میں درد محسوس کیا۔ مراد کو بخار ہوا۔ مرید بھی بخار میں تپنے لگا۔جب کہ مرید مراد سے ہزاروں میل کے فاصلے پر موجود تھا۔

اگر مرید کے اندر جذبہ صادق ہے اور مرید مراد سے عشق کے درجہ میں محبت کرتا ہے تو پھر دور دراز کے فاصلے معدوم ہو جاتے ہیں اور مرید ہزاروں میل دُور رہ کر بھی مراد یا پیر ومرشد سے فیضیاب ہوتا ہے۔

کیا مراقبہ خواب کا تسلسل ہے؟

سوال : مراقبہ کرتے ہوئے کسی شخص کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نیند کی حالت میں ہے۔ مکمل خاموشی اور سکون، بند آنکھیں اور سانس کا ایک مخصوص زیروبم۔ یہ سب وہ علامات ہیں جو خواب کی حالت کو ظاہر کرتی ہیں۔ براہِ کرم اس تاثر کی روشنی میں مراقبہ پر روشنی ڈالیں۔

جواب: خواب اور بیداری کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ خواب اور بیداری دراصل زندگی کے دورُخ ہیں۔اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق ہر چیز دو رخوں پر پیدا کی گئی ہے اور زندگی کی تمام حرکات وسکنات بھی دو رخوں پر قائم ہیں۔ زندگی کے وہ دو رخ جن پر ماضی حال اور مستقبل رواں دواں ہیں۔ بنیادی طور پر خواب اور بیداری ہیں جب کہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ خواب کوئی خاص زندگی نہیں ہے البتہ بیداری زندگی ہے۔علومِ ظاہری کے دانشور جب خواب کا تذکرہ کرتے ہیں تو خواب کو ایک خیالی زندگی کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق خواب اور بیداری الگ الگ نہیں ہیں صرف حواس کی درجہ بندی کا فرق ہے۔ایک حواس میں ذی روح اپنے

اوپر پابندی محسوس کرتا ہے اور دوسرے حواس میں خود کو پابندی سے آزاد دیکھتا ہے۔ان میں ایک ہی فرق صرف پابندی اور آزادی کا ہے۔

مراقبہ دراصل ایک ایسی کیفیت اور مشق کا نام ہے جو انسان کو حواس کے دو رخوں سے متعارف کراتی ہے۔اس کیفیت سے متعارف ہونے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ آدمی اعصابی تھکان کی وجہ سے پابندی کے حواس سے ہٹ کر ایسے حواس میں قدم رکھنا چاہتا ہے جہاں پابندی نہیں ہے تو طبیعت اسے دنیاوی آلام و مصائب سے آزاد کر کے اس زندگی میں لے جاتی ہے جس زندگی کا نام خواب ہے۔مطلب یہ ہے کہ آدمی اعصابی طور پر بے حس ہو کر سو جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اعصابی سکون کے ساتھ اپنے ارادہ اور اختیار سے بے دار رہتے ہوئے اپنے اوپر خواب کے حواس مسلّط کرے۔جس مناسبت سے خواب کے حواس بیداری میں منتقل ہوتے ہیں اسی مناسبت سے کوئی آدمی روحانی ترقی کرتا ہے۔

جب آدمی سونے کے لئے لیٹتا ہے تو اعصابی سکون اور خمار کی کیفیت سے دوچار ہونے کے بعد غنودگی کے عالم میں چلا جاتا ہے۔غنودگی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے شعوری حواس لاشعوری حواس میں منتقل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔اور جب غنودگی اپنے عروج کو پہنچتی ہے یعنی شعوری حواس لاشعوری حواس میں منتقل ہو جاتے ہیں تو آدمی سو جاتا ہے۔یہ وہ عمل ہے جو ہر ذی روح میں جاری ہے خواہ وہ کسی نوع سے تعلق رکھتا ہے۔۔۔۔۔انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس کو اپنی صفات کا علم عطا فرمایا ہے جو دوسری مخلوقات کو عطا نہیں کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم سب کا سب غیبی انکشافات ہیں۔اور یہ وہی صلاحیتیں ہیں جن کو ’’علم الاسماء‘‘ کہا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ بندہ غیب کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی صناعی کا مشاہدہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا عرفان حاصل کرے۔اس لئے یہ ضروری ہو گیا کہ بندے کے اندر وہ صلاحیتیں بھی موجود ہوں۔جن کو بروئے کار لا کر وہ اللہ تعالیٰ کے منشاء کو پورا

کر سکے۔ یہ منشاء آزاد زندگی میں داخل ہو کر پورا ہو سکتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ غیب کی دنیا میں ٹائم اور اسپیس نہیں ہوتا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ انسان کے حواس پابند زندگی میں بھی سفر کرتے ہیں اور پابند زندگی سے آزاد ہو کر بھی۔ پابند زندگی بیداری ہوتی ہے اور آزاد زندگی خواب ہے۔ خواب کی زندگی میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بیداری کے حواس بھی قائم رہیں اور آدمی جس طرح بیدار رہ کر ارد گرد کے ماحول سے متصل رہتا ہے اسی اتّصال کے ساتھ آزاد زندگی میں بھی سفر کرے۔ اس بات کو آسان الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ مراقبہ دراصل بیداری کے حواس میں رہتے ہوئے خواب دیکھنا ہے۔ یعنی ایک آدمی بیدار ہے۔ شعوری حواس کام کر رہے ہیں۔ وہ ماحول اور فضا سے متاثر بھی ہو رہا ہے، آوازیں بھی سن رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خواب بھی دیکھ رہا ہے۔ وہ بیک وقت دو کام کر رہا ہے۔ جاگ بھی رہا ہے، سو بھی رہا ہے، ''ٹائم اسپیس'' میں بند بھی ہے اور آزاد بھی ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک آدمی کسی دوست کو خط لکھ رہا ہے۔ خط لکھنے میں اس کا دماغ بھی کام کر رہا ہے۔ اس کا ہاتھ بھی چل رہا ہے۔ ماحول میں پھیلی ہوئی آوازیں بھی سن رہا ہے، کوئی بولتا ہے تو اس کی بات کا مفہوم بھی اس کے ذہن میں منتقل ہوتا ہے۔ کوئی شخص اس سے سوال کرتا ہے تو اس کا جواب بھی دیتا ہے۔ فضا میں خنکی ہے تو سردی محسوس کر رہا ہے، گرمی ہے تو گرمی کا احساس بھی اُسے ہو رہا ہے۔ بنیادی طور پر وہ خط لکھ رہا ہے اور خط لکھنے میں شعوری کیفیت الفاظ کی شکل میں منتقل ہو رہی ہے اور الفاظ کے اندر جو مفہوم ہے وہ لاشعور سے شعور میں منتقل ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی بیک وقت اپنے اندر چھپی ہوئی کئی صلاحیتوں کو استعمال کر رہا ہے۔ جب کوئی بندہ بیداری میں رہتے ہوئے خواب کے حواس کو اپنے اوپر وارد کر لیتا ہے تو جس طرح خط لکھنے کی حالت میں وہ بہت سے صلاحیتیں ایک ساتھ استعمال کر رہا تھا اسی طرح وہ خواب یا لاشعوری زندگی میں بھی بیداری اور خواب کی صلاحیتوں سے ایک ساتھ متعارف ہو کر ان کا استعمال کر سکتا ہے۔ شعوری اور لاشعوری صلاحیتوں سے ایک ساتھ کام لینے کے طریقے کا نام مراقبہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب

سوال: اللہ تعالیٰ کا ہم اپنے شعوری حواس میں رہتے ہوئے کس طرح ادراک کر سکتے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ سے قربت کا احساس ہوتا ہے۔ مگر درمیان میں حجاب حائل ہوتا ہے۔ بعض اوقات ادراک میں یہ بات سما جاتی ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو چھو لیا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ نے سجدہ کی حالت میں اپنا پائے مبارک ہمارے سر پر رکھ دیا ہے۔ فکر کے بعد نتیجہ ہمیشہ یہی نکلتا ہے کہ ہمارے اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب قائم ہے۔

پائے مبارک کے بارے میں صرف ادراک کام کرتا ہے لیکن ہم اس کو بیان نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کے پیر مبارک اس طرح کے تھے۔ ہوتا یہ ہے کہ ادراک میں یہ بات آ جاتی ہے کہ حجاب کے پیچھے اللہ تعالیٰ تشریف فرما ہیں۔ ذوق عبدیت بندہ کو سجدہ کی حالت میں لے آتا ہے۔ اب ادراک میں یہ بات آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عبدیت کو قبول فرما لیا ہے۔ بندہ کے سر پر پائے مبارک رکھ کر قبولیت کا اظہار کر رہے ہیں۔ عرش و کرسی پر اللہ تعالیٰ کا دیدار کسی نہ کسی طرح خدوخال میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حتمی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی شکل و صورت ہے۔ صرف اشارہ کنایہ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عرش پر اللہ تعالیٰ تشریف فرما ہیں۔ بصارت کا ادراک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نور ہیں۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ دیکھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا پڑے گا۔ صرف ہاتھ دیکھا۔ پورا جسم نہیں دیکھا۔ عرش پر ایک ہستی تشریف فرما ہے۔ اس ہستی کے خدوخال کیا ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک ہستی تشریف فرما ہے جو اللہ ہے مگر اس ہستیٔ اقدس نے ایک برقعہ سے اپنا سراپا چھپایا ہوا ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کی آنکھ کا مشاہدہ کیا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ جس طرح انسان کی ہوتی ہیں تو جواب یہ ہو گا کہ صرف آنکھ دیکھتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ کے چہرہ پر دو آنکھیں ہیں اور اس طرح کی ہیں۔

آج مراقبہ میں دیکھا کہ میرے اندر کائنات کی (Base) تسلسل کے ساتھ آرہی ہے اور میرے اندر کائنات تخلیق ہورہی ہے۔ذوجین الثنین (مثلث) کے دونوں رخ میرے اندر ہیں۔اوران مثلث کوایک دائرے نے محیط کرر کھاہے۔مثلث کے اندررَو کی صورت میں نور کی لہر بغیر کسی انقطاع کے گررہی ہے۔ جیسے ہی وہ مثلث سے آکر ٹکراتی ہے۔مثلث کے اندر بکھر جاتی ہے۔اور اس کا بکھرنا ہی کائنات ہے۔اس کی مثال سنیما سے دی جاسکتی ہے۔ مشین سے ایک رَولہروں کی صورت میں نزول کرتی ہے اور وہ لہریں اسکرین سے ٹکراتی ہیں۔ جیسے ہی ٹکراناوقوع پذیر ہوتا ہے۔پردہ پر مختلف شکلیں نمودار ہو جاتی ہیں۔یہی صورت انسان کے اندر جاری وساری ہے۔مصدر اطلاعات یا عالم امر سے ایک رو چلتی ہے اور انسان کے اندر (مثلث) اسکرین پر آکر ٹوٹتی اور بکھر جاتی ہے۔بکھرنے کے ساتھ ہی وہ سب لہریں ہو جاتی ہیں۔اس رو کے اندر پوری کائنات پوشیدہ ہے۔

اس رو میں انسان، جنّات، فرشتے تمام اجرام سماوی عرش کرسی اور حجابات سب کچھ ہیں۔صرف اللہ تعالی کی ذات اس رو سے ماوراء ہے۔اللہ تعالی کا وجود الگ ایک ہستی ہے۔حجابات تک اس رَو اور مثلث میں مشاہدہ ہوتے ہیں۔اللہ تعالی کی صفات بھی اس رَو اور مثلث میں مشاہدہ ہوتی ہیں۔لیکن ذاتِ باری تعالی اس رَو اور مثلث سے ماوراء ہے۔یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی کی ذاتِ اقدس (Dimension) اور خدوخال سے ماوراء ہے۔

ہم اللہ تعالی کی ہستی کو شکل وصورت اور خدوخال میں محدود نہیں کر سکتے اللہ تعالی کی ہستی کا ادراک ضرور کر لیتے ہیں۔اللہ تعالی جب شرف ہم کلامی عطافرماتے ہیں۔توپردہ کے پیچھے سے آواز سنائی دیتی ہے۔اور ادراک میں اللہ تعالی کی ہستی بھی ہوتی ہے۔لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالی جس وقت تکلم فرمارہے تھے۔ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ بہترین خالق ہیں

سوال: اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں فرماتے ہیں کہ میں بہترین خالق ہوں۔اس بات کی وضاحت فرمادیں۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے جہاں کائنات کی تخلیق کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بات ارشاد کی ہے کہ میں تخلیق کرنے والوں میں سب سے بہتر خالق ہوں۔اللہ تعالیٰ بحیثیت خالق کے ایک ایسے خالق ہیں کہ جن کی تخلیق میں وسائل کی پابندی زیر بحث نہیں آتی۔اللہ کے ارادے میں جو چیز جس طرح اور جس خدوخال میں موجود ہے جب وہ اس چیز کو وجود بخشنے کا ارادہ کرتے ہیں تو حکم دیتے ہیں اور اس حکم کی تعمیل میں تخلیق کے اندر جتنے وسائل ضروری ہیں وہ سب وجود میں آکر اس تخلیق کو عمل میں لے آتے ہیں۔

تخلیق اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود ہے۔خالقین کا لفظ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور بھی تخلیق کرنے والے ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے علاوہ دوسری ہر تخلیق وسائل کی پابند اور محتاج ہے۔اس کی مثال آج کے دَور میں بجلی سے دی جاسکتی ہے۔اللہ تعالیٰ کی ایک تخلیق بجلی (Electricity)ہے۔جب بندوں نے اس تخلیق سے دوسری ذیلی تخلیقات کو وجود میں لانا چاہا تو اربوں کھربوں چیزیں وجود میں آگئیں۔اللہ تعالیٰ کا یہ وصف ہے کہ اللہ نے ایک لفظ ''کن'' کہہ کر بجلی کو وجود بخش دیا۔آدم نے اختیاری طور پر یا غیر اختیاری طور پر جب بجلی کے علم کے اندر تفکر کیا تو اس بجلی سے ہزاروں چیزیں وجود میں آگئیں۔بجلی سے جتنی چیزیں وجود میں آئیں وہ انسان کی تخلیق ہیں مثلاً ریڈیو، ٹی وی اور بے شمار دوسری چیزیں روحانی نقطہ نظر سے اللہ کی اس تخلیق میں سے دوسری ذیلی تخلیقات کا مظہر بننا آدم زاد کا دراصل بجلی کے اندر تصرّف ہے۔

یہ وہی علم ہے جو اللہ نے آدم کو سکھادیا تھا۔اسماء سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے آدم کو ایک ایسا علم سکھادیا کہ جو براہِ راست تخلیقی فارمولوں سے مرکب ہے۔جب انسان اس علم کی گہرائی کے اندر جاکر حاصل کرتا ہے اور اس علم کے ذریعے تصرّف کرتا ہے تو نئی نئی چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔کائنات دراصل ایک علم ہے۔ایسا علم جس کی بنیاد اور حقیقت سے اللہ نے بندوں کو وُقوف عطا کردیا کردیا ہے لیکن اس وُقوف کو حاصل کرنے کے لئے ضروری قرار دے دیا ہے کہ

بندے علم کے اندر تفکر کریں۔اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمایاہے کہ ہم نے لوہانازل کیااوراس کے اندر لوگوں کے لئے بے شمار فائدے محفوظ کر دیئے جن لوگوں نے لوہے کی حیثیت اور طاقت کو تسلیم کر کے لوہے میں گہرائی پیدا کر کے تفکر کیااور لوگوں کے سامنے لوہے کی لا محدود صلاحیتیں آ گئیں اور جب ان صلاحیتوں کو استعمال کر کے لوہے کے اجزائے ترکیبی کو متحرّک کر دیا تو لوہاایک ایسی عظیم شئے بن کر سامنے آیا کہ جس سے موجودہ سائنس کی ہر ترقی کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے۔یہ ایک تصرّف ہے جو وسائل میں کیا جاتاہے یعنی ان وسائل میں جن وسائل کا ظاہراًوجود ہمارے سامنے ہے۔جس طرح لوہاایک وجود ہے اسی طرح روشنی کا بھی ایک وجود ہے۔وسائل کی حدود سے گزر کر یاوسائل کے علوم سے آگے بڑھ کر جب کوئی بندہ روشنیوں کا علم حاصل کرتا ہے تو جس طرح لوہے کی (دھات) میں تصرّف کے بعد وہ عظیم مشینیں، کل پرزے، جہاز، ریل گاڑیاں، خطرناک اور بڑے بڑے بم اور دوسری ترقیوں میں لوہے کو استعمال کرتاہے۔اس طرح روشنیوں کا علم حاصل کر کے وہ روشنیوں کے ذریعے بہت ساری تخلیقات وجود میں لے آتا ہے۔

وسائل میں محدود رہ کر ہم سونے کے ذرّات کو اکٹھا کر کے ایک خاص پروسیس (Process) سے گزار کر سونا بناتے ہیں۔لوہے کے ذرّات اکٹھا کر کے خاص پروسیس سے گزار کر ہم لوہا بناتے ہیں۔اسی کو وسائل میں تصرّف کا نام دیاجاتاہے۔لیکن وہ بندہ جو روشنیوں میں تصرّف کرنے کا اختیار رکھتاہے اس کے لئے سونے کے ذرّات کو مخصوص پروسیس سے گزار ناضروری نہیں ہے۔وہ اپنے ذہن میں روشنیوں کا ذخیرہ کر کے ان مقداروں کو الگ کر لیتا ہے جو مقداریں سونے کے اندر کام آتی ہیں اور ان مقداروں کو ایک نقطہ پر مرکوز کر کے ارادہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "سونا" اور سونا بن جاتا ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق میں کسی کا محتاج نہیں ہے،جب وہ کوئی چیز تخلیق کرتا ہے تو تخلیق کے لئے جتنے وسائل موجود ہونا ضروری ہیں۔وہ خود بخود موجود ہو جاتے ہیں اور بندے کا تصرّف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تخلیق کا تصرّف کرتا ہے۔تصرّف کے دو طریقے ہیں۔ایک طریقہ وسائل میں محدود رہ کر وسائل کا مجتمع کر کے کوئی نئی چیز بنائی جاتی ہے اور دوسرا طریقہ روشنیوں میں تصرّف کرنا ہے۔

یعنی کوئی چیز جن روشنیوں پر قائم ہے۔ان روشنیوں میں حرکت دے کر تصرّف کیا جاتا ہے اور تصرّف کا یہ طریقہ انسان کے اندر اب روشنیوں سے متعلق ہے۔ جن روشنیوں کو قلندر باباؒ اولیاءؒ نے نسمہ کہا ہے، روشنیوں کے اس ذخیرے کو حاصل کرنے کا طریقہ ہی دراصل روحانیت ہے۔ روحانیت میں یہ بات دن کی روشنی کی طرح سامنے آ جاتی ہے کہ زمین پر موجود یا کائنات میں موجود ہر شئے کی بنیاد اور بساط روشنی ہے اور یہ روشنی اللہ کی صفَت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفَت معیّن مقداروں کے ساتھ قائم ہے اور معیّن مقداروں کے ساتھ ردّ و بدل ہوتی رہتی ہے۔ پیدائش سے موت تک کا زمانہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کوئی بچہ اپنی ایک حیثیت پر قائم نہیں رہتا۔ جن معیّن مقداروں پر بچہ پیدا ہوا ہے۔ ان معیّن مقداروں میں ایک ضابطہ ایک قانون اور ایک ترتیب کے ساتھ ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح مقداروں میں ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے اسی مناسبت سے انسان بھی بدلتا رہتا ہے۔

بچہ، جوان ہو، بوڑھا ہو بہر صورت وہ انسان ہے یعنی اس کی شکل و صورت اور خد و خال میں تو تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن نَوعِ انسانی کی شکل و صورت برقرار رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے کنبے کو مختلف نَوعوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک معیّن مقدار یہ ہے کہ انسان ہر حال میں انسان رہتا ہے لیکن اس کے خد و خال تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

ایک بکری کا بچہ بہر صورت بکری کا بچہ رہتا ہے۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس کے اندر زندگی گزارنے کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ اب اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ معیّن مقداریں دو رخ پر قائم ہیں۔ ایک رخ یہ ہے کہ اس میں ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے اور دوسرا رخ یہ ہے کہ بظاہر کوئی ردّ و بدل واقع نہیں ہوتا۔ ردّ و بدل یہ ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کے نقوش جوانی میں سر تا پا بدل جاتے ہیں۔ جوانی کے بعد بڑھاپا آ جاتا ہے۔ بڑھاپے میں جوانی کے نقوش ڈھل جاتے ہیں اور اس طرح ماضی میں چلے جاتے ہیں یا مٹ جاتے ہیں کہ جوانی کی تصویر اور بڑھاپے کی تصویر دو الگ الگ تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس کو معیّن مقداروں میں ردّ و بدل کا نام دیا جاتا ہے اور وہ مقداریں جو قائم بالذّات ہیں۔ یہ ہیں کہ آدمی ایک دن کا بچہ ہو یا سو سال کا بوڑھا، بھوک کا تقاضہ اس کے اندر موجود ہے۔ پانی پینے کا تقاضہ اس کے اندر موجود ہے۔ عجیب رمز ہے کہ دو سال کا بچہ پانی پیتا ہے۔ دو سال کا بچہ غذا کھاتا ہے۔ سو سال کا بوڑھا آدمی بھی پانی پیتا ہے۔ سو سال کا بوڑھا آدمی بھی غذا کھاتا ہے لیکن سو سال کا بوڑھا دو سال کا بچہ نہیں ہوتا اور دو سال کا بچہ سو سال کا بوڑھا نہیں ہوتا۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ روحانی علوم ہمارے اوپر یہ بات واضح کرتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ تقاضے بڑھاپے اور بچپن میں یکساں ہیں، صورت و شکل اور خدوخال میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ صورت شکل اور خدوخال میں ردوبدل میں اللہ تعالیٰ کے علوم کام کرتے ہیں۔ ان علوم سے روشناس ہونے کے لئے پہلی بات ضروری ہے کہ ہم ان روشنیوں کا علم حاصل کریں جن روشنیوں کو اللہ نے اپنی صفات کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر محیط ہیں

سوال: اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے'': اللہ وہ ہے جو ہر چیز پر محیط ہے''۔ یہ بھی ارشاد ہے کہ ''جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اللہ اسے جانتا ہے''۔ ''اگر تم ایک ہو تو دوسرا اللہ ہے اور اگر تم دو ہو تو تیسرا اللہ ہے''۔ ''اللہ ہی ابتداء ہے اللہ ہی انتہا ہے''۔ اس کی تفصیل کیا ہے؟

جواب: ان سارے ارشادات میں یہ بات پوری طرح واضح کر دی گئی ہے کہ اللہ کا علم لامحدود اور لامتغیر و لامتناہی اس لئے ہے کہ یہ علم ٹائم اسپیس کی حد بندیوں سے ماوراء ہے۔ ان ارشادات سے یہ بات بھی منکشف ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے علم کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے منشاء خالصتاً آزادی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات بنانے کا ارادہ کیا تو فرمایا ''کن'' اور کائنات وجود میں آ گئی۔ اس بات کو آسان الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ کائنات دراصل اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ چونکہ علم کا مظاہرہ ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم نے کائنات کے خدوخال کا روپ اختیار کیا ہے اس لئے پوری کائنات بھی بجز علم کے کوئی اور حیثیت نہیں رکھتی۔ علم کی حیثیت زیادہ ہو یا قلیل بہر حال وہ علم ہے۔ اس کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ سمندر کے پانی کا ایک قطرہ بہر حال سمندر ہے۔ سمندر سے لئے ہوئے ایک قطرۂ آب کو پانی کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ چونکہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے علم کا مظاہرہ ہے اس لئے کائنات کی حقیقت کائنات کی بنیاد اور کائنات کی ہیئت سوائے علم کے کچھ نہیں ہے۔ جب ہم عالم ناسوت میں بند زندگی کا تجربہ کرتے ہیں اور زندگی کے اندر غور و فکر کرتے ہیں تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ساری زندگی علم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اور علم اس وقت علم ہے جب اس کے اندر معانی اور مفہوم موجود ہوں۔ علم کے اندر معانی

اور مفہوم کی ایک طرز یہ ہے کہ بندہ اپنے اختیارات سے علم کے اندر معنی پہناتا ہے۔اور علم کے اندر اصل مفہوم وہ ہے جو اللہ تعالٰی کے ذہن میں ہے۔بظاہر کائنات میں غور کرنے سے عجیب قسم کی پریشانی ہوتی ہے کہ اللہ تعالٰی نے ایسا نظام قائم کیا ہے کہ جس نظام میں زیادہ تر تکلیف و جراحت ہے مثلاً کوئی آدمی کھائے بغیر نہیں رہ سکتا، ہر آدمی سونے پر مجبور ہے۔اتنی بند شیں ہیں کہ جن کا کوئی شمار نہیں۔علم کا یہ مفہوم اللہ تعالٰی کے ذہن میں موجود علم سے الگ ہے۔اللہ تعالٰی نے آدم سے فرمایا کہ :

اے آدم! تو اور تیری بیوی جنّت میں رہو اور خوش ہو کر کھاؤ جہاں سے دل چاہے۔(سورۃ البقرہ—آیت نمبر35)

جنّت ایک ایسی بستی ہے کہ جس کے رقبے کی حدود کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔یعنی اس کی حدود لا متناہی ہیں۔ اللہ تعالٰی کا یہ ارشاد کہ خوش ہو کر کھاؤ جہاں سے چاہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آدم کو اللہ نے لا محدود جنّت کے رقبے پر تصرّف عطا کر دیا تھا۔ بالفاظ دیگر آدم جنّت کے لا محدود رقبے پر بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ساتھ ہی اللہ تعالٰی نے یہ فرمایا ہے کہ یہ درخت ہے اس کے قریب مت جانا۔اور اگر تم نے ہمارے اس حکم یا ہدایت پر عمل نہیں کیا تو تم اپنے اوپر ظلم کروگے۔

جنّت لا محدود رقبہ ہے۔اس میں لاتعداد اور لا شمار درخت ہیں۔ایک مخصوص درخت کی طرف اللہ تعالٰی اشارہ کر کے آدم کو ہدایت کرتے ہیں کہ اس درخت کے قریب مت جانا۔آدم سے نافرمانی واقع ہوئی اور اس نافرمانی کے جرم میں جنّت کی فضاؤں نے آدم کو ردّ کر دیا۔اور آدم جس سرزمین کے بِلا شرکتِ غیرے مالک تھے وہ زمین ان سے چھین لی گئی۔اس واقعہ کا نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے۔ایک بہت وسیع و عریض باغ ہے۔باغ کے پھل پھول، پودوں، نہروں، آبشاروں وغیرہ پر آدم کو پورا پورا تصرّف حاصل ہے۔باغ کے اندر صرف ایک درخت ایسا ہے جس پر اسے تصرّف تو حاصل ہے لیکن اس تصرّف کو اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔جب تک آدم سے نافرمانی کا ارتکاب

نہیں ہوا آدم کے لئے جنّت کا وسیع رقبہ (Time & Space) سے آزاد رہا اور جب آدم سے نافرمانی سرزد ہو گئی تو آدم کے اندر زمان و مکان کی حد بندیاں ظاہر ہو گئیں۔ اس درخت کے بارے میں بہت سی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ گیہوں کا درخت تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ سیب تھا۔ کسی مذہب و مسلک کے لوگ کہتے ہیں کہ وہ درخت انگور کا تھا۔ علیٰ ہذالقیاس مختلف لوگ مختلف باتیں کہتے ہیں۔ لیکن قرآن نے اس کا کوئی نام نہیں رکھا۔ صرف درخت کے نام سے یاد کیا ہے۔ روحانی نقطۂ نظر سے جب لاشعوری واردات و کیفیات میں اس درخت کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو دراصل یہ ایک طرزِ فکر کا سمبل ہے۔

جنّت میں ہو یہ رہا ہے کہ جو کچھ جنّت میں موجود ہے وہ دروبَست آدمی کے ارادے کے تابع ہے۔ آدمی کا دل چاہا کہ وہ سیب کھائے۔ جنّت میں سیب کا درخت بھی ہے۔ اس پر سیب لگے ہوئے بھی ہیں۔ لیکن سیب کا توڑنا وہاں زیر بحث نہیں آتا۔ سیب کھانے کو دل چاہا اور سیب موجود ہو گیا۔ پانی پینے کو دل چاہا اور پانی موجود ہو گیا۔ اس طرزِ فکر سے تصرّف کی دو طرزیں سامنے آتی ہیں۔ تصرّف کی ایک طرزِ فکر یہ ہے کہ ایک بندہ سیب کا درخت لگاتا ہے۔ اس کی نشوونما کا انتظار کرتا ہے۔ طویل عرصے کے بعد سیب کا درخت اس قابل ہوتا ہے کہ اس کے اوپر پھل لگے۔ اس کے اندر سیب کھانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ درخت کی طرف چلتا ہے اور درخت پر سے سیب توڑ کر کھا لیتا ہے۔ تصرّف کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سیب کے درخت پر سیب لگے ہوئے ہیں۔ اس درخت کو نہ کسی بندے نے زمین میں بویا ہے، نہ اس کی نگہداشت کی ہے، نہ اس درخت کو پروان چڑھانے میں کوئی خدمت انجام دی اور نہ اسے درخت پر سے سیب توڑنے کی زحمت کرنا پڑتی ہے۔ دل چاہا کہ سیب کھاؤں اور سیب موجود ہو گیا۔ اس میں ایک بہت باریک نکتہ بیان ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارادے میں یہ بات موجود تھی کہ کائنات وجود میں آئے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ''کن'' کائنات وجود میں آ جا۔ کائنات بن گئی۔ جنّت کی زندگی میں آدم کے دماغ میں یہ بات موجود تھی کہ وہ سیب کھائے۔ آدم نے کہا

سیب اور سیب موجود ہو گیا۔ 'کن' کہنے سے کائنات بن گئی، سیب کہنے سے سیب مل گیا۔اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ذات کے لئے احسن الخالقین کہہ کر بیان کیا ہے کہ میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے علاوہ بھی مخلوق کو تخلیق کرنے کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔انسانی تخلیق اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں حدِّ فاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وسائل کے بغیر محض علمی بنیاد پر تخلیق فرماتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جو کچھ تھا، اس کے بارے میں 'کن' کہہ کر ان تمام چیزوں کو جو اللہ تعالیٰ ظاہر فرمانا چاہتے تھے تخلیق کر دیا۔ آدم کے اندر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی جو تخلیقی صلاحیتیں کام کر رہی ہیں وہ وسائل کی محتاج ہیں۔ جب تک کوئی بندہ ان تخلیقی صلاحیتوں کو زمان و مکان کی حد بندیوں سے آزاد رہ کر استعمال کرتا ہے وہ سب جنّت کی زندگی ہے اور جب کوئی بندہ ان تخلیقی صلاحیتوں کو زمان و مکان کی حد بندیوں کے اندر اور وسائل کے اندر بند کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق یہ جہالت اور ظلم ہے۔ جس طرح عقل و شعور اور دانائی ایک درخت کی طرح پھلتی پھولتی ہے یعنی علم کے اندر طرح طرح کی شاخیں پھوٹتی ہیں، نئے نئے فلسفوں کی داغ بیل پڑتی ہے، طرح طرح کی ایجادات ہوتی ہیں، اسی طرح ظلم و جہالت کے درخت پر بھی پھول پتے اور شاخیں اگتی ہیں۔ لیکن چونکہ بنیاد ظلم اور جہالت پر ہوتی ہے اس لئے آدمی ان ساری ایجادات اور ترقّیوں سے خوش ہونے کی بجائے ناخوش ہوتا ہے۔ پر سکون ہونے کی بجائے بے سکون ہو جاتا ہے۔ مطمئن ہونے کی بجائے غیر مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی روشنی میں جب ہم موجودہ سائنسی ترقّیوں کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس ترقی میں وہ تمام چیزیں ملتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ظلم اور جہالت کے نام سے بیان فرمایا ہے۔

آج کی ترقی پوری نوعِ انسانی کے لئے ایک عذاب بن گئی ہے۔ ہر شخص غیر مطمئن اور بے سکون ہے۔ دنیا کے اس کونے سے اس کونے تک عدم تحفّظ کا اژدہامنہ کو سلے ہوئے پوری نوعِ انسانی کو نگلنے کے لئے بے قرار ہے۔ حالانکہ جہاں تک ترقی کا معاملہ ہے یہ ساری ترقیاں، یہ ساری ایجادات، یہ ساری تخلیقات اس خیال کے تحت وجود میں آئی ہیں کہ نوعِ انسانی کو سکون ملے گا لیکن چونکہ یہ تمام چیزیں (Time & Space) میں بند ہو کر معرضِ وجود

میں آئی ہیں اس لئے آدمی بدحال اور پریشان ہے۔ جنّت کی زندگی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب آدم نے اللہ تعالیٰ کی واضح ہدایت کو پس پشت ڈال دیا تو وہ مصائب اور آلام میں گرفتار ہو گیا۔ قرآن پاک میں ہے:

''اتر جاؤ! اب تمہارے اوپر ذلت اور مسکنت کی مار ہے۔''(سورۃ البقرہ—آیت نمبر 36)

اللہ تعالیٰ کے علم کا عکس

سوال: اللہ تعالیٰ کے ذہن میں کائنات کا کیا علم تھا؟

جواب: کائنات اور کائنات میں موجود تمام تخلیقات، تخلیقات میں تمام نوعیں اور ہر نوع کے الگ الگ افراد، افراد کا پھیلنا اور سمٹنا، پیدائش کا تسلسل اور موت کا وارد ہونا، زمین اور سماوات، سورج، چاند، ستارے، بے شمار کہکشانی نظام، جنّت، دوزخ اور جنّت دوزخ کے اندر زندگی گزارنے کے تمام حواس اور تقاضے، حواس میں ردّ وبدل اور ردّ وبدل کے ساتھ حواس کی کمی بیشی، ذہنی رفتار کا گھٹنا یا بڑھنا، حواس کا الگ الگ تعیّن۔۔۔۔۔سننا، دیکھنا، چھونا، چکھنا، محسوس کرنا، جسمانی خدوخال کا الٹ پلٹ ہونا، جذبات میں اشتعال پیدا ہونا یا کسی بندے، کسی ذی روح کا نرم خو ہونا۔ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود علم کا عکس ہیں۔

کائنات میں موجود کوئی ایک شئے۔۔۔۔۔اس کی حیثیت کسی بڑے سے بڑے ستارے کی ہو یا زمین کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے کی ہو، اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ذہن کے اندر اس خوبصورت دنیا کو مظہر بنانا چاہا تو فرمایا 'کن' اور کائنات میں موجود تمام چیزیں من وعن اسی طرح جس طرح اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھیں یا ہیں ایک تخلیقی وجود میں ظاہر ہو گئیں۔ تخلیقات کا یہ سلسلہ یا کنبہ اتنا وسیع ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے: ''سارے سمندر روشنائی بن جائیں اور سارے درخت قلم بن جائیں، پھر بھی اللہ تعالیٰ کی باتیں پوری نہیں ہوں گی۔''

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو کیوں بنایا؟اور یہ ساری خوبصورت تخلیقات کیوں عمل میں آئیں؟ جنّت دوزخ کے دو الگ الگ گروہ کیوں وجود میں آئے؟ ظاہری دنیا کے عجائبات اور غیب کی دنیا کے لامحدود عجائبات کو کیوں بنایا گیا؟ اس کی وجہ خود اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

"میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ ایک ایسی کائنات تخلیق کروں جو مجھ سے متعارف ہو کر مجھے پہچان لے۔"(حدیث قدسی)

اس حدیث قدسی میں تفکر کرنے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ کائنات کی تخلیق کا منشاء بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے تھے کہ مجھے پہچانا جائے۔ پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ تمام مخلوقات میں سے کسی ایک مخلوق کا انتخاب کیا جائے اور اس منتخب مخلوق کو دوسری مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ علم دیا جائے۔ نہ صرف یہ کہ علم دیا جائے علم کے اندر مفہوم اور معنویت تلاش کرنے کی صلاحیت عطا کی جائے۔ جہاں تک علم کی تقسیم کا تعلق ہے، ہر ذی روح کے اندر علم موجود ہے۔ ایک بکری یہ جانتی ہے کہ درخت کے پتے میری غذا ہیں۔ لیکن بکری یہ نہیں جانتی کہ بیری کا درخت کس طرح اُگتا ہے اور درخت سے درخت اور دوسرے درخت سے تیسرا درخت کیسے اگایا جاتا ہے۔ بھوک پیاس کا علم تمام مخلوقات میں قدر مشترک ہے خواہ وہ ذی روح ہوں یا انہیں ذی روح نہ سمجھا جاتا ہو۔

مخلوق کی دو نوعیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کے اندر معانی تلاش کرنے اور مفہوم پہنانے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ ایک انسان اور دوسرے جنّات، جنّات کی تخلیق کے فارمولے بیان کرنا اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ چونکہ اب تک ان اسباق کو انسان تک محدود رکھا گیا ہے اس لئے انسانی علم ہی ہمارے پیش نظر ہے۔

کائنات کے تخلیقی خدوخال

سوال: کائنات کے تخلیقی خدوخال کیا ہیں؟

جواب: کائنات دراصل اللہ تعالیٰ کا وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس بات سے واقف تھے کہ کائنات کے تخلیقی خدوخال کیا ہیں۔ اپنے علم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تخلیقی خدوخال کو اپنے حکم اور ارادے سے صورت شکل بخش دی۔ اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا مخصوص اور ذاتی علم صورت شکل بن کر وجود میں آگیا۔ اب ہم یوں کہیں گے کہ کائنات کی بنیاد، کائنات کی حقیقت علم اور صرف علم ہے۔ یعنی کائنات نام ہے صرف اللہ تعالیٰ کے علم کا۔ جب تک یہ علم، علم تھا اور اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا اور جب اللہ تعالیٰ کے ذہن میں یہ علم اپنے معانی، مفہوم اور نقش و نگار کے ساتھ ظاہر ہوا تو اس کا نام کائنات بن گیا۔ اب اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ بندے مجھے پہچانیں، میرا تعارف حاصل کریں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود ایک علم ہیں ایسا علم جو ماوراء اور تمام علوم پر محیط ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ مخلوقات میں سے کسی ایک مخلوق کا انتخاب کر کے اسے علم کی دولت سے نوازا جائے۔ قرعۂ فال آدم کے حق میں نکلا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو علم سکھایا۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (سورة البقره – آیت نمبر ۳۱)

اپنی صفات اور اسماء کا علم عطا کیا۔ اسماء سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ صفات ہیں جو صفات کائنات کے خدوخال میں موجود ہیں۔ یہ وہ علم ہے جو آدم کے لئے مخصوص ہے۔ یہ ایسا علم ہے کہ جس سے فرشتے بھی ناواقف ہیں۔ اس علم کی حیثیت اتنی عظمت والی ہے کہ جب یہ علم آدم نے سیکھ لیا تو فرشتوں کو آدم کے سامنے جھکنا پڑا۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ ... سے مراد یہ ہے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے یہ بتادیا کہ کائنات میرے ذاتی علم کا ایک حصّہ ہے اور اس علم میں معانی اور مفہوم کے ساتھ بے شمار فارمولے ہیں، جن فارمولوں سے یہ کائنات تخلیق کی گئی اور جن فارمولوں پر یہ کائنات قائم ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ناموں کا علم سکھادیا، ایسی طرز ہے جو عام سطح کے ذہن کے لئے بیان کی جاسکتی

ہے۔ روحانیت میں اسماء سے مراد وہ فارمولے ہیں جن فارمولوں پر کائنات کی تخلیق کی گئی ہے۔ آدم کو کائناتی تخلیق کے فارمولے سکھانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنّت میں بھیج دیا۔ یہ بات بہت زیادہ اہم ہے کہ اس وقت جنّت میں آدم کی پوزیشن ایک ایسے سائنس دان کی ہے جو کائنات کے تخلیقی فارمولوں کا عالم ہے۔ ان فارمولوں میں بنیادی فارمولا یہ ہے کہ ساری کائنات ایک علم ہے اور آدم اس علم میں معانی اور مفہوم کے ساتھ تصرّف کر سکتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے کن ارشاد فرما کر ساری کائنات کو وجود عطا کر دیا ہے اسی طرح کائنات میں موجود تمام تخلیقات پر فی الارض خلیفہ کی حیثیت سے آدم کو تصرّف کرنے کا اختیار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں کائنات کی تخلیق کا تذکرہ کیا ہے وہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہوں۔ اللہ تعالیٰ بحیثیت خالق کے ایک ایسے خالق ہیں کہ جن کی تخلیق میں وسائل کی پابندی زیر بحث نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ کے ارادے میں جو چیز جس طرح اور جن خدوخال میں موجود ہے، جب وہ اس چیز کو وجود بخشنے کا ارادہ کرتے ہیں تو حکم دیتے ہیں اور اس حکم کی تعمیل میں تخلیق کے اندر جتنے وسائل ضروری ہیں وہ سب وجود میں آکر تخلیق کو عمل میں لے آتے ہیں۔

خالقین کا لفظ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور بھی تخلیق کرنے والے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی طرح دوسری ہر تخلیق وسائل کی پابند اور محتاج ہے۔ اس کی مثال آج کے دور میں بجلی سے دی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک تخلیق بجلی ہے۔ جب بندوں نے اس تخلیق سے دوسری ذیلی تخلیقات کو وجود میں لانا چاہا تو اربوں کھربوں چیزیں وجود میں آ گئیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وصف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لفظ ''کن'' کہہ کر بجلی کو وجود بخش دیا۔ آدم نے اختیاری طور پر یا غیر اختیاری طور پر جب بجلی کے علم کے اندر تفکر کیا تو اس بجلی سے ہزاروں چیزیں وجود میں آ گئیں۔ بجلی سے جتنی چیزیں وجود میں آئیں وہ انسان کی تخلیق ہیں۔ مثلاً ریڈیو، ٹی وی، لاسلکی نظام اور دوسری بے شمار چیزیں۔ روحانی نقطۂ نگاہ سے اللہ تعالیٰ کی اس تخلیق میں سے دوسری ذیلی تخلیقات کا مظہر بننا، آدم زاد کا دراصل بجلی کے اندر

تصرّف ہے۔ یہ وہی علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھادیا تھا۔اسماء سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کوایک ایسا علم سکھادیا کہ جو براہِ راست تخلیقی فارمولوں سے مرکب ہے۔ جب انسان اس علم کو گہرائی کے اندر جاکر حاصل کرتا ہے اور اس علم کے ذریعے تصرّف کرتا ہے تو نئی نئی چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔ بات یہی ہے کہ کائنات دراصل ایک علم ہے، ایسا علم جس کی بنیاد اور حقیقت سے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو وقوف عطا کردیا ہے۔ لیکن اس وقوف کو حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری قرار دے دیا ہے کہ بندے علم کے اندر تفکر کریں۔ یہ بات ہم پہلے بھی عرض کرچکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے:

''ہم نے لوہا نازل کیااور اس کے اندر لوگوں کے لئے بے شمار فائدے ذخیرہ کردیئے۔''

جن لوگوں نے لوہے کی حیثیت اور طاقت کو تسلیم کر کے لوہے کی صفات میں تفکر کیا، ان لوگوں کے سامنے لوہے کی لامحدود صلاحیتیں آگئیں اور جب ان صلاحیتوں کو استعمال کر کے لوہے کے اجزائے ترکیبی کو متحرک کر دیا تو بے شمار چیزیں وجود میں آگئیں۔ لوہا ایک وجود ہے اسی طرح روشنی بھی ایک وجود ہے۔ وسائل کی حدود سے گزر کر یا وسائل کے علوم سے آگے بڑھ کر جب کوئی بندہ روشنیوں کا علم حاصل کرتا ہے تو جس طرح لوہے میں تصرّف کے بعد وہ عظیم الجثہ مشینیں، کل پرزے، جہاز، ریل گاڑیاں، بڑے بڑے بم اور دوسری ترقیوں میں لوہے کو استعمال کرتا ہے اسی طرح روشنیوں کے علوم حاصل کر کے وہ روشنیوں کے ذریعے بہت ساری تخلیقات وجود میں لے آتا ہے۔ تصوّف میں اسی بات کو ''ماہیتِ قلب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وسائل میں محدود رہ کر ہم نے سونے کے ذرّات کو اکٹھا کر کے ایک خاص پروسیس سے گزار کر سونا بناتے ہیں۔ اس کو وسائل میں تصرّف کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ بندہ جو روشنیوں میں تصرّف کرنے کا اختیار رکھتا ہے اس کے لئے سونے کے ذرّات کو مخصوص پروسیس سے گزارنا ضروری نہیں ہے۔ وہ اپنے ذہن میں روشنیوں کا ذخیرہ کر کے ان مقداروں کو الگ کر لیتا ہے جو مقداریں سونے کے اندر کام کر رہی ہیں۔ اور ان مقداروں کو ایک نقطہ پر مرکوز کر کے ارادہ کرتا ہے ''سونا'' سونا بن جاتا ہے۔

اس بات کو دوبارہ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق میں کسی کے محتاج نہیں ہیں جب وہ کوئی چیز بنانا چاہتے ہیں تو کن کے ساتھ تخلیق کے لئے جتنے وسائل کا ہونا ضروری ہے وہ خود بخود تخلیق ہو جاتے ہیں۔اور بندے کا تصرّف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تخلیق میں تصرّف کرتا ہے۔تصرّف کے دو طریقے ہیں۔ایک طریقہ وسائل میں محدود ہو کر وسائل کو مجتمع کر کے کوئی نئی چیز بنائی جاتی ہے اور دوسرا طریقہ روشنیوں میں تصرّف کرنا ہے یعنی کوئی چیز جن روشنیوں پر قائم ہے ان روشنیوں کی مقداروں میں ردّ وبدل کر کے تصرّف کیا جاتا ہے۔تصرّف کا یہ طریقہ انسان کے اندران روشنیوں سے متعلق ہے جن روشنیوں کو اللہ تعالیٰ نے علم الاسماء کہا ہے۔روشنیوں کے اس ذخیرے کو حاصل کرنے کا طریقہ ہی دراصل روحانیت ہے۔روحانیت میں یہ بات دن کی رشنی کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ زمین پر موجود اور پوری کائنات میں موجود ہر شئے کی بنیاد اور بساط روشنی ہے۔اور یہ روشنی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔اللہ تعالیٰ کی ہر صفَت معیّن مقداروں کے ساتھ قائم ہے اور معیّن مقداروں کے ساتھ ردّوبدل ہوتی رہتی ہے۔اور معیّن مقداروں کے ساتھ گھٹتی بڑھتی ہے۔پیدائش سے موت تک کا زمانہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کوئی بچہ اپنی ایک حیثیت پر قائم نہیں رہتا۔جن معیّن مقداروں پر بچہ پیدا ہوا ہے ان معیّن مقداروں میں ایک ضابطہ،ایک قانون اور ایک ترتیب کے ساتھ ردّوبدل ہوتا رہتا ہے۔جس طرح مقداروں میں ردّوبدل ہوتا رہتا ہے اسی مناسبت سے آدمی بھی بدلتا رہتا ہے۔یہاں دو طرزیں زیرِ غور آتی ہیں۔آدم کا بچہ،بچہ ہو،جوان ہو،بوڑھا ہو بہر صورت وہ آدمی رہتا ہے۔یعنی اس کی شکل و صورت اور خدوخال میں تو تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن نوعِ انسانی کی شکل و صورت برقرار رہتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے کائنات کے کنبے کو مختلف نوعوں میں تقسیم کیا ہے۔ایک معیّن مقدار یہ ہے کہ انسان ہر حال میں انسان رہتا ہے لیکن اس کے خدوخال تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔اور زندہ رہنے کے تقاضوں میں ردّوبدل ہوتا رہتا ہے۔ایک بکری کا بچہ ہر صورت بکری کا بچہ رہتا ہے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس کے اندر زندگی گزارنے کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔اب اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ معیّن مقداریں دو رخ پر قائم ہیں۔

.1 ایک رخ یہ ہے کہ اس میں ردّوبدل ہوتا رہتا ہے...اور

.2دوسرا رخ یہ ہے کہ بظاہر کوئی ردّوبدل واقع نہیں ہوتا۔

ردّوبدل یہ ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کے نقوش ڈھل جاتے ہیں اور اس طرح ڈھل جاتے ہیں یا مٹ جاتے ہیں کہ جوانی کی تصویر اور بڑھاپے کی تصویر دو الگ الگ تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس کو معیّن مقداروں میں رد وبدل کا نام دیا جاتا ہے اور وہ مقداریں جو قائم بالذات ہیں یہ ہیں کہ آدمی ایک دن کا بچہ ہو یا سو سال کا بوڑھا ہو، بھوک کا تقاضہ اس کے اندر موجود ہے، پانی پینے کا تقاضہ اس کے اندر موجود ہے۔

عجیب رمز ہے کہ دو سال کا بچہ بھی پانی پیتا ہے، دو سال کا بچہ بھی غذا کھاتا ہے....

سو سال کا بوڑھا آدمی بھی پانی پیتا ہے، سو سال کا بوڑھا آدمی بھی غذا کھاتا ہے...

لیکن سو سال کا آدمی دو سال کا بچہ نہیں ہوتا اور دو سال کا بچہ سو سال کا بوڑھا آدمی نہیں ہوتا۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ روحانی علوم ہمارے اوپر یہ بات واضح کرتے ہیں کہ بڑھاپے اور بچپن کے تقاضے یکساں ہونے کے باوجود صورت و شکل اور خدوخال رنگوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور صورت، شکل اور خدوخال کے ردّوبدل میں اللہ تعالیٰ کے کون سے علم کام کر رہے ہیں۔ ان علوم سے روشناس ہونے کے لئے پہلی بات یہ ضروری ہے کہ ہم ان روشنیوں کا علم حاصل کریں جن روشنیوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کہا ہے۔

باب سوم

کسی چیز کو سمجھنے کے لئے بنیادی عمل نظر ہے

سوال: کسی علم کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

جواب: ہم نے علوم کو دو رخوں میں بیان کیا ہے۔ایک کا نام علمِ حُصولی قرار پایا اور دوسرے کا نام علمِ حُضوری رکھا گیا۔ علمِ حُصولی اور علمِ حُضوری کے ضمن میں عقل اور وجدان کی مختصر تشریح بھی بیان کی گئی۔ مثالوں سے واضح کر دیا گیا کہ عقل کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ہم جو کچھ دیکھتے، سنتے، سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں ہمارے پاس کوئی ایسی علمی توجیہ نہیں ہے کہ ہم اس کو دیکھنے، سننے، چھونے اور محسوس کرنے کو حقیقی عمل قرار دے سکیں۔ بالآخر جب ہم عقلی اور شعوری دائرہ کار میں رہتے ہوئے کسی عمل کا تفکر کے ساتھ اور وجدان کے ساتھ تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارے ہاتھ سوائے ٹٹولنے کے کچھ نہیں آتا۔ کسی چیز کو سمجھنے کے لئے بنیادی عمل نظر ہے یعنی جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں تب اس چیز کے بارے میں ہمیں مزید معلومات حاصل کرنے کا تجسّس پیدا ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں جب ہمیں کسی چیز کا یقین حاصل ہوتا ہے تب بھی یہی صورت حال ہمارے دماغ پر وارد ہوتی ہے کہ ہم اس چیز کے بارے میں معلومات حاصل کریں جس چیز کا ہمیں علم تو حاصل ہوا لیکن ابھی نگاہ کے سامنے نہیں آئی۔ جہاں تک نگاہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ نگاہ کا جب تک کوئی ٹارگٹ یا نشانہ نہ بنے، نگاہ اس چیز کو نہیں دیکھ سکتی۔ ضروری ہوا کہ دیکھنے کے لئے نگاہ کے لئے کوئی مرکزیت قائم ہو اور جس مرکزیت پر نگاہ ٹھہری اس مرکزیت کے اندر اوصاف دماغ کی اسکرین پر منعکس ہو گئے۔ قانون یہ بنا کہ نگاہ وہی کچھ دیکھتی ہے جو دماغ کے اوپر منعکس ہوتا ہے اس کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ دماغ وہی کچھ محسوس کرتا ہے جو نگاہ دماغ کے اوپر منتقل کر دیتی ہے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ دیکھنے کی طرزوں میں ہم جب تفکر کرتے ہیں تو دو باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ایک یہ کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اس کی معنوی اور حقیقی حیثیت کیا ہے؟اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ چیز حقیقت سے کتنی دور ہے یا کتنی قریب ہے؟ دیکھنے کی یہ دو طرزیں بھی علمِ حُضوری یا علمِ حُصولی کے دائرے میں آتی ہیں۔ علمِ حُصولی کے دائرے میں نظر کا جتنا کام ہے وہ مفروضہ اور فکشن ہے۔ مفروضہ اور فکشن سے مراد یہ ہے کہ جس چیز میں ردّوبدل اور تغیّر واقع ہوتا رہتا ہے جیسا کہ ہم نے ابھی ایک پیدا ہونے والے بچے اور ۸۰ سالہ بوڑھے کی مثال دے کر واضح کیا ہے۔ علمِ حُضوری کے اندر جو نظر کام کرتی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔اس لئے کہ علمِ حُضوری کی نگاہ جو کچھ دیکھتی ہے اس میں تغیّر و تبدل نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کسی راہ سلوک کے مسافر نے فرشتہ کو دیکھا۔ وہ اگر سو سال بعد بھی اس فرشتہ کو دیکھتا ہے تو فرشتہ میں کوئی تغیّر اور تبدل اسے نظر نہیں آتا۔ وہ کسی بندے کی روح کو دیکھتا ہے، جب بھی دیکھتا ہے روح اپنے خدوخال کے اعتبار سے وہی نظر آتی ہے۔ جو وہ دیکھ چکا ہے۔اس کے برعکس ایک آدمی بکری کو جوانی کی عمر میں دیکھتا ہے۔ دس سال بعد جب وہ اس کو دیکھتا ہے اس کے خدوخال میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ ردّوبدل اور تغیّر میں دیکھنا شعوری حواس کا کام ہے اور اس دنیائے ناپیدا کنار کا مشاہدہ کرنا۔ جس میں تغیّر اور تبدل نہیں ہے لاشعوری حواس کا دیکھنا ہے۔اب بات اس طرح بنی کہ آدمی کی زندگی میں دیکھنے کی دو طرزیں ہیں۔

ایک طرز بالواسطہ...اور

ایک طرز براہِ راست...

بالواسطہ دیکھنا شعوری نظر ہے...اور

براہِ راست دیکھنا لاشعوری نظر ہے...

شعوری نظر سب کی سب مفروضہ اور فکشن ہے۔لاشعوری نظر سب کی سب غیر مفروضہ، غیر فکشن اور حقیقت ہے۔انبیاء کرام علیہم السّلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی فکشن نظر کی نفی کر کے اس نظر کو حاصل کرے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ایک چیز سے گزر کر دوسری چیز میں داخل ہونا یا ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز حاصل کرنا اسی وقت ممکن ہے جب ہم چھوڑنے والی چیز سے اپنا تعلق عارضی طور پر یا مستقل طور پر منقطع کر لیں۔اس رشتہ کو منقطع کرنے کا نام روحانیت میں اپنی نفی کرنا ہے اور جب آدمی اپنی نفی کرتا ہے تو اس کے سامنے مثبت حواس آ جاتے ہیں۔مثلاً وہ کہتا ہے لاالٰہ نہیں کوئی معبود۔الااللہ، مگر اللہ،اللہ کو جاننے اور اللہ کے اوپر یقین کرنے کے لئے ضروری ہوا کہ پہلے وہ اس اللہ کی نفی کر دے۔جس اللہ کو وہ مفروضہ حواس سے جانتا ہے۔

سیدنا حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے بے شمار بتوں کی پوجا ہوتی تھی اور لوگ ان بتوں کو خدا کا درجہ دیتے تھے اور ان بتوں سے اسی طرح مرادیں مانگتے تھے اور دعائیں کرتے تھے جس طرح اللہ سے دعا کی جاتی ہے۔لاالٰہ کا مطلب یہ ہوا کہ تم جس طرح شعوری حواس میں خدا کو جانتے ہو اس خدا کی نفی کر دو۔اس خدا سے اپنا رشتہ منقطع کر دو۔اور یہ رشتہ منقطع کرنے کے بعد اس خدا سے اپنا ذہنی ارتباط اور ذہنی رشتہ قائم کرو جو دیکھا ہوا خدا ہے اور دیکھنے والی ذات محمد اللہ کے رسول ہیں۔محمد اللہ کے رسول نے جب اللہ کی نشان دہی کی، یہ علم، علمِ حُضوری ہے اور جب تک محمد الرسول اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے خلاف لوگ بتوں کو خدا کا درجہ دیتے یہ سب علمِ حُصولی ہے۔

مختصر یہ کہ آدمی کو حقیقت میں اندر داخل ہونے کے لئے مفروضہ اور فکشن حواس کی نفی کرنا پڑتی ہے۔
روحانیت میں مراقبہ کا عمل اپنی نفی کرنے کے لئے پہلی سیڑھی ہے۔یعنی آدمی ایک ایسا طریقہ کار استعمال کرتا ہے کہ جس کی کوئی شعوری توجیہ فی الواقع پیش نہیں کی جاسکتی۔بجز اس کے کہ مراقبہ کرنے والے بندے کے ذہن میں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ آدمی کے اندر بیک وقت دو نگاہیں کام کرتی ہیں۔ایک نگاہ محدود ہے اور بغیر کسی میڈیم کے کچھ نہیں دیکھتی۔دوسری نگاہ غیر محدود ہے اور اس کو کسی میڈیم کی ضرورت نہیں ہے۔میڈیم سے مراد اسپیس ہے۔آنکھ

یعنی گوشت پوست کی آنکھ ، اسپیس کے دائرے سے باہر نہیں دیکھ سکتی۔ اگر آنکھ کے سامنے سے اسپیس حذف کر دیا جائے تو کچھ نظر نہیں آتااور اس کا تجربہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آدمی کسی ایک نقطہ پر نظر کو اس طرح مرکوز کر دے کہ آنکھ کے ڈھیلے کی حرکت اور پلک جھپکنے کا عمل ساقط ہو جائے تو نظر کے سامنے سوائے خلاء اور روشنی کے کوئی چیز نہیں آئے گی۔ یہاں سے نظر کا ایک اور قانون سامنے آتا ہے۔ فکشن حواس میں دیکھنے کی طرز یہ ہے کہ ڈھیلا حرکت کرتا رہے اور پلک جھپکتی رہے۔ اگر کسی آدمی کی پلکیں باندھ دی جائیں تو چند سیکنڈ کے بعد اس کی آنکھوں کے سامنے سوائے اندھیرے کے کچھ نہیں آئے گا۔ یعنی ڈھیلے کے اوپر پلک جھپکنے کے عمل کے ساتھ ساتھ جو ہلکی ضرب پڑتی ہے وہی باہر سے آنے والے عکس کو دماغ پر منتقل کرتی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک کیمرہ ہے۔ اس کے اندر فلم ہے، کیمرہ کے اندر نہایت عمدہ لینس ہے۔ فلم کے اوپر عکس منتقل ہونے کے لئے جتنی روشنی کی ضرورت ہے فضا میں وہ روشنیاں بھی موجود ہیں۔ کیمرہ کے لینس کو ہم تشبیہاً آنکھ قرار دیتے ہیں اور کیمرہ کے اندر فلم کو ہم دماغ یا حافظہ کی وہ اسکرین قرار دیتے ہیں جس پر عکس منتقل ہوتا ہے۔ لینس کے اوپر جو بٹن لگا ہوا ہے اس کو ہم پلک سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب تک کیمرہ کے اندر لگا ہوا بٹن یعنی کیمرہ کی آنکھ کی پلک نہیں جھپکے گی یا حرکت میں نہیں آئے گی فلم پر کسی قسم کا فوٹو نقش و نگار منتقل نہیں ہو گا۔

روحانی نقطہ نظر سے اور موجودہ سائنس کی روشنی میں ایک منظر کا عکس دماغ کی اسکرین پر ۱۵ سیکنڈ تک قائم رہتا ہے۔ ۱۵ سیکنڈ تک قائم رہنے کا مطلب یہ ہے کہ عکس پہلے ہلکا ہوتا ہے پھر کچھ واضح ہوتا ہے اور پھر زیادہ روشن ہوتا ہے اور پھر دھندلا ہو کر ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ ۱۵ سیکنڈ گزرنے سے پہلے دوسرا عکس منتقل ہو جاتا ہے۔ جب یہ بات سامنے آئی کہ اگر ہم پلک جھپکنے کے عمل کو مسلسل ۱۵ سیکنڈ تک بار بار ساکت کر دیں تو ایک ہی نقش دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتا رہے گا۔ جب کوئی بندہ آنکھیں بند کر کے مراقبہ میں بیٹھتا ہے تو اس صورت میں پلک جھپکنے کا عمل اور پتلی کی حرکت کا عمل جاری رہتا ہے۔ آنکھیں اگر بند ہوں تو عارضی طور پر پلک جھپکنے کا عمل تو ساکت ہو جاتا ہے لیکن پتلی کی حرکت اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور پتلی کی حرکت کے ساتھ ساتھ پپوٹے بھی متحرک رہتے ہیں۔ پپوٹوں کے متحرک

رہنے سے مراد یہ ہے کہ پلک کی حرکت ابھی جاری ہے یعنی دیکھنا اور دماغ کے اوپر عکس بندی کا عمل جاری و ساری ہے۔ مراقبہ کرنے والا بندہ ایک نقطہ پر اپنے ذہن کو مرکوز کرتا ہے اور وہ نقطہ یا مرکزیت یا میڈیم تصوّرِ شیخ ہے یعنی وہ دیکھنے کی پوری صلاحیتوں کو شیخ کے تصوّر میں مجتمع کر دیتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی عکس پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ تسلسل کے ساتھ دماغ کے اوپر منتقل ہوتا رہتا ہے۔ قانون یہ بھی ہے کہ جو عکس دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتا ہے اس عکس کے اندر موجود صلاحیتیں صفات اور خاصیتیں بھی دماغ کے اوپر منتقل ہوتی ہیں اور دماغ انہیں محسوس کرتا ہے مثلاً ایک آدمی آگ دیکھتا ہے۔ آگ کا عکس جیسے ہی دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتا ہے آدمی کے اندر حرارت، حدّت اور گرمی کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک آدمی سرسبز و شاداب درخت دیکھتا ہے، باغ کے اندر خود کو دیکھتا ہے جو سبز ہے، ہرا ہے اس کے اندر جو پرسکون خاصیت ہے۔ درخت پھل اور پھول کے ساتھ ساتھ اس رنگ کی ٹھنڈک بھی دماغ کو محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح جب شیخ کی شبیہ دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتی ہے تو شیخ کے اندر جو علمِ حُضوری کی نظر کام کر رہی ہے وہ دماغ کے اوپر منتقل ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات

سوال: کائنات کو تخلیق کرنے کے لئے اللہ کے ذہن میں کیا پروگرام تھا؟

جواب: کائنات کی تخلیق اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر جب ہم غور کرتے ہیں جس ارشاد کی بنا پر کائنات اپنے تمام تخلیقی اجزاء اور عناصر کے ساتھ موجود ہو گی تو ہم اس کے علاوہ دوسری کوئی بات نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم کائنات کی صورت میں وجود پذیر ہو گیا۔ جس حکم کی بناء پر وسیع و عریض اور لا متناہی کائنات، کھربوں کہکشانی نظام، سنکھوں کی تعداد سیارگان اور کروڑوں کی تعداد میں ستارے وجود میں آنے کا سبب صرف اللہ تعالیٰ کا ایک حکم ہے اور وہ حکم ہے ''کن''... کن کا مطلب ہے ''ہو جا'' جب ہم اس ''ہو جا'' کے اوپر غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہو جا کہنے والی ہستی کے ذہن میں کوئی ایسا پروگرام ہے جس پروگرام کے تحت وہ کسی چیز کو نہ صرف یہ کہ وجود میں لانا چاہتا

ہے بلکہ اسے قائم رکھنے کے لئے وسائل بھی فراہم کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ کیا ہو جا صرف یہ فرمایا کہ ''کن ''ہو جا۔کیا ہو جا یہ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود ہے۔اللہ تعالیٰ کا ذہن اللہ تعالیٰ کا علم ہے اور اللہ تعالیٰ کا تمام کا تمام علم اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔اللہ تعالیٰ نے جب کن فرمایا تو کائنات کو تخلیق کیا۔پھر اس تخلیق میں ایک نئی بات پیدا ہوئی۔وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بنائی ہوئی تخلیق کو نظر عطا کی۔اور نظر کو فعّال، متحرّک بنانے کے لئے ارشاد فرمایا۔'' أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ''میں ہوں تمہارا رب۔(سورۃ اعراف–آیت نمبر 172 ...)بہت زیادہ تفکر طلب ہے۔اس کی تشریح کو آئندہ کے لئے محفوظ کر کے ہم اصل معاملے کی طرف آتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا کہ میں تمہارا ربّ ہوں تو کائنات میں موجود تمام تخلیقات، بشمول فرشتے اور انسان اور جنّات، سب نے بر ملا یہ کہا۔''جی ہاں! ہم یہ بات جانتے ہیں کہ آپ ہمارے ربّ ہیں۔''اللہ تعالیٰ کے یہ فرمانے سے پہلے کہ میں تمہارا ربّ ہوں کائنات کی حیثیت ایک گونگی، بہری شئے کی تھی۔اس کو اپنا ادراک تو تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ میں کیا ہوں، کیوں ہوں، کون ہوں اور میرا بنانے والا کون ہے۔یہ نہ جاننا کہ میں کون ہوں، کیوں ہوں اور میرا بنانے والا کون ہے۔اس بات کی علامت ہے کہ کائنات کو ابھی نظر نہیں ملی تھی۔کائنات میں چونکہ بنیادی حیثیت انسان کی ہے اس لئے ہم کائنات کی بجائے انسان کا تذکرہ کریں گے۔کسی جگہ بے شمار انسان موجود ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ اور ہمارا بنانے والا کون ہے؟ اس لاعلمی کو علم سے بدلنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ اقدس کو کائنات کے سامنے پیش کیا۔اور بآواز بلند فرمایا''میں تمہارا ربّ ہوں۔''کائنات یا انسان اس آواز کی طرف متوجہ ہوا۔اور اس نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا اعتراف کیا۔اب اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ نظر کا پہلا ٹارگٹ یا مرکزیت اللہ ہوا۔اللہ کو دیکھنے کے بعد اللہ کا عکس دماغ کے اوپر منتقل ہوا۔یہی وہ قانون ہے جس کو ہم نے پچھلے اسباق میں بیان کیا ہے یعنی آنکھ کسی عکس کو قبول کر کے دماغ کی اسکرین پر منتقل کرتی ہے۔یہ منتقلی ۱۵ سیکنڈ ہلکی گہری قائم رہ کر تبدیل ہو جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے پیش نظر ہم یہ جانتے ہیں کہ نظر اس وقت کام کرتی ہے جب نظر کے لئے کوئی مرکزیت ہو، انسان کی نظر کی پہلی مرکزیت اللہ ہے۔اس دنیا میں آنے کے بعد مرکزیت میں تبدیلی

واقع ہوئی۔ ہم علمِ حُضوری سے ہٹ کر علمِ حُصولی کے جال میں بند ہو گئے۔ نتیجے میں ہماری نگاہ کی مرکزیت مفروضہ اور فکشن حواس بن گئے۔ لیکن قانون اپنی جگہ بحال رہا جس طرح حقیقت دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتی ہے۔ اسی طرح فکشن حواس بھی دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ فکشن حواس کی منتقلی ہمیں پابند حواس میں قید رکھتی ہے اور غیر فکشن حواس کی منتقلی ہمیں آزاد دنیا سے روشناس کراتی ہے۔ روحانی سلسلوں، اسباق، قواعد و ضوابط، اعمال و اشغال، تفکر، مراقبہ، تصوّرِ شیخ ان تمام باتوں کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ کسی ایک ہستی کو مرکزیت بنا کر بار بار دماغ کی اسکرین پر منتقل کیا جائے۔ جتنا زیادہ ایک خیال یا ایک مرکزیت دماغ کی اسکرین پر منعکس ہوتی ہے۔ اسی مناسبت سے دماغ کا ایک پیٹرن بن جاتا ہے۔ اور یہی پیٹرن تصوّف کی اصطلاح میں طرزِ فکر ہے۔ ہم جب استاد، پیر و مرشد یا شیخ کا تصوّر کرتے ہیں تو ازلی قانون کے مطابق شیخ کے اندر کام کرنے والی اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم بار بار ہمارے دماغ کے اوپر وارد ہوتا ہے اور جیسے جیسے شیخ کے اندر کام کرنے والی روشنیاں سالک کے اندر کام کرتی ہیں۔ سالک کا ذہن ایک نقطہ پر قائم ہو جاتا ہے۔

اسی کو تصوّف کی اصطلاح میں نسبت قرار دیا گیا ہے۔ روحانیت میں نسبت حاصل کرنے کا اہم ذریعہ محبت ہے جس قدر محبت و عشق کی لہریں موجزن ہوتی ہیں۔ اسی مناسبت سے شیخ کا ذہن منتقل ہوتا رہتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ شیخ کے اندر کام کرنے والی نہ صرف یہ کہ روشنیاں، انوار بلکہ اللہ تعالیٰ کی تجلّیات بھی سالک کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ یا سالک ان انوار اور تجلّیات سے متعارف ہو جاتا ہے۔ اس صورت کا نام تصوّف میں ''فنا فی الشیخ'' ہے۔ شیخ کی روشنیاں اورِ شیخ کے اندر کام کرنے والے انوار و تجلّیات بھی شیخ کا اپنا ذاتی وصف نہیں ہے۔ جس طرح ایک سالک نے اپنی تمام تر توجہ اور ذہنی ارتکاز کے ساتھ شیخ کے علم اور شیخ کی صفات کو اپنے اندر منتقل کیا ہے، اسی طرح شیخ نے اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ سیدنا حضور ﷺ کے علم اور صفات کو اپنے اندر منتقل کیا ہے۔ فنا فی الشیخ کے بعد شیخ کے اندر کام کرنے والی وہ صلاحیتیں سالک کے اندر بیدار اور متحرّک ہو جاتی ہیں جن صلاحیتوں کی بنیاد پر شیخ نے سیدنا حضور ﷺ کی نسبت حاصل کی ہے۔ اس مقام کو تصوّف میں فنا فی الرسول کہا جاتا ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں تمہاری طرح کا بشر ہوں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ میرے اوپر وحی آتی ہے۔ بشریت کے دائرے سے باہر ہو کر دیکھا جائے تو حضور ختم المرسلین کی فضیلت یہ ہے کہ ان کے اوپر وحی نازل ہوتی ہے اور وحی خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے یعنی سیدنا حضور ﷺ کے ذہن مبارک پر اللہ تعالیٰ کے علوم اللہ تعالیٰ کے انوار اور اللہ تعالیٰ کی تجلّیات منعکس ہوتی ہیں۔ فنا فی الرسول کے بعد کوئی سالک قدم بہ قدم محبت و عشق اور گداز کے ساتھ حضور ﷺ کے علوم کا عارف ہوتا رہتا ہے اور ایک سعید وقت ایسا آتا ہے کہ حضور ﷺ کے علوم سالک کو اس کی استطاعت کے مطابق حاصل ہو جاتے ہیں۔ جتنی استطاعت کسی سالک کے اندر موجود ہے اور جس مناسبت سے حضور ﷺ کے علوم اسے منتقل ہوئے اسی مناسبت سے وہ حضور ﷺ کی نسبت سے فائز ہوا۔ تصوّف میں اس نسبت کو نسبت محمدی کہا جاتا ہے۔ نسبت محمدی حاصل ہونے کے بعد سالک کا ذہن اللہ تعالیٰ کی صفات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور بالآخر وہ حضور ﷺ کی نسبت اور ہمت کے وسیلے سے اس مقام پر جا ٹھہرتا ہے جس مقام میں رہتے ہوئے اس نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ جی ہاں! آپ ہمارے ربّ ہیں اس نسبت کو تصوّف میں نسبت وحدت کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں تو وہ وہ مقامات کھلتے ہیں جن کے بارے میں لکھنا یا بتانا، شعوری سکت سے باہر ہے۔

مقصد اس تمام گفتگو سے یہ ہے کہ انسان کے اندر دماغ ایک ایسی اسکرین ہے جس کا عکس مسلسل و متواتر بغیر وقفہ کے منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عکس کی معنویت جدا جدا ہے۔ اگر عکس کی یہ منتقلی علمِ حُصولی کے دائرہ کار میں ہے تو اس علم کی تمام معنویت مفروضہ اور فکشن ہے اور اگر اس عکس کی منتقلی علمِ حُضوری کے دائرہ کار میں ہے تو عکس کے اندر موجود تمام علوم حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن قانون اپنی جگہ قانون ہے۔ جب تک ذہن انسانی پر کوئی عکس منتقل نہیں ہوتا۔ انسان کی نظر کام نہیں کرتی۔ یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کوئی آدمی اندھا ہے اس کی آنکھیں نہیں ہیں۔ وہ بھی دوسری چیزوں کو محسوس کرتا ہے، سمجھتا ہے ان کی علمی حیثیت کو جانتا ہے ہم اس بات کو بتا چکے ہیں کہ دیکھنے کا عمل ڈیلوں کی حرکت اور پلک جھپکنے پر قائم ہے۔

اس ساری گفتگو کا لب لباب یہ ہوا کہ روحانی علوم حاصل کرنے کے لئے نسبت حاصل ہونا ضروری ہے۔ نسبت سے مراد دراصل اس استاد یا پیر و مرشد کی طرزِ فکر ہے جس سے روحانی علوم منتقل ہو جاتے ہیں۔ روحانی علوم منتقل ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ ایک قسم کا ایسا ورثہ ہے جو شیخ کی روحانی اولاد کو منتقل ہوتا ہے۔ جس طرح ایک باپ کی دنیاوی دولت اولاد میں تقسیم ہوتی ہے۔ نسبت یا طرز و فکر کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ یہ کہ ایسے بندے کی طرزِ فکر منتقل ہو جس کے ذہن میں دنیاوی جاہ و جلال، عزت و شہرت کی اہمیت ہو۔ دوسری نسبت یہ ہے کہ ایسے استاد کی طرزِ فکر منتقل ہو جس کی طرزِ فکر میں اور جس کے ذہن میں دنیاوی جاہ و جلال کی کوئی خاص وقعت نہ ہو۔ اس حد تک وہ دنیا سے متعلق ہو کہ اس کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ ضروریات کے سلسلے میں بھی اس کی طرزِ فکر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بنیادی طور پر دنیاوی ضروریات کم سے کم ہونی چاہئیں۔

وہ طرزِ فکر جس میں دنیا کی محبت ہے اور دنیاوی آرام و آسائش کی اس کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت ہے۔ میں بھی روحانی قدریں موجود ہیں۔

اور ایسے استاد یا گروسے جو علم منتقل ہوتا ہے اس کو بھی روحانی علوم سے باہر نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے علوم جو روحانیت کے دائرہ کار میں آتے ہوں اور طرز فکر میں بھی روحانی قدریں موجود ہیں۔ اس طرز فکر سے بندے کے اندر بھی روحانی استعداد موجود ہوتی ہے۔ ءبنیادی طور پر دنیاوی ہو تصوّف کی اصطلاح میں استدراج کہلاتے ہیں۔

استدراج سے مراد یہ ہے کہ ایسے علوم جن کے ڈانڈے شیطان سے ملتے ہوں یعنی بنیادی طور پر شیطنیت اس کے اندر موجود ہو۔ ہم اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ شیطان یا ابلیس جن علوم سے فیض یاب ہے اور جو علوم اسے حاصل ہیں یا اس کی ذُریّت کو حاصل ہیں وہ بھی ایک درجہ میں روحانی علوم ہیں۔ اس کے برعکس وہ روحانی علوم جو ایسے استاد سے منتقل ہوتے ہیں جن کی طرزِ فکر میں دنیا محض ایک فریب ہے اور فکشن ہے، ان کو علمِ حُضوری کہا جاتا ہے۔ روحانی علوم کی دو طرزیں ہیں ایک استدراج اور ایک علمِ حُضوری۔ استدراج سے مراد وہ تمام شیطانی علوم ہیں

جو آدمی اپنی روحانی صلاحیتوں کو بیدار کر کے حاصل کر لیتا ہے۔ یہ بات بہت زیادہ غور طلب ہے کہ استدراجی علوم بھی بطور ورثہ کے منتقل ہوتے ہیں۔اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ استاد کی شیطانی طرزِ فکر مرید کے اندر منتقل ہو گئی۔ استدراج کو حاصل کرنے کے لئے بھی ذکر و اشغال موجود ہیں۔اس علم کو حاصل کرنے کے لئے بھی محنت و مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور بڑی بڑی ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔اسی طرح علمِ حُضوری حاصل کرنے کے لئے بھی بڑے بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ جس طرح ایک روحانی آدمی سے کوئی کرامت صادر ہوتی ہے اسی طرح ایک ایسے آدمی سے بھی خرق عادت صادر ہوتی ہے جو استدراج کا یا شیطانی علوم کا وارث ہے۔یہ بات کہ استدراج اور شیطانی علوم سے خرق عادت کا صادر ہونا یا علمِ حُضوری یا انبیاء کے علوم کے تحت کسی کرامت یا خرق عادت کا صادر ہونا قرآن پاک سے ثابت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بالوضاحت بیان فرمایا ہے۔ فرعون نے اپنے ملک کے تمام ماہر جادو گروں کو طلب کیا اور ایک مقررہ دن حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے مقابلے کے لئے مقرر ہوا۔ایک بڑے میدان میں وہ تمام ماہرین علم استدراج اور جادو گر جمع ہو گئے۔اس میدان میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام بھی موجود ہیں۔ سوال کیا گیا کہ اے موسیٰ! پہل آپ کی طرف سے ہو گی یا ہماری طرف سے؟ جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے ارشاد فرمایا۔اے جادو گر! پہل تم کرو۔ جادو گروں نے رسیاں پھینکیں جو سانپ بن گئیں اور بانس پھینکے جو اژدھا بن گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام اس ہیئت کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

علم استدراج اور علم نوری میں فرق

سوال: علم استدراج اور علم نوری سے کیا مراد ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے قصے میں قرآن میں بتایا گیا؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔"اے موسیٰ! ڈر مت اپنے عصا کو پھینک دے۔" حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا عصاء یا لاٹھی ایک بڑا اژدھا بن گیا اور اس نے میدان میں موجود تمام سانپوں اور اژدھوں کو نگل لیا۔اور اس

طرح علم استدراج یا جادو کے علوم پر علمِ حضوری کو فتح حاصل ہوئی۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کہ جادو گروں نے رسی پھینکی تو سانپ بن گئی اور بانس پھینکے تو اژدھے بنے اور موسیٰ علیہ السّلام نے لاٹھی پھینکی تو وہ بھی ایک اژدھا بن گئی۔ فرق اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام کی ایک لاٹھی اتنا بڑا اژدھا بن گئی کہ اس نے میدان میں موجود بے شمار سانپوں اور اژدھوں کو نگل لیا۔ لیکن جہاں تک جادو گروں کی خرق عادت یا جادو کا تعلق ہے ان کی رسیاں بھی سانپ بنتی ہیں اور جہاں تک موسیٰ علیہ السّلام کے معجزہ کا تعلق ہے ان کی لاٹھی بھی اژدھے کی صورت اختیار کرتی ہے البتہ ایک بات ہمیں نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام کا بنایا ہوا اژدھا بہت زیادہ طاقتور تھا۔ یعنی جادو اور علمِ حق دونوں علوم کا وجود تو ہے مگر علمِ حق ہمیشہ شیطانی علوم یا استدراج پر غالب آتا ہے۔

اس بات کو ذرا آسان الفاظ میں بیان کیا جائے تو اس طرح کہا جائے گا کہ علم کا تعیّن دو درجوں میں ہوتا ہے

ایک درجہ یہ ہے کہ اس علم کی بنیاد زر پرستی، جاہ طلبی اور دنیاوی عزت و وقار ہوتا ہے اور علمِ حق کی تعریف یہ ہے کہ علمِ حق میں ماسوا اللہ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ علمِ حق والا بندہ جو کچھ کرتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے جو کچھ سنتا ہے وہ حق کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے پیش نظر کوئی نام وَری نہیں ہوتی اس کے پیش نظر نعوذ باللہ زر پرستی نہیں ہوتی۔ اس کے پیش نظر کوئی دنیاوی لالچ نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آتی کہ مجھ سے کوئی ایسی خرق عادت صادر ہو جس کی وجہ سے لوگ مرعوب ہوں اور میری عزت کریں۔ اس کے برخلاف علم استدراج والوں کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کارنامے دکھا کر دنیا حاصل کریں اور دنیا کی نظر میں سرخرو ہوں۔ اس کی سند بھی قرآن پاک سے ملتی ہے۔ فرعون مصر نے جادو گروں کو طلب کر کے کہا کہ اگر تم نے موسیٰ کو زیر کر دیا تو میں تم کو مالا مال کر دوں گا اور تمہیں اپنا مصاحب بنا لوں گا۔۔۔۔۔ اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ جادو گروں نے اپنے جادو کے زور پر جو کارنامے انجام دیئے اس کے پیچھے ان کے خیالات، اغراض و مقاصد اور دنیا پرستی تھی۔ جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو میدان میں آنے سے پہلے اس قسم کی کسی بات کا خیال تک نہیں آیا۔ محض حق کے غلبہ کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کو ظاہر

کرنے کے لئے اور یہ بتانے کے لئے کہ شیطانی علوم علمِ حق کے سامنے باطل ہیں۔ کمزور ہیں، جھوٹے ہیں، میدان میں تشریف لے آئے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ڈرمت اپنی لاٹھی پھینک دے، یہ ثابت کرتا ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام کے ساتھ میدان میں جو کچھ پیش آیا وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے محض اللہ کے بھروسہ پر ان بڑے بڑے طاقت ور جادو گروں کے سامنے اللہ کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اس واقعہ میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ جادو گروں نے جو رسیاں پھینکی تھیں اور ان کے سانپ بن گئے تھے اور جو بانس پھینکے تھے ان کے اژدھے بن گئے تھے۔ یہ سب فریب دھوکہ اور فکشن تھا اس لئے کہ جب موسیٰ علیہ السّلام کی لاٹھی نے ان کو نگل لیا تو اس کا کوئی وجود قائم نہیں رہا جب کہ موسیٰ علیہ السّلام نے اپنی لاٹھی پر دوبارہ ہاتھ ڈالا تو ان کی لاٹھی موجود تھی۔ معجزہ اور جادو میں یہ فرق بہت نمایاں ہے۔ جادو کے زور سے کوئی چیز قائم کی جائے یا کسی کے اندر تصرّف کیا جائے چونکہ وہ اس ذہن کی پیداوار نہیں ہے جو ذہن حقیقت سے آشنا ہے اس لئے جادو کی تخلیق یا جادو کا یہ مظاہرہ عارضی ہوتا ہے۔ قانون یہ ہے کہ حقیقت ادلتی بدلتی نہیں ہے۔ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے اور حقیقت رہتی ہے۔ جادو کے زور سے بنے ہوئے سانپ اور جادو کے زور سے بنے ہوئے اژدھے سب نیست و نابود ہوگئے اور موسیٰ علیہ السّلام کی لاٹھی اپنی جگہ موجود رہی۔ اس واقعہ سے روحانیت میں چلنے والے شاگردوں کے لئے یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ طرزِ فکر اگر غیر حقیقی ہو وہ عارضی ہوتی ہے اور اس سے آدمی ذہنی طور پر فرار حاصل کرلیتا ہے۔ طرزِ فکر اگر حقیقی ہو تو حقیقت آشنا، طرزِ فکر جہاں بھی منتقل ہو جائے حقیقت آشنا رہتی ہے اور حقیقت میں ردّ و بدل نہیں ہوتا۔ ایک استاد یا گرو اپنے چیلے کو جب استدراجی علوم سکھاتا ہے اور یہ علوم سکھانے کے لئے چیلے کے اندر اپنی طرزِ فکر منتقل کرتا ہے تو وہ چیلا گرو بن جاتا ہے لیکن یہ گرو کسی بھی وقت اس طرزِ فکر سے چھٹکارا حاصل کرلیتا ہے یا کر سکتا ہے اور ایک ایسا بندہ جو سیدنا حضور ﷺ یا پیغمبران کرام علیہم السّلام کی طرزِ فکر سے آشنا ہے یا اولیاءاللہ کی طرزِ فکر اسے فی الواقع منتقل ہوگئی ہے تو یہ بندہ اس طرزِ فکر سے کبھی آزاد نہیں ہوتا اور اس طرزِ فکر میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ حقیقت حقیقت سے گلے مل لیتی ہے۔

تاریخ میں ایسی ایک مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایسے بندے نے جو حقیقی طرزِ فکر کا حامل تھا علم استدراج کی طرف رجوع کیا ہو اور ایسی ہزار ہا مثالیں موجود ہیں کہ علم استدراج کے بڑے بڑے ماہر اور دانش وروں نے اسلام کی حقانیت کو قبول کر کے شیطانی علوم سے اپنا دامن صاف کر لیا ہے۔ پیر و مرشد دراصل ایک استاد یا گرو کی طرح ہے بات صرف اتنی سی ہے کہ استاد کے اندر طرزِ فکر کون سی کام کر رہی ہے؟ اس طرزِ فکر کا تعلق شیطنیت سے ہے یا اس طرزِ فکر کی رسائی حق تک ہے۔ جس کی طرزِ فکر کی رسائی حق تک ہے وہی طرزِ فکر بندے کو اللہ سے متعارف کراتی ہے اور ایسا ہی بندہ راہِ سلوک میں قدم قدم چل کر اللہ کا عرفان حاصل کرتا ہے۔

طرزِ فکر کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دراصل انسان کا کردار اس کی طرزِ فکر سے تعمیر ہوتا ہے۔ طرزِ فکر میں اگر پیچ ہے تو کسی بندے کا کردار بھی پُر پیچ بن جاتا ہے۔ طرزِ فکر سادہ ہے تو بندے کی زندگی میں سادگی کار فرما ہوتی ہے۔ طرزِ فکر اگر سطحی ہے تو ایسا بندہ ہر چیز کو بالکل سطحی طریقہ پر سوچتا ہے۔ طرزِ فکر میں اگر گہرائی ہے تو بندہ ہر چیز کے اندر گہرائی تلاش کرنے کے لئے تفکر کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے اسی طرزِ فکر کی نشاندہی کی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے سورج کو دیکھا تو سمجھا کہ یہی خدا ہے لیکن جب اسے زوال پذیر ہوتے دیکھا تو طرزِ فکر کی گہرائی نے ان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ گھٹنے والی چیز کبھی خدا نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے ماحول میں جتنے اور لوگ تھے ان کی سمجھ میں کبھی یہ بات نہیں آئی کہ بدلنے والی اور گھٹنے والی چیز کبھی خدا نہیں ہو سکتی۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی موجودگی میں ایک فردِ واحد کی سوچ الگ ہے اور اس سوچ میں حقیقت پسندی اور گہرائی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے واقعہ سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بہت برے ماحول میں ایک خاص طرزِ فکر کے لوگوں میں رہتے ہوئے بھی طرزِ فکر الگ ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت پسندانہ طرزِ فکر کہاں سے منتقل ہوئی۔ جب کہ پورے ماحول میں یہ کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ حقیقت پسندانہ طرزِ فکر ہر آدمی

کے اندر موجود ہے لیکن ہر آدمی اسے استعمال نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے بتوں کو توڑ ڈالا۔ لوگوں کے اندر اشتعال پیدا ہو گیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے پوچھا کہ ان خداؤں کو کس نے توڑا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اپنے ان خداؤں سے پوچھ لو۔ باوجود یہ کہ ان لوگوں کے سامنے یہ بات آگئی کہ بت اپنی مرضی اور منشاء کو استعمال نہیں کر سکتے اور انہیں توڑا پھوڑا جا سکتا ہے۔ ان کے اندر حقیقت پسندی نے حرکت نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی دیکھتے اور سمجھتے ہوئے بھی غیر حقیقی باتوں کو اصل اور حقیقی سمجھتا ہے۔ تصوّف میں سالک جب راہِ سلوک اختیار کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کی طرزِ فکر میں تبدیلی واقع ہوتی ہے اور اس طرزِ فکر کی داغ بیل اس طرح پڑتی ہے کہ روحانی استاد یا پیر و مرشد بتدریج اپنے شاگرد سے اس قسم کی باتیں کرتا ہے جو اس کے ماحول میں موجود نہیں ہیں یا ماحول میں بسنے والے لوگ ان کی طرف اپنے اختیار سے توجہ نہیں دیتے۔ مثلاً اگر یہ کہ فی الواقع کوئی روحانی شخصیت ہے اس کی مجلس میں بیٹھ کر ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں جو عام طور پر دوسری مجلسوں میں نہیں کہی جاتیں۔ بعض اوقات یہ باتیں اتنی دلچسپ اور عجیب ہوتی ہیں کہ ایسے لوگ بھی جن کی طرزِ فکر ناقص ہے اور یہ ناقص طرزِ فکر ان کے اندر مستحکم ہے وہ بھی ان باتوں کو سننے کے لئے اس مجلس میں شریک ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے پیر و مرشد جو کام سرانجام دیتا ہے وہ یہ ہے کہ مرید کے اندر اس بات کو راسخ کر دیتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی مفروضہ فکشن اور عارضی ہے جو چیز مفروضہ فکشن اور عارضی ہے اس کو حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ باوجود یہ کہ آدمی خود کو بااختیار سمجھتا ہے۔ زندگی کے شب و روز میں کہیں بھی اس کا اختیار زیر بحث نہیں آتا۔ وہ پیدائش کے بعد بالکل غیر اختیاری طور پر بڑھتا رہتا ہے۔ جوانی کے بعد یہ نہ چاہنے کے باوجود کہ وہ بوڑھا ہو بالآخر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ دنیا کا ایک فرد واحد بھی نہیں چاہتا کہ وہ مر جائے لیکن جو آدمی پیدا ہوتا ہے وہ ضرور مرتا ہے۔ آدمی کو اس بات پر تو اختیار حاصل ہے جیسا کہ وہ سمجھتا ہے کہ غذائی ضروریات کو کم یا زیادہ کر لے لیکن اِس بات پر اُس کو بالکل دسترس حاصل نہیں کہ وہ ساری زندگی کھانا نہ کھائے یا ساری زندگی پانی نہ پیئے۔ یا ہفتوں مہینوں بیدار رہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں کہ جو ہر شخص کے ساتھ نہ صرف یہ کہ پیش آتی ہیں بلکہ اس کے ہر ہر لمحہ کے ساتھ چپکی ہوئی ہیں۔

لمحات وقت گھنٹے دن مہینے اور سالوں کا یہ تغیّر ایک ایسا تغیّر ہے جس سے کوئی باہوش آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ان تمام تغیّرات کی نشاندہی کر کے پیر و مرشد یہ بات بتاتا ہے کہ اس تغیّر کے پیچھے یہ حقیقت چھپی ہوئی ہے کہ کوئی ذات ایسی ہے جس کے ہاتھ میں اس تغیّر و تبدل کی ڈوریاں ہیں اور وہ ہاتھ سے ان ڈوریوں کو جس طرح حرکت دے رہا ہے زندگی تغیّر پذیر ہو رہی ہے۔جب سالک کے ذہن میں یہ دن رات کا ایسا مشاہدہ جس کے اوپر عوامُ النّاس نے پردہ ڈالا ہوا ہے سامنے آتا ہے تو اس کا ذہن خود بخود اس ہستی مطلق کی طرف رجوع ہوتا ہے جس ہستی کے ہاتھ میں تغیّر و تبدل کی ڈوریاں حرکت کر رہی ہیں۔یہ طرزِ فکر کا پہلا بیج ہے جو کسی مرید یا سالک کے دماغ میں بو دیا جاتا ہے پھر اس بیج کو پروان چڑھانے کے لئے پیر و مرشد مزید جدّ وجہد اور کوشش کرتا ہے اور وہ یہ کہ وہ ایسے برگزیدہ حضرات کو سامنے لاتا ہے جن کی طرزِ فکر میں حقیقت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

روحانی تصرّف کیا ہے؟

سوال: مرشد کس طرح اپنے مرید پر روحانی تصرّف کرتا ہے؟

جواب: مثلاًیہ کہ وہ اپنے روحانی تصرّف سے مرید کو خواب کی ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جس دنیا میں اولیاء اللہ اور پیغمبروں کی زیارت اسے نصیب ہوتی ہے۔مسلسل اور متواتر خواب کے مشاہدے کے بعد اولیاءاللہ اور پیغمبروں کی طرزِ فکر پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی طرزِ فکر پر ایک ایسا رنگ چڑھ جاتا ہے جو رنگ اولیاء اور پیغمبروں کے لئے مخصوص ہے۔اس کی باطنی آنکھ پر پیر و مرشد ایسی عینک لگا دیتا ہے کہ عینک کے اندر لگے ہوئے شیشے اسے وہی کچھ دکھاتے ہیں جو پیر و مرشد کی طرزِ فکر ہے۔عام مثال سے اسے بہت آسانی کے ساتھ اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ عینک کے اندر جس قسم کے گلاس لگے ہوئے ہیں آدمی کو چیزیں اسی رنگ کی نظر آتی ہیں۔عینک کے گلاس اگر سرخ ہیں تو اسے ہر چیز سرخ نظر آتی ہے۔عینک کے گلاس اگر پیلے ہیں تو اسے ہر چیز پیلی نظر آتی ہے۔عینک کے گلاس اگر صاف و شفاف اور مجلّیٰ ہیں تو اسے ہر چیز صاف و شفاف اور مجلّیٰ نظر آتی ہے۔عینک کے شیشے اگر دھندلے ہیں تو ہر چیز دھندلی نظر آتی ہے اور اگر عینک کے شیشے اندھے ہیں تو عینک آنکھ پر لگانے کے باوجود آنکھ اندھی رہتی ہے حالانکہ عینک لگانے

کے بعد آنکھ کھلی ہوئی ہے۔ عینک کا شیشہ دراصل طرزِ فکر ہے۔ عینک کے اندر جس قسم کی طرزِ فکر کا گلاس فٹ کر دیا جاتا ہے۔ دنیا اسے اسی طرح نظر آتی ہے۔ عینک کے اندر فٹ ہوا لینس اتنا صاف اور مجلّٰی بھی ہو سکتا ہے اور ایسا ہوتا ہے کہ آدمی میلوں پر موجود چیز دیکھ لیتا ہے اور عینک کے اندر لگا ہوا گلاس یا شیشہ اتنا اندھا بھی ہوتا ہے کہ عینک لگانے کے بعد آدمی کو اتنا بھی نظر نہیں آتا جتنا وہ عینک لگائے بغیر دیکھ لیتا ہے۔ یہ دیکھنا سمجھنا، چیزوں کی ماہیئت کو معلوم کرنا، تفکر کرنا ہر آدمی کے اندر موجود ہے بات صرف اتنی ہے کہ ان صلاحیتوں کا اسے استعمال نہیں آتا۔ پیر و مرشد چونکہ تفکر کی صلاحیتوں کے استعمال کو جانتا ہے اور اس کی تمام زندگی تفکر سے تعبیر ہے اس لئے جب مرید کے اندر پیر و مرشد کی صلاحیت منتقل ہوتی ہے تو تفکر کا بویا ہوا بیج آہستہ آہستہ تناور درخت بن جاتا ہے۔ اس بیج کو تناور درخت بننے میں جو چیز رکاوٹ بنتی ہے وہ آدمی کا اپنا ذاتی ارادہ اور عقل و شعور ہے۔ روحانیت میں کوئی بندہ جب اپنی ذات کو سامنے لے آتا ہے اور عقل و شعور کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے تو اسے کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کے اندر جو عقل و شعور کام کر رہا ہے اس کا تعلق اس طرزِ فکر سے ہے جس طرزِ فکر میں گہرائی نہیں ہے۔ حقیقت پسندی نہیں ہے۔ جس طرزِ فکر کو ثبات نہیں ہے۔ اب ہم اس بات کو اس طرح کہیں گے کہ ایک پیر و مرشد ہے۔ روحانی استاد ہے اور ایک شاگرد ہے۔ پیر و مرشد کو ہم مراد اور روحانی شاگرد کو ہم مرید کا نام دیتے ہیں۔

ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ بچہ وہی زبان بولتا ہے جو ماں باپ کی زبان ہے اور اس زبان کو سیکھنے کے لئے بچہ کے لئے کوئی درس وتدریس کا سلسلہ قائم کرنا نہیں پڑتا۔ بچہ جس طرح ماں باپ کو بولتے دیکھتا ہے وہی الفاظ اپنی زبان میں بولنا شروع کر دیتا ہے۔ عمر کی مناسبت سے لفظ ٹوٹے پھوٹے ہوتے ہیں لیکن بالآخر وہ اپنی مادری زبان اس طرح بولتا ہے کہ جیسے یہ ہمیشہ سے سیکھا سکھایا پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ والدین جس طرح خورد و نوش کا انتظام کرتے ہیں بچہ بھی اسی طرح کھانا کھاتا ہے جس طرح ماں باپ کھاتے ہیں اس کو یہ بتانا نہیں پڑتا کہ کھانا اس طرح کھایا جاتا ہے۔ والدین جس قسم کا لباس پہنتے ہیں بچہ بھی اسی قسم کا لباس زیب تن کرتا ہے۔ ماحول اگر پاکیزہ، صاف اور ستھرا ہے تو بچے کا ذہن بھی پاکیزہ اور صاف ستھرا رہتا ہے۔ والدین اگر گالیاں بکتے ہیں تو گھر میں بچے کے لئے گالی دینا کوئی خلاف معمول یا بری بات نہیں ہوتی۔ مختصراً یہ کہ بچے کے اوپر وہ تمام اثرات مرتّب ہوتے ہیں جو اس کے ماحول میں موجود ہیں۔ گھر کی چار دیواری اور والدین کی آغوش سے نکل کر جب بچہ گھر سے باہر کے ماحول میں قدم رکھتا ہے تو اس کے

اوپر تقریباً وہ تمام اثرات مرتّب ہوتے ہیں جو ماحول میں موجود ہیں۔ روحانی نقطہ نظر سے دنیا میں نیا آنے والا کوئی فرد ذہنی طور پر آدھا ماحول کے زیرِ اثر ہوتا ہے اور آدھا والدین کی ذہنی افتاد سے مطابق ہوتا ہے۔ اس غیر اختیاری تربیت کے بعد ایک دوسرا دَور شروع ہوتا ہے وہ یہ کہ والدین اپنے لختِ جگر کو کیا بنانا چاہتے ہیں؟ والدین اگر بچہ کے اندر خاندانی روایات اور خود نمائی کی عادات منتقل کر دیتے ہیں تو بچہ کے اندر خود نمائی کے اثرات غالب آجاتے ہیں۔ والدین اگر بچہ کو صحیح تربیت کے ساتھ ایسے علوم سکھاتے ہیں جن علوم میں اخلاقیات کا زیادہ دخل ہوتا ہے تو بچہ بااخلاق ہوتا ہے اور شعور کی منزل میں داخل ہو کر ایک ایسا پیکر بن جاتا ہے جو معاشرے کے لئے عزت و توقیر کا باعث ہوتا ہے۔ والدین کی طرزِ فکر اگر دولت پرستی ہے تو اَولاد کے اندر بھی دولت پرستی کے رجحانات زیادہ مستحکم ہو جاتے ہیں اس تقریر کا مفہوم یہ نکلا کہ تربیت کے دو طریقہ کار ہیں۔

اختیاری اور غیر اختیاری طرزِ فکر

سوال: اختیاری اور غیر اختیاری طرزِ فکر سے کیا مراد ہے؟ اور یہ کس طرح عمل میں آتی ہے؟

جواب: ایک غیر اختیاری اور ایک اختیاری۔ غیر اختیاری یہ کہ بچہ جو کچھ گھر کی چار دیواری اور اپنے ماحول میں دیکھتا ہے اسے قبول کر لیتا ہے۔ اختیاری صورت یہ ہے کہ والدین اسے ایک مخصوص تربیت کے ساتھ معاشرے میں روشناس کراتے ہیں اور جب یہ نابالغ فرد بالغ ہو جاتا ہے، اُس کی ایک شخصیت بن جاتی ہے اور وہ اپنی شخصیت کو سامنے رکھ کر والدین اور ماحول سے ملے ہوئے تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک کردار متعیّن کرتا ہے اور یہ کردار اس کا اپنا تشخّص بن جاتا ہے۔ ان الفاظ کو مختصر الفاظ میں یوں کہا جاتا ہے کہ کسی بندے کے کردار کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ اسے مخصوص طرزِ فکر حاصل کرنے کے لئے قربت حاصل ہو۔ جس طرح ایک عام فرد کے لئے ماحول والدین رشتہ دار اور تعلیمی درسگاہیں قربت کا ذریعہ بن کر اس کے کردار کی تشکیل کرتی ہیں اسی طرح روحانی آدمی کے کردار کی بھی تشکیل ہوتی ہے اور وہ اس طرح ہوتی ہے کہ اسے ایسے کسی بندے کی قربت حاصل ہو جائے جس کا کردار روحانی قدروں پر محیط ہے۔ پیر و مرشد یا مراد وہ شخصیت ہے جس کا کردار عوامُ النّاس سے اور ان لوگوں سے جو روحانی

حقیقتوں سے بے خبر ہیں ممتاز ہوتا ہے۔اس ممتاز شخصیت سے جس حد تک قربت ہوتی جاتی ہے اسی مناسبت سے مرید کے اندر روحانی اَوصاف منتقل ہوتے رہتے ہیں اور مراد کی طرزِ فکر کا ایک ایک جزو مرید کے دماغ کی اسکرین پر نقش ہو جاتا ہے۔یہی وہ طرزِ فکر ہے جس طرزِ فکر کا نام سلوک ہے۔یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر کوئی سالک اپنے اندر موجود روحانی قوتوں سے متعارف ہوتا ہے۔یہ وہ شخص ہے جس کے اوپر اس بات کا دار و مدار ہے کہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی ذات صفات سے کتنا متعارف ہے اور اسے پیغمبر علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی نسبت کس حد تک حاصل ہے۔

قرآن پاک میں بیان کردہ پیغمبروں کے واقعات پیغمبروں کی زندگی اور پیغمبروں کے مشن پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ پیغمبروں نے ایک مخصوص طرزِ فکر کا پرچار کیا ہے۔اس مخصوص طرز فکر میں بہت گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ پیغمبرانہ وصف میں یہ بات شامل ہے کہ ہر بندہ برائی اور اچھائی میں تمیز کر سکے یعنی پیغمبروں نے نوعِ انسانی کو اچھائی اور برائی کے تصوّر سے آشنا کیا ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ جہاں زندگی کے تقاضوں کا تعلق ہے تقاضوں کے اعتبار سے اللہ کی سب مخلوق یکساں حیثیت رکھتی ہے۔دوسری مخلوق کے سامنے اگر انسان کی ممتاز حیثیت ہے تو وہ یہ ہے کہ انسان اچھائی اور برائی کے تصوّر سے واقف ہے اسے اس بات کا علم دیا گیا ہے کہ:

1. زندہ رہنے کے لئے مخصوص طرزیں انسان کو اچھا بناتی ہیں...اور
2. زندہ رہنے کے لئے مخصوص طرزیں اچھائی سے دور کر دیتی ہیں۔

اچھائی کے تصوّر کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی انسان کا علم بن جاتی ہے کہ اچھا فرد وہ ہے جو اپنی اصل سے واقف ہو اور باخبر ہو۔اصل سے باخبری اسے ایک ایسے علم سے روشناس کراتی ہے کہ جو علم اسے اپنے اندر کام کرنے والی مخفی صلاحیتوں سے واقف کراتا ہے اور یہ مخفی صلاحیتیں دراصل روحانی قدریں ہیں۔جو بندہ جس مناسبت سے روحانی قدروں سے واقف ہے اتنا ہی وہ کردار کے اعتبار سے مصفّٰی اور پاکیزہ ہے اور جو آدمی روحانی قدروں سے جس

حد تک ناواقف ہے اسی مناسبت سے اس کا کردار غیر مصفّیٰ اور دُھندلا ہے۔ایک بکری اور انسان کی زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایک ہی بات کہنے پر آدمی مجبور ہے کہ بکری اور انسان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔انسان کو بکری سے ممتاز کرنے والی صلاحیّت یہ ہے کہ انسان اپنے اندر روحانی قدروں سے واقف ہو جاتا ہے اور اگر کوئی انسان اپنے اندر روحانی قدروں سے ناواقف ہے یا اسے اپنی ذات کا عرفان حاصل نہیں ہے تو وہ ہرگز بکری یا کسی دوسرے جانور سے ممتاز نہیں ہے۔روحانی قدروں سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اسے اپنے ایسے باپ کی آغوش میسر ہو جس کے اندر روحانی قدروں کا دریا موجزن ہو اور اسے ایسا ماحول میسر ہو۔جس ماحول میں پاکیزگی موجود ہو۔باپ سے مراد پیر و مرشد ہے اور ماحول سے مراد یہ ہے کہ اس پیر و مرشد کی ایسی اولاد جو اس سے روحانی رشتہ میں وابستہ ہے۔زمین پر ہونے والے بچہ کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ بچے کا شعور والدین کی گود، گھر کی چار دیواری اور ماحول سے بنتا ہے۔ماحول میں اگر کثافت ہے تعفن ہے، گھٹن ہے، گندگی ہے، بے سکونی ہے، اضطراب ہے تو بچہ بھی ذہنی طور پر ذہنی سکون سے ناآشنا ہوتا ہے۔اس کے برعکس اگر گھر میں سکون ہے، آرام ہے، والدین کی آواز میں شیرینی اور مٹھاس ہے لہجے میں پیار ہے اور دماغی اعتبار سے وہ پرسکون ہیں، اس کا ماحول بھی پرسکون ہے، بچہ بالکل غیر اختیاری طور پر سکون کا حامل ہوتا ہے۔

یہ بات ہمارے مشاہدے میں ہے کہ چیخ کر بولنے والے ماں باپ کے بچے بھی چیخ کر بولتے ہیں۔غصے اور نفرت سے بولنے والے والدین کے بچوں کے اندر بھی غصہ اور نفرت پیدا ہو جاتے ہیں۔ندیدے اور لالچی والدین کے بچے بھی ندیدے اور لالچی ہوتے ہیں۔کبر و نخوت کے دلدادہ والدین کے بچوں کے اندر بھی کبر و نخوت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ضدی اور سرکش والدین کے بچے بھی ضدی اور سرکش ہوتے ہیں اس کے برعکس حلیم الطبع ماں باپ کی اولاد حلیم الطبع ہوتی ہے۔

پیغمبروں کی زندگی کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخصوص کردار کے لوگوں کا ایک سلسلہ قائم کیا ہے اور جو لوگ اس سلسلے سے وابستہ ہو جاتے ہیں اور ان کی وابستگی قربت کا درجہ حاصل

کر لیتی ہے تو ان کے اندر وہی قدریں منتقل ہو جاتی ہیں۔ جو اس مخصوص کردار کے مقدّس لوگوں کا حصّہ ہیں۔ راہِ سلوک پر چلنے کے لئے کسی سالک کو کسی شخص کا ہاتھ پکڑنا اس لئے ضروری ہے کہ اسے ایک روحانی باپ کی شفقت میسر آئے اور اس روحانی باپ کی اولاد کا ایک ماحول میسر آجائے تاکہ اس ماحول میں رہ کر اس کی ذہنی تربیت ہو سکے۔

ذہنی تربیت کا تجزیہ کیا جائے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تربیت کے مختلف پہلو ہیں اور تربیت کا یہ ہر مختلف پہلو انسانی زندگی میں ایک مستقل کردار ادا کرتا ہے۔ جس ماحول اور جس گھوارے میں ہم لوگ رہتے ہیں اس ماحول کے مطابق کم یا زیادہ ذہن کا متاثر ہونا ضروری ہے۔ مثلاً ایک آدمی ایسے ماحول میں رہتا ہے جس ماحول کے رہنے والے لوگ سب کے سب نمازی ہیں اور ان کی زندگی میں دین کا عمل دخل پوری طرح موجود ہے۔ اس ماحول سے متاثر ہو کر ہم بھی انہی قدروں کو اپنا لیتے ہیں جو قدریں ماحول میں رائج ہیں۔ ایک آدمی طبعی طور پر کتنا ہی خشک کیوں نہ ہو جب وہ ایسے ماحول میں چلا جاتا ہے۔ جہاں رنگ و روشنی کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور گانوں کے اونچے نیچے سُروں سے فضا معمور ہوتی ہے تو بالآخر وہ بندہ گانے بجانے میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور گانے بجانے کے قواعد و ضوابط سے بھی اسے آگاہی ہو جاتی ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ابھی ہم بتا چکے ہیں کہ اگر ایک بچے کی ایسے ماحول میں پرورش کی جائے جس ماحول میں گالی دینا معیوب بات نہ ہو تو بچہ اختیاری اور غیر اختیاری طور پر گالیاں بکتا رہتا ہے۔ اس کی تربیت اگر ایسے ماحول میں کی جائے جس ماحول میں ظلم سختی اور درندگی ہو تو بچہ کا ذہن بھی سختی اور درندگی کی طرف ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں پرورش کی جائے جس ماحول میں خود غرضی کے علاوہ اور کوئی بات موجود نہ ہو ہر کام اس لئے کیا جاتا ہو کہ اس کے ساتھ کوئی غرض وابستہ ہو۔ ذہنی طور پر ماحول میں سارے بندے کاروباری ذہن رکھتے ہوں تو بچہ بھی کاروباری ذہن پر اٹھتا ہے۔ ماحول میں سخاوت کی بجائے بخیلی اور کنجوسی ہو تو بچوں کا دل بھی کھلا ہوا نہیں ہوتا۔ ان روز مرّہ مشاہدات کے پیش نظر یہ بات مُسلّمہ امر بن گئی کہ دنیا میں جتنے گروہ آباد ہیں ان کا تعلق اپنی اپنی طرزِ فکر سے ہے اور اس طرزِ فکر کی بنیاد پر ہی کسی گروہ کا کسی ذات کا کسی برادری کا کسی کردار کا کسی تشخّص کا تعیّن کیا جاتا ہے۔ ہمارے سامنے پیغمبروں کا بھی کردار ہے۔

بخیلی اور سخاوت

سوال: بخیلی اور کنجوسی کا باوا آدم قارون کو کہا جاتا ہے۔ جب کہ سخاوت اچھائی کے لئے حاتم طائی سے کیوں تشبیہ دی جاتی ہے؟

جواب: دنیا کی تاریخ میں ان لوگوں کا کردار بھی ثابت ہے جن لوگوں نے پیغمبروں کی مخالفت کی اور پیغمبروں کو قتل کیا۔ تاریخ کے صفحات میں ایسے لوگوں کا کردار بھی موجود ہے جس کردار میں سخاوت عام ہے اور ایسے کردار بھی موجود ہیں جس کردار میں کنجوسی اور بخیلی اپنی معراج کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس بات کو مزید تشریح کے ساتھ اس طرح کہا جائے گا کہ کنجوسی اور بخیلی کے کردار کا باوا آدم قارون ہے۔ جب تک دنیا قائم رہے گی قارون کی ذُرّیت قارون کی اولاد اور قارون کے کردار سے متاثر لوگ موجود رہیں گے۔

سخات کے بیان میں حاتم طائی کا نام لیا جاتا ہے۔ جب تک دنیا موجود ہے حاتم طائی کے کردار کے لوگ یا حاتم طائی کے گروہ کے لوگ بھی موجود رہیں گے۔ دنیا میں پیغمبروں کا کردار بھی موجود ہے۔ پیغمبروں کے کردار کو جب ہم خوردبین نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں وہاں اچھائی کے علاوہ کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی۔ یعنی وہ ایسے کردار سے مُتصِف ہیں کہ جس کردار میں لطافت حلاوت کے علاوہ کوئی دوسری چیز شامل نہیں ہو سکتی۔ کردار کے تعیّن کو اگر مختصر کر کے (Short form) میں بیان کیا جائے تو طرزِ زندگی کی دو قدریں قائم ہوتی ہیں۔ اک طرز وہ ہے جس میں آدمی شیطنیت سے قریب ہو کر شیطان بن جاتا ہے اور دوسری انبیاء کی طرز وہ ہے جس طرز کے اندر داخل ہو کر آدمی سراپا رحمت بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بادشاہی میں شریک ہو جاتا ہے۔ وہ تمام طرزیں جو بندے کو اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہیں شیطانی طرزیں ہیں اور وہ تمام طرزیں جو بندے کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرتی ہیں پیغمبرانہ طرزیں ہیں۔ پیغمبرانہ طرزوں اور شیطانی طرزوں کا تجزیہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جو بندہ رحمانی طرزوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر پیغمبروں کے اَوصاف منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کہنا بے جانہ ہو گا کہ پیغمبروں کے اَوصاف اللہ تعالیٰ

کے اَوصاف ہیں یعنی جب کوئی بندہ پیغمبرانہ زندگی میں سفر کرتا ہے تو دراصل وہ ان صفات میں سفر کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اپنی ذاتی صفات ہیں اور جب کوئی بندہ ان پیغمبرانہ صفات سے منہ موڑ لیتا ہے تو وہ ان طرزوں میں اور صفات میں زندگی گزارتا ہے جو دراصل تاریک کثیف جہالت سے معمور شیطانی طرزیں ہیں۔ شیطانی طرز یہ ہے کہ آدمی کے اوپر خوف و ہراس مسلّط رہتا ہے۔ ایسا خوف و ہراس جو زندگی کے ہر مقام کو ناقابل شکست و ریخت زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہے۔ اس کا دن ہو یا رات وہ ایک خوف میں بسر ہوتا ہے کبھی اسے زندگی ضائع ہونے کا خوف ہوتا ہے کبھی وہ معاشی ضروریات کے پورا نہ ہونے کے خوف میں مبتلا ہے، کبھی اس پر بیماریاں حملہ آور ہوتی ہیں، کبھی وہ مسائل کے انبار میں اس طرح دب جاتا ہے کہ اسے اس انبار سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ موت جس کو ہر حال آنا ہے اس کے اوپر خوفناک شئے بن کر مسلّط ہو جاتی ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ موت سے کسی بھی طرح رستگاری حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود اس اٹل حقیقت سے گھبراتا رہتا ہے، بھاگتا رہتا ہے۔

شیطانی طرزوں میں ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ آدمی ذہنی اور نظری طور پر اندھا ہوتا ہے وہ چند سو گز سے زیادہ کی چیز نہیں دیکھ سکتا۔ اور یہی چیزیں اس کو دردناک عذاب میں مبتلا رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس پیغمبرانہ طرزوں میں آدمی کے اوپر خوف اور غم مسلّط نہیں ہوتا وہ عدم تحفّظ کے احساس سے دور رہتا ہے۔ موت چونکہ ایک اٹل حقیقت ہے اس لئے وہ مرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور جب وہ مرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے تو موت اس کے لئے دنیا کی سب سے زیادہ خوشنما چیز بن جاتی ہے۔ اسے اس بات کا سراغ مل جاتا ہے کہ موت کوئی بھیانک شئے نہیں ہے بلکہ موت ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونے کا نام ہے۔ جس طرح اس رنگ و بو کی دنیا میں وہ زندگی کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد کے عالم میں وہ کھاتا پیتا ہے، جاگتا ہے، سوتا ہے۔ روحانی اور جسمانی تمام ضروریات پورا کرتا ہے اور یہ بات محض اس کے قیاس میں داخل نہیں ہوتی بلکہ وہ اس شگفتہ زندگی کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ بات وہی ہے کہ ایک طرزِ فکر کے آدمی دوسری طرزِ فکر کے آدمیوں سے ممتاز رہتے ہیں۔

شیطانی طرزِ فکر میں زندگی گزارنے والا بندہ انبیاء کے گروہ میں داخل نہیں ہو سکتا اور انبیاء کی طرزِ فکر سے آشنا بندہ شیطانی گروہ میں کبھی داخل نہیں ہوتا۔ شیطانی طرزِ فکر میں ایک بڑی خراب اور لایعنی بات یہ ہے کہ بندہ ہر عمل اس لئے کرتا ہے کہ اس عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ یعنی وہ عمل کرنے کا صلہ چاہتا ہے اور اس صلے کا نام اس نے ثواب رکھا ہے۔ تصوّف ایسے عمل کو جس عمل کے پیچھے کاروبار ہو جس عمل کے پیچھے کوئی ذاتی غرض وابستہ ہو ناقص قرار دیتا ہے اور یہی انبیاء کی بھی طرزِ فکر ہے۔ جہاں تک قرآن پاک میں اس بات کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے لوگوں کے اعمال کی جزا کے سلسلے میں اپنے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے لیکن اس بات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ نیک عمل اس لئے کرے کہ اسے اس کا اجر ملے گا اور اسے اس اجر میں زر و جواہرات کے محلّات ملیں گے۔

زندگی کی بنیاد

سوال: زندگی کی بنیاد کس طرزِ فکر پر قائم ہے؟

جواب: اب تک کے اسباق میں اس بات کی پوری طرح کوشش کی گئی ہے کہ تصوّف یا روحانیت کی راہوں میں چلنے والے مُبتدی کے ذہن میں یہ بات واضح ہو جائے کہ زندگی کی بنیاد یا بساط ایک طرزِ فکر کے اوپر قائم ہے۔

اگر وہ طرزِ فکر ایسی ہے جو بندے کو اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہے تو اس کا نام شیطنیت ہے...اور

وہ طرزِ فکر جو اللہ تعالیٰ سے بندے کو قریب کرتی ہے اس کا نام رحمت ہے

یعنی اس کائنات میں دو گروہ ہیں۔

جن میں ایک گروہ انعام یافتہ ہے...اور

دوسرا گروہ باغی اور ناشکرا ہے۔

قرآن پاک کی تمام تعلیمات کا اگر خلاصہ بیان کیا جائے تو مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں دو طرزیں کام کر رہی ہیں۔

ایک وہ طرز ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے پسندیدہ ہے...اور

دوسری طرز وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ناپسندیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ طرزوں میں زندگی گزارنے والے دوست اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے بہرہ ور ہیں۔ اور اس طرزِ فکر سے جس کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا ہے آشنا لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے باغی ہیں، سرکش ہیں اور جن کی صفات میں شیطنیت بھری ہوئی ہے وہ نعمتوں سے معمور خزانوں کے مالک ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو شیطانی طرزوں سے دور ہیں نعمتوں سے محروم ہیں۔ یہ ان نعمتوں کا تذکرہ ہے جس کو ہم دنیاوی زندگی میں آسائش کہتے ہیں۔

دوسری بات جو بالکل سامنے کی ہے یہ ہے کہ زندگی کی آسائش سے متعلق وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ طرزوں میں زندگی گزارتے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ طرزِ فکر سے ہم رشتہ ہیں۔ دونوں مشترک ہیں مطلب یہ ہے کہ ذُریّتِ شیطان بھی کھانا کھاتی ہے وہ بھی لباس پہنتی ہے اس کے لئے بھی اچھے سے اچھا گھر موجود ہے اور جو لوگ ذُریّتِ ابلیس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، وہ بھی کھانا کھاتے ہیں، گھر میں رہتے ہیں، لباس پہنتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان کی ضروریات بھی پوری کرتا ہے اور جواہرات کے انبار سے ضروریات پورے ہونے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ایک آدمی کے پاس اگر ایک کروڑ روپیہ ہے تو وہ دو ہی روٹی کھائے گا، دوسرے آدمی کے پاس اگر محل موجود ہے اور اس محل میں ۵۰ کمرے ہیں تو سونے کے لئے اسے ایک چارپائی کی جگہ کی ضرورت پیش آتی ہے، ایسا کبھی

نہیں ہوا نہ ہو گا کہ پچاس کمروں کا مالک کوئی بندہ جب سونے کے لئے لیٹے تو اس کا جسم اتنا دراز اور اتنا پھیل جائے کہ وہ دس چار پائیوں کی جگہ گھیر لے۔ سونے کے لئے اسے ایک ہی چار پائی کی ضرورت پیش آتی ہے۔

علیٰ ہذا القیاس یہی حال پوری زندگی کے اعمال و حرکات کا ہے۔ اس مختصر تشریح سے یہ ثابت ہوا کہ دنیاوی طرزِ فکر میں ذُریّتِ ابلیس اور اس کے خلاف دوسرے لوگ مادّی زندگی کے وسائل میں مشترک قدریں رکھتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ انعام کیا ہے کہ جس انعام کے مستحق وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ طرزوں میں زندگی گزارتے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے انعام یافتہ کہا ہے اور جن بندوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ ہمارے دوست ہیں دوستوں کی تعریف یہ بیان فرماتے ہیں کہ جو بندہ ہمارا دوست بن جاتا ہے ہم اس کے اوپر سے خوف اور غم اٹھا لیتے ہیں۔

خوف اور غم جس آدمی کی زندگی سے نکل جاتا ہے تو خوشی اور سرور کے علاوہ کچھ نہیں رہتا۔ یہ وہ انعام ہے جو ہمیں ظاہرہ آنکھ سے نظر نہیں آتا۔ یہ وہی انعام ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ ہماری ناپسندیدہ طرزوں میں زندگی گزارتے ہیں ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ہم نے ان کے کانوں پر مہر لگی ہوئی ہے اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، وہ اس دنیا میں سوچتا بھی ہے، سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے۔ مطلب یہ ہُوا کہ مہر اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دنیاوی طور پر اندھا ہو گیا ہے یا اس کی عقل سلب ہو گئی ہے یا اس کے کانوں میں سیسہ ڈال دیا گیا ہے۔ جن صفات سے آدمی اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتا ہے اس کی سماعت میں سے وہ صفَت نکال لی گئی ہے جس کے ذریعے سے غیب کی آوازیں سنتا ہے۔ فرشتوں سے ہمکلام ہوتا ہے اس کی ان آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے جن آنکھوں سے وہ غیب کی دنیا دیکھ سکتا ہے۔ اگر ان آنکھوں پر پردہ نہ پڑا ہوا ہو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے دربار اقدس میں حاضر ہو کر کھلی آنکھوں سے حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ اِس آیت مبارکہ کی تفسیر میں اگر تفکر کیا جائے تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کے قلب میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کر سکیں۔ ان کے اندر اتنی سکت نہیں ہے کہ فرشتوں کی آواز سن سکیں۔ ان کی آنکھوں میں اتنی چمک نہیں ہے کہ وہ حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا دیدار کر سکیں۔ وہ سب لوگ ذُریّتِ ابلیس میں آتے ہیں۔

بات بہت زیادہ سخت ہے لیکن امرِ واقعہ یہی ہے کہ ارکان اسلام کی ماہیت اور حقیقت میں اگر تفکر کیا جائے تو ہر رکن اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اس کا تعلق روحانی طرزوں اور روحانی صفات اور روحانی صلاحیتوں سے ہے۔اسلام میں بنیادی رکن حضور ﷺ پر ایمان لانا ہے۔ایمان لانے کے بعد حضور ﷺ کی رسالت کی شہادت دینا ہے لیکن دنیا کا کوئی قانون اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ بغیر دیکھے شہادت معتبر ہو سکتی ہے۔

کلمۂ شہادت ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اگر انسان شیطنیت سے آزاد ہو کر فی الواقع ایمان کے دائرے میں قدم رکھ دیتا ہے تو سیدنا حضور ﷺ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔اور وہ برملا حضور ﷺ کی رسالت کی شہادت دیتا ہے۔ قانون شہادت یہ ہے کہ شہادت بغیر دیکھے معتبر نہیں ہوتی۔ مسلمان ہونے کے بعد جن باتوں پر یقین ضروری ہے، جو ایمان کی شرائط میں داخل ہیں ان میں پہلی بات غیب پر یقین ہے کہ ہم غیب پر یقین رکھتے ہیں۔ قانون یہ ہے کہ جب تک کوئی بات مشاہدے میں نہیں آتی۔یقین متزلزل رہتا ہے اس کے بعد ملائکہ کا تذکرہ آتا ہے پھر ان کتابوں کا تذکرہ آتا ہے جو حضور ﷺ سے پہلے انبیاء پر نازل ہوئیں پھر یوم آخرت کا تذکرہ آتا ہے۔ یہ تمام تذکرے اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ انسان کے اندر کوئی ایسی آنکھ موجود ہے جو ظاہر پردوں کے پیچھے دیکھتی ہے انسان کے اندر ایسے کان موجود ہیں جو ماورائی آوازیں سن کر ان کے معانی اور مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ایسی آنکھیں موجود ہیں جو آنکھیں زمان و مکان کی تمام حد بندیوں کو توڑ کر عرش پر اللہ تعالیٰ کا دیدار کرتی ہیں۔ایسا قلب موجود ہے جو محسوس کرتا ہے، قلب اللہ کا گھر ہے اور اس گھر میں مکین کو دیکھتا ہے۔روحانیت یا تصوّف سالکان طریقت کو اسی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ آدمی ظاہرہ حواس سے ہٹ کر ان حواس کا کھوج لگائے جن حواس میں لطافت ہے، نرمی ہے، رحمت ہے، محبت ہے، حلاوت ہے، نور ہے، روشنی ہے، جن حواس سے بندہ اپنے آقا رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں سرنگوں ہوتا ہے۔ جہاں تک دنیاوی زندگی گزارنے کے لئے مفروضہ حواس کا تعلق ہے۔ان حواس میں آدم اور بکری اور کتا برابر کے شریک ہیں۔

ہم اس بات کو پچھلے اسباق میں بیان کر چکے ہیں اور اب پھر اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ ذہن نشین ہو جائے
۔

جہاں تک عقل و شعور کا تعلق ہے کتا بھی عقل رکھتا ہے، آدمی بھی عقل رکھتا ہے۔ بعض حالات میں کتا انسان سے زیادہ عقل مند ہے۔ دوسری بات جو زیر بحث آتی ہے وہ ساخت کی ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس ساخت پر تخلیق کیا ہے وہ ساخت اس قسم کی ہے کہ اس ساخت کی وجہ سے وہ عقل سے زیادہ کام لے سکتا ہے۔ اگر بلی کی ساخت انسانوں کی طرح ہوتی اور جس طرح انسان دو پیروں پر چلتا ہے اسی طرح بلی بھی دو پیروں پر چلتی تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بلی کار ڈرائیو نہ کر سکتی۔ دنیاوی عقل کا تعلق جہاں تک ہے اللہ کی سب مخلوق عقل رکھتی ہے جہاں تک عقل میں کمی بیشی کا تعلق ہے وہاں ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ آدمی بھی سب عقل مند نہیں ہوتے۔ ہزاروں لاکھوں میں چند دانشور نکلتے ہیں اور اس دانشوری کے اندر غوطہ لگا کر جب کوئی گوہر نایاب تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ذہن میں بے عقلی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

انسان روزانہ ترقی کے نعرے لگاتا ہے۔ روزانہ ایجادات کے لئے نئے فارمولے زیر بحث آتے ہیں، کچھ دن ان فارمولوں کا چرچا رہتا ہے پھر خود ہی ان فارمولوں کی نفی ہو جاتی ہے۔ آج کا دانشور جو کہتا ہے آنے والی کل کا دانش ور اسی بات کی نفی کر دیتا ہے جب کہ عقل سلیم یہ بات جانتی ہے کہ حقیقت میں تغیّر و تبدل اور تعطّل واقع نہیں ہوتا۔ حقیقت اپنی جگہ اٹل رہتی ہے۔ اربوں کھربوں سال سے چاند چاند ہے، سورج سورج ہے، زمین زمین ہے، اربوں کھربوں سال سے چاند کی گردش کے جو فارمولے قدرت نے مُتعیّن کر دیئے ہیں ان میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ سورج کے اندر روشنی پیدا کرنے کے جو فارمولے قدرت نے بنا دیئے ہیں ان میں کبھی تغیّر و تبدل واقع نہیں ہو گا۔

اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس بات میں تغیّر و تبدل تعطّل واقع ہو سکتا ہے وہ حقیقی نہیں ہے اس کی بنیاد فکشن اور مفروضہ حواس پر ہے۔ تصوّف اور روحانیت مفروضہ اور فکشن حواس کی نفی کر کے آدمی کو حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

حقیقت مُطلقہ کیا ہے؟

سوال: قناعت اور اِستغناء سے کیا مراد ہے؟

جواب: قناعت اور اِستغناء کوئی لفظی معمہ نہیں ہے۔ یا کوئی حساب کا ہیر پھیر نہیں ہے۔ اِستغناء فی العمل ایک کیفیت ہے، ایک واردات ہے، ایک حقیقت ہے۔ ایسی حقیقت جو حقیقتِ مُطلَق کے متّصِل ہے۔ جب تک کوئی بندہ حقیقت مُطلَقہ سے متعارف نہیں ہوتا، مشاہدہ نہیں کر لیتا اس وقت تک اس کے اندر اِستغناء پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو وہ اتنا ہوتا ہے کہ محض اس کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ جس آدمی کے اندر جس مناسبت سے قناعت اور اِستغناء موجود ہے اس آدمی کے اندر اسی مناسبت سے ڈر، خوف اور غم بھی کم ہوتا ہے۔

صاحبِ مراقبہ جب پہلی سیڑھی سے قدم بڑھا کر دوسری سیڑھی پر قدم رکھتا ہے تو اس کے سامنے اس کا اصلی جسم جسمِ مثالی یا Aura آجاتا ہے پہلی بات جو سالک کے ذہن میں وارد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ مٹی کے ذرّات سے بنے ہوئے گوشت پوست کی حیثیت محض عارضی، فانی اور مفروضہ ہے۔ حقیقی حیثیت روشنیوں کا وہ جسم ہے جس جسم نے گوشت پوست کے جسم کو سنبھالا ہوا ہے۔ اس وقت کیونکہ تخلیقی فارمولوں کے تحت وہ قانون بیان ہو رہا ہے جس قانون کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کرنے کی اجازت ہے، اس لئے یہاں روح اور جسمِ مثالی کا فرق بیان کرنا ضروری ہے۔ مرنے کی حالت کو عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ روح نکل گئی۔ مرنے کے بعد جس عالم میں آدمی منتقل ہوتا ہے اسکے بارے یہ کہا جاتا ہے کہ مرنے والا اپنے دوستوں اور عزیزوں کی روحوں کے عالمِ اَعراف میں چلا گیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اَعراف میں آدمی کھانا بھی کھاتا ہے، آدمی پانی بھی پیتا ہے، سوتا جاگتا بھی ہے، وہاں اپنے رشتہ داروں سے ملتا بھی ہے، دکھ درد سکون راحت اور اطمینان آشنا بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مرنے والے آدمی کی روح نکل گئی ہے تو روح نکلنے سے مراد یہ ہوگی کہ اب آدمی نہ سن سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم جس کو مرنا کہتے ہیں دراصل وہ ایسی حالت ہے جس کو ہم روشنی کے ہالے کا

مٹی کے جسم سے رشتہ منقطع کر لینے کا نام دے سکتے ہیں۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ صاحب نے کتاب ''لوح و قلم'' میں اس بات کو بالوضاحت بیان کیا ہے فرماتے ہیں:

آدمی گرم و سرد سے محفوظ رہنے کے لئے اور اعضائے جسمانی کو تپش اور سرد لہروں سے بچانے کے لئے ایک لباس اختراع کرتا ہے، یہ لباس سوتی کپڑے کا ہوتا ہے، اونی کپڑے کا ہوتا ہے یا کسی بھی قسم کے بنے ہوئے دھاگوں کے تانے بانے سے مرکب یا بُنا ہوا ہوتا ہے۔ جب تک یہ خود تخلیق کردہ لباس جسم کے اوپر محفوظ ہے، اُس وقت تک اِس لباس میں حرکت رہتی ہے جسم کے اوپر قمیض کی حرکت جسم کی حرکت کے تابع ہوتی ہے اگر قمیض جسم کے اوپر ہے تو آستین ہاتھ کی حرکت کے ساتھ ہلنے پر مجبور ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ہاتھ ہلے اور آستین نہ ہلے۔ اس طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ پہنی ہوئی قمیض کی صرف آستین ہلے تو اس کے ساتھ ہاتھ بھی حرکت کرے۔ ہمیشہ ہاتھ کی حرکت کے ساتھ قمیض کی آستین میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اگر جسم پر پہنی ہوئی اسی قمیض کو اتار کر زمین پر یا چارپائی پر ڈال دیا جائے اور اس قمیض سے کہا جائے کہ وہ حرکت کرے، چلے پھرے تو اس کے اندر ہرگز کوئی حرکت پیدا نہیں ہو گی۔ بابا صاحب قبلہ گوشت پوست کے جسم کو جسمِ مثالی کا لباس قرار دیتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ کپڑے کی بنی ہوئی قمیض جسم کے اوپر ہوتی ہے اور جسمِ مثالی گوشت پوست کے اوپر ہوتا ہے۔ لباس اور گوشت پوست کے جسم کی حیثیت قائم کر کے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک مرے ہوئے آدمی کا جسم یا لاش جب زمین پر پڑی ہوئی ہوتی ہے تو قمیض کی طرح اس کے اندر اپنی کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ آپ لاکھ کوشش کریں کہ یہ لاش اپنی مرضی اور اپنے اختیارات سے حرکت کرے یہ تمام کوشش بے کار اور بے سود ثابت ہوں گی۔ اس لئے بے سود ثابت ہوتی ہیں کہ جس جسم کا یہ لباس تھا اُس جسم نے اِسے اتار پھینکا ہے۔

عام حالات میں جب اِستغناء کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کس آدمی کو اللہ تعالیٰ کے اوپر کتنا توکل اور بھروسہ ہے۔ توکل اور بھروسہ کم و بیش ہر آدمی کی زندگی میں داخل ہے لیکن جب ہم توکل اور بھروسہ کی

تعریف بیان کرتے ہیں تو ہمیں بجز اس کے کچھ نظر نہیں آتا کہ ہماری دوسری عبادات کی طرح بھروسہ اور توکل بھی دراصل لفظوں کا ایک خوش نما جال ہے۔

توکل اور بھروسہ سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے لیکن جب ہم فی العمل زندگی کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ بات محض نعرہ اور غیر یقینی ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ ہر آدمی کی زندگی میں اس کا عمل دخل جاری و ساری ہے۔ مثلاً ایک آدمی کسی فرم میں ملازمت کرتا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ بات رہتی ہے کہ فرم کا مالک یا سیٹھ ساہوکار اگر مجھ سے ناراض ہو گیا تو ملازمت سے برخواست کر دیا جاؤں گا، یا میری ترقی نہیں ہو گی، یا ترقی تنزلی میں بدل جائے گی۔ ظاہر ہے یہ بات بھروسہ اور توکل کے سراسر خلاف ہے۔ اس کے برعکس ہم زندگی میں یہ بات بار بار دہراتے ہیں کہ اگر کوئی کام نہیں کریں گے تو کھائیں گے کہاں سے؟

یہ بات بھی ہمارے سامنے ہے کہ جب کسی کام کا نتیجہ اچھا مرتّب ہوتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ نتیجہ ہماری عقل اور ہماری فراست و فہم سے مرتّب ہوا ہے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کے اوپر توکل اور بھروسہ محض مفروضہ ہے۔ جس بندے کے اندر توکل اور بھروسہ پیدا نہیں ہوتا، اس کے اندر اِستغناء بھی نہیں ہوتا۔

اِستغناء سے مراد یہ ہے کہ ضروریات زندگی گزارنے میں بندے کا اپنا ذاتی اختیار شامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اگر مرغی کھلاتے ہیں اس میں خوش رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اگر چٹنی سے روٹی دیتے ہیں اس میں بھی خوش رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کھدّر کے کپڑے پہناتا ہے بندہ اس میں بھی خوش رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے ہر عمل اور حرکت کو اللہ کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ پہلے بندے کے اندر توکل اور بھروسہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ استغنا کے دائرے میں قدم بڑھاتا ہے۔ توکل اور بھروسہ دراصل ایک خاص تعلق ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان براہِ راست قائم ہے اور جس بندے کا اللہ کے ساتھ یہ رابطہ قائم ہو جاتا ہے اس بندے کے اندر سے دنیا کا تمام لالچ نکل جاتا ہے۔

ایسا بندہ دوسرے تمام بندوں کی امداد اور تعاون سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس بندے کی حیثیت ایسی ہو جاتی ہے کہ جس حیثیت کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص کی ۵ آیتوں میں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص میں پانچ حتمی باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص میں اپنی ذات پر سے پردہ اٹھادیا ہے اور یہ بھی بتادیا ہے کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کے اندر موجود ہیں یا جو صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ صفات مخلوق کے اندر موجود نہیں ہیں۔ سورۂ اخلاص کی پانچ آیتیں ہمیں خالق اور مخلوق کا امتیاز سکھاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اے پیغمبر ﷺ! آپ فرمادیجئے اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ کسی سے احتیاج نہیں رکھتا۔ اللہ نہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ اللہ کسی کا باپ ہے۔ اللہ تعالیٰ کوئی خاندان بھی نہیں رکھتا۔''

ان صفات کی روشنی میں جب ہم مخلوق کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ:

1. مخلوق کبھی ایک نہیں ہوتی۔ مخلوق ہمیشہ بکثرت ہوتی ہے۔
2. مخلوق زندگی کے اعمال و حرکات پورے کرنے پر کسی احتیاج کی پابند ہے۔
3. یہ بھی ضروری ہے کہ مخلوق کسی کی اولاد ہو، اور
4. یہ بھی ضروری ہے کہ مخلوق کی کوئی اولاد ہو۔
5. مخلوق کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا کوئی خاندان ہو۔

اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ ان پانچ صفات میں جب لاشعوری تفکر سے کام لیا جاتا ہے تو ہمیں ایک بات ایسی ملتی ہے کہ ہم ان صفات کو جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں ان میں سے ایک صفت اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اوپر وارد کر سکتے ہیں۔

مخلوق کے لئے یہ ہر گز ممکن نہیں ہے کہ وہ کثرت سے بے نیاز ہو۔ مخلوق اس بات پر بھی مجبور ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ اسی طرح مخلوق کا خاندان ہونا بھی ضروری ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ پانچ صفات میں سے چار صفات ہیں۔ مخلوق اپنا اختیار استعمال کرنے کے لئے بے بس اور مجبور ہے۔ صرف ایک ایجنسی ایسی ہے کہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی صفَت کو اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اوپر وارد کر سکتی ہے اور وہ ہے، اللہ احتیاج سے ماوراء ہے۔ مخلوق کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دنیاوی تمام مسائل سے اپنی ضروریات اور احتیاج کو توڑ کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق وابستہ کر لے۔ یہ وابستگی توکل اور بھروسہ ہے۔ اگر بندے کے اندر مخلوق کے ساتھ احتیاجی عوامل کام کر رہے ہیں تو وہ توکل اور بھروسہ کے اعمال سے دُور ہے۔ راہِ سلوک کے مسافر کو سب سے پہلے اس بات کی مشق کرائی جاتی ہے کہ زندگی کے تمام تقاضے اور زندگی کی تمام حرکات و سکنات پیر و مرشد کے تابع ہیں۔ زندگی کی حرکات و سکنات جب سالک پیر و مرشد کے سپرد کر دیتا ہے تو وہ اس کی تمام ضروریات کا کفیل بن جاتا ہے۔ بالکل اس طرح جس طرح ایک دودھ پیتے بچے کے کفیل اس کے والدین ہوتے ہیں۔ ان بچوں کی کفالت زیر بحث آتی ہے جنہوں نے ابھی تک شعور کے دائرے میں قدم نہیں رکھا ہے۔ جب تک بچہ شعور کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا والدین چوبیس گھنٹے اس کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔

یقین کے کیا عوامل ہیں؟

سوال: یقین کے پیٹرن میں کس طرح ردّوبدل کیا جاسکتا ہے؟

جواب: لاتعداد اور ماورائی واقعات میں سے چند مزید واقعات کا دہرا دینا اس لئے ضروری ہے کہ راہِ سلوک کے مسافروں کے سامنے وہ تمام مراحل آجائیں جن مراحل سے گزر کر کوئی سالک اِستغناء کے دائرے میں قدم رکھتا ہے اور اس کے ذہن میں اِستغناء اور بے نیازی کا ایسا پیٹرن تربیت پاجاتا ہے جس کی بنیاد پر سالک غیر اختیاری طور پر بھی

اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ابھی ہم نے یہ بتایا ہے کہ یقین پیدا ہونے کیلئے ضروری ہے کہ آدمی کو یقین کے عوامل سے اس طرح ردّ و بدل کر دیا جائے کہ یقین اس کی زندگی کا احاطہ کر لے۔ ایسا احاطہ کہ شعوری اختیار سے جاننے کے باوجود وہ اُس احاطہ یا اُس دائرے سے قدم باہر نہ نکال سکے۔

یقین کی تعریف میں ہم پچھلے اسباق میں بالوضاحت بتا چکے ہیں کہ پیدائش سے موت تک اور موت کے بعد کی زندگی میں اَعراف، حشر و نشر، حساب و کتاب، جنّت و دوزخ اور اللہ تعالیٰ کی تجلی کا دیدار سب کا سب یقین کے اوپر قائم ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ آدمی کو سب سے پہلے اس بات کا یقین پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ وہ موجود ہے، اس کے اندر عقل و شعور کام کرتا ہے، وہ ایک حد تک بااختیار ہے اور بڑی حد میں اس کے اوپر غیر اختیاری کیفیات نازل ہوتی رہتی ہیں مثلاً کوئی آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے اگر سانس لینا شروع کر دے تو چند منٹ میں وہ ہانپ جائے گا۔ کوئی آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے سانس نہ لینے کا عمل اختیار کرے تو بیمار ہو جائے گا۔ یا اس کے دماغ میں خون جم جائے گا۔ اسی طرح کوئی آدمی زندگی کے بنیادی تقاضے بھوک میں اپنا ذاتی اختیار استعمال نہیں کرتا عام زندگی میں بھوک لگتی ہے، وہ کچھ کھا لیتا ہے۔ پیاس لگتی ہے پانی پی لیتا ہے۔ یہی حالت آدمی کے اندر اس مشین کی ہے جو مشین مسلسل متواتر ہر لمحہ اور ہر آن چل رہی ہے۔ اس مشین کے کل پرزے اعضائے رئیسہ دل پھیپھڑے گردے جگر پتہ اور آنتوں کی حرکت مسلسل جاری ہے۔ چار ارب)اُس وقت کی معلوم انسانی آبادی(کی آبادی میں ایک آدمی ایسا نہیں ہے جو اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اندر فٹ کی ہوئی مشین کو چلاتا ہے۔ مشین بالکل غیر اختیاری طور پر چل رہی ہے۔ اس مشین میں جو ایندھن استعمال ہوتا ہے اس پر بھی انسان کی کوئی دسترس نہیں ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب یہ مشین بند ہو جاتی ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت یا ترقی اسے چلا نہیں سکتی۔ یہ مشین قدرتی نظام کے تحت بتدریج بھی بند ہو جاتی ہے اور ایک دَم بھی بند ہو جاتی ہے۔ بتدریج بند ہونے کا نام بیماری رکھا جاتا ہے اور مشین کے ایک دَم بند ہو جانے کو حرکت قلب بند ہو جانا یا ہارٹ فیل کہا جاتا ہے۔

انسان یہ سمجھتا ہے کہ بیماری کا علاج اختیاری ہے۔ اگر بیماریوں کا علاج اختیاری ہے تو دنیا میں کوئی آدمی مرتا نہیں۔ علیٰ ہذاالقیاس زندگی کے بنیادی عوامل اور وہ تمام محرکات جن پر زندگی رواں دواں ہے انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔ اگر ہم بنیاد پر نظر ڈالیں تو زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب آدمی پیدا ہوتا ہے اور پیدائش پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ لاکھوں سال کے طویل عرصے میں ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں ہوا جو اپنے ارادے اور اختیار سے پیدا ہو گیا ہو۔ پیدا ہونے والی ہر چیز پیدا ہونے والا ہر فرد ایک وقت مُتعیّنہ کے لئے اس دنیا میں آتا ہے اور جب وہ وقت پورا ہو جاتا ہے تو آدمی ایک سیکنڈ کیلئے بھی اس دنیا میں ٹھہر نہیں سکتا مر جاتا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کے بارے میں زیادہ سوچ بچار تفکر یا ذہنی گہرائی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر لمحہ ہر آن ہر منٹ ہر سیکنڈ یہ صورت حال واقع ہو رہی ہے۔

مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے پیدا کرتے ہیں، چاہتے ہیں تو آدمی صحت مند پیدا ہوتا ہے، نہیں چاہتے تو آدمی کی نشو و نما میں ایسا سُقم واقع ہو جاتا ہے کہ اس کے اعضاء صحیح ہوتے ہیں نہ اس کا دماغ صحیح ہوتا ہے۔ اس کی نظر بھی صحیح کام نہیں کرتی۔ ہاتھ پیروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو پکڑ نہیں سکتا۔ اپنی مرضی سے چل پھر نہیں سکتا۔ سائنس کتنی بھی ترقی کر لے پیدائشی اپاہج اور معذور بچوں کا علاج اس کے پاس نہیں ہے۔ اور اس قسم کے معذور بچوں کو یہ کہہ کر رُد کر دیا جاتا ہے کہ یہ پیدائشی اپاہج مریض ہیں۔ یہاں بھی انسان کی بے بسی اور بے اختیاری اظہر مِن الشمس ہے۔ سورج کی طرح عیاں ہے۔ قدرت جب بچوں کو پیدا کرتی ہے تو مختلف صورتوں میں پیدا کرتی ہے۔ قد و کاٹھ مختلف ہوتا ہے، یہ نہیں دیکھا گیا کہ کوئی بنیادی طور پر کوتاہ قد آدمی ۷ فٹ کا بن گیا ہو۔ ایسی بھی دنیا میں کوئی مثال نظر نہیں آتی کہ ۷ فٹ کا آدمی گھٹ کر ڈھائی فٹ کا ہو گیا ہو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قد و قامت کے معاملے میں بھی آدمی بے اختیار ہے۔

اب مسئلہ ذہنی صلاحیت اور عقل و شعور کا آتا ہے۔ لوگوں میں جب ہم عقل و شعور کا موازنہ کرتے ہیں تو کوئی آدمی ہمیں زیادہ باصلاحیت ملتا ہے، کوئی آدمی ہمیں کم صلاحیت والا ملتا ہے اور کوئی آدمی بالکل بے عقل ملتا ہے۔

سائنس خلاء میں چہل قدمی کا دعویٰ کر سکتی ہے لیکن ایسی کوئی مثال سامنے نہیں آئی ہے کہ بے عقل آدمی کو عقل مند کر دیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی مرضی سے عقل و شعور بخشتے ہیں۔ آدمی کے اندر اللہ تعالیٰ فکر اور گہرائی عطا کرتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ فکر اور گہرائی پیدا کر دیتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری اپنی چیز ہے۔ لیکن جب وہی فکر اور شعور اور گہرائی اُن سے چھین لی جاتی ہے، اُس وقت وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ زندگی کے تمام اجزاءِ ترکیبی کسی ایک طاقت کے پابند ہیں وہ طاقت جس طرح چاہے چلاتی ہے اور جس طرح چاہے نہیں چلاتی۔

مرشدِ کریم حضور قلندر باباولیاءؒ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا ہے کہ لوگ نادان ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہماری گرفت حالات کے اوپر ہے انسان اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق حالات میں ردّ و بدل کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ انسان ایک کھلونا ہے۔ حالات جس قسم کی چابی اس کھلونے میں بھر دیتے ہیں اسی طرح یہ کُودتا ہے، ناچتا ہے، آوازیں نکالتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر فی الواقع حالات پر انسان کو دسترس حاصل ہوتی تو کوئی آدمی غریب نہ ہوتا۔

موت کے پنجے نے ان کی گردن مروڑ دی اور دنیا پر ان کا نام و نشان نہیں رہا۔ یہ شداد اور نمرود اور فرعون کی مثالیں ایسی نہیں ہیں کہ جس کو ہم تاریخی باتیں کہہ کر گزر جائیں۔ تاریخ ہر زمانے میں خود کو دہراتی ہے۔ البتہ رنگ و روپ نام اور شکل بدل جاتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں شہنشاہِ ایران کی مثال سامنے ہے۔ جس نے ڈھائی ہزار سال کی سالگرہ منائی، موت کے پنجے نے اس کو اس قدر بے بس اور ذلیل کر دیا کہ اس کے لئے اس کی سلطنت کی زمین بھی تنگ ہو گئی وہ دیارِ غیر میں مر گیا اور کوئی اس کا پُرسان حال نہیں۔ اگر حالات انسان کے بس میں ہیں تو اتنا بڑا بادشاہ غریبُ الدّیار نہیں ہو سکتا۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار باتیں ہمارے ساتھ ہر روز پیش آتی رہتی ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم ان باتوں پر غور نہیں کرتے اور ان سب باتوں کو اتفاق کہہ کر گزر جاتے ہیں جبکہ کائنات میں اتفاق یا حادثہ کو ہرگز کوئی دخل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے جو مربوط ہے۔ ہر نظام کی دوسرے نظام کے ساتھ وابستگی ہے۔ اس نظام میں نہ کہیں اتفاق ہے نہ کہیں حادثہ ہے، نہ کوئی قدرتی مجبوری ہے۔ اللہ کا ایک نظام ہے اور اس نظام کو چلانے والے کارندے اللہ کے حکم اور اللہ کی مشیئت کے مطابق اسے چلا رہے ہیں۔ آدمی کیا ہے؟ کٹھ پتلی ہے۔ جس طرح کائنات کا نظام چلانے والے کارکن ڈوریوں کو حرکت دیتے ہیں آدمی چلتا رہتا ہے۔ ڈوریاں ہلنا بند ہو جاتی ہیں آدمی مر جاتا ہے۔ یہ باتیں اس لئے عرض کی گئی ہیں کہ میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اِستغناء اس وقت تک کسی شخص کے اندر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے یقین میں یہ بات واضح نہ ہو جائے کہ ہر چیز من جانب اللہ ہے۔ جب کسی بندے کے اندر یہ بات یقین بن جاتی ہے کہ اس نظام میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی حرکت اور بڑی سے بڑی شئے اللہ کے بنائے ہوئے ایک مربوط نظام کے تحت قائم ہے تو اس کے اندر ایک ایسا پیٹرن بن جاتا ہے جس کا اصطلاحی نام اِستغناء ہے۔ اس پیٹرن کو جب تحریکات ملتی ہیں اور زندگی میں مختلف واقعات پیش آتے ہیں تو ان واقعات کی کڑیاں اس قدر مضبوط مستحکم اور مربوط ہوتی ہیں کہ آدمی کی عقل یہ سوچنے اور ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں۔ اب میں ان واقعات کا اعادہ کروں گا جو اِستغناء کی دولت کے حُصول پر وقتاً فوقتاً میرے ساتھ پیش آتے رہے۔

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کسی چیز کے اوپر یقین کا کامل ہو جانا اسی وقت ممکن ہے جب وہ چیز یا عمل جس کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ یہ کس طرح ہو گی بغیر کسی ارادے اور اختیار اور وسائل کے پوری ہوتی رہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں کمرے میں بیٹھا ہوا لوح و قلم کے صفحات دوبارہ لکھ رہا تھا۔ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ لاہور سے کچھ مہمان آ گئے۔ عام حالات میں چونکہ تھوڑی دیر کے بعد کھانے کا وقت تھا اس لئے ذہن میں یہ بات آئی کہ ان مہمانوں کو کھانا کھلانا چاہئے۔ یہ اس دور کا واقعہ ہے جب میں حیرت کے مقام پر سفر کر رہا تھا اور نہ صرف یہ کہ کوئی کھانے پینے کا انتظام نہیں تھا۔ لباس بھی مختصر ہو کر ایک لنگی اور ایک بنیان رہ گیا تھا۔ یہ الگ ایک داستان ہے کہ اس لباس میں گرمی سردی اور برسات کس طرح گزری۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو ہمت اور توفیق عطا

کر دیتے ہیں اور بڑی سے بڑی مشکلات اور پریشانیاں پلک جھپکتے گزر جاتی ہیں۔ قصّہ کوتاہ یہ کہ ذہن میں یہ بات آئی کہ پڑوس میں سے ۵ روپے ادھار مانگ لئے جائیں اور ان روپوں سے خورد و نوش کا انتظام کیا جائے۔ خیال آیا کہ اگر ۵ روپے دینے سے انکار کر دیا گیا تو بڑی شرمندگی ہو گی۔ پھر خیال آیا کہ جھونپڑی والے ہوٹل سے کھانا ادھار لے لیا جائے۔ طبیعت نے اس بات کو بھی پسند نہیں کیا۔ یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ اللہ چاہے گا تو کھانے کا انتظام ہو جائے گا۔ اور میں کمرے سے باہر آیا جیسے ہی دروازے سے قدم باہر نکلا۔ چھت میں سے ۵ روپے کا ایک نوٹ گرا۔ نوٹ اس قدر نیا اور شفاف تھا کہ زمین پر گرنے کی آواز آئی۔ فرش پر جب ایک نوٹ نیا پڑا ہوا دیکھا تو نہ معلوم طریقے سے میرے اوپر دہشت طاری ہو گئی۔ لیکن یکایک ذہن میں ایک آواز گونجی یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ نوٹ اٹھا لیا گیا اور کھانے پینے کا بہ فراغت انتظام ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان سب مسخر کر دیا؟

سوال: کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے زمین و آسمان جو کچھ بھی ہے سب کا سب مسخر کر دیا؟

جواب: بنیادی ضروریات میں سب سے اہم ہوا، پانی، دھوپ، چاند کی چاندنی شامل ہیں۔ اگر انسان اپنی ضروریات کا خود کفیل ہے تو اس کے پاس ایسی کونسی طاقت ہے ایسا کون سا علم ہے کہ وہ دھوپ کو حاصل کر سکے پانی کو حاصل کر سکے۔ زمین کے اندر اگر پانی کے سَوتے خشک ہو جائیں تو انسان کے پاس ایسا کونسا علم ہے، طاقت ہے، عقل ہے کہ وہ زمین کے اندر پانی کی نہریں جاری کر دے۔ یہی حال ہَوا کا ہے۔ ہَوا اگر بند ہو جائے، اللہ تعالیٰ کا نظام، وہ نظام جو ہَوا کو تخلیق کرتا ہے اور ہَوا کو گردش میں رکھتا ہے، اِس بات سے انکار کر دے کہ ہَوا کو گردش نہیں دینی تو زمین پر موجود اربوں کھربوں مخلوق ایک منٹ میں تباہ ہو جائے گی، برباد ہو جائے گی۔

یہ کیسی بے عقلی اور ستم ظریفی ہے کہ بنیادی ضروریات کا جب تذکرہ آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ہمارا اُس پر کوئی اختیار نہیں ہے اور جب روٹی کپڑے اور مکان کا تذکرہ آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنا اختیار استعمال نہ کیا تو یہ چیزیں ہمیں کیسے فراہم ہوں گی؟

ان معروضات سے منشا یہ ہر گز نہیں ہے کہ انسان یہ سمجھ کر کہ میں بے اختیار ہوں ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہے۔ اس کے اعضاء منجمد ہو جائیں۔ منشاء صرف یہ ہے کہ زندگی میں ہر عمل اور ہر حرکت کو من جانب اللہ سمجھا جائے۔ جدّوجہد اور کوشش اس لئے ضروری ہے کہ اعضاء منجمد نہ ہو جائیں، آدمی اپاہج نہ ہو جائیں۔ آدمی جس مناسبت سے جدّوجہد کرتا ہے، جس مناسبت سے عملی اقدام کرتا ہے، بے شک اُسے وسائل بھی اُسی مناسبت سے نصیب ہوتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ قانون قدرت پر اُسے دسترس حاصل ہو گئی۔

قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے زمین آسمان اور زمین آسمان کے اندر جو کچھ ہے سب کا سب مسخر کر دیا ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس تسخیر کو صرف اور صرف مادّی حدود میں استعمال کیا جائے۔ اور دوسرا احسن طریقہ یہ ہے کہ وسائل کو اس لئے استعمال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام وسائل انسان کے لئے پیدا کئے ہیں۔

وسائل کی تقسیم اور اللہ تعالیٰ کی رزّاقیت کی تعریف میں غوث علی شاہ نے ایک واقعہ قلم بند کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شہر میں کساد بازاری اس حد تک پہنچی کہ وہاں کے بازار ویران ہو گئے۔ جب کاروبار چلنے کی کوئی صورت سامنے نہیں آئی تو لوگوں نے اس شہر سے نقل مکانی کرنا شروع کر دی۔ اس کساد بازاری اور نقل مکانی کی وجہ سے شہر میں رہنے والے غریب مزدور نہایت پریشان اور بدحال ہونے لگے۔ ابھی اس مصیبت کا کوئی حل سامنے نہیں آیا تھا اور کوئی بات ایسی نہیں بن رہی تھی کہ بازار کی ویرانی ختم ہو کر دوبارہ گہما گہمی اور ہما ہمی پیدا ہو جائے۔ ایک روز دو سوداگر بازار میں وارد ہوئے اور ان دونوں نے خریداری کرنا شروع کی۔ حد یہ کہ سوئی سے ہاتھی تک ہر چیز کے دام

لگ گئے اور بازار میں چہل پہل اور رونق افزوں تر ہو گئی۔ اس خریداری کے نتیجے میں گھوڑے خچر بیل گاڑیاں مزدور ہر شخص متحرّک ہو گیا۔ ان دونوں سوداگروں نے اعلان کیا کہ ہم پورے ایک ہفتے تک خریداری کریں گے اور اپنی ضروریات کی فہرست کو اتنا طویل کر دیا کہ اس شہر کے سوداگروں نے رات دن کوشش کے بعد دوسرے شہروں سے سامان کی فراہمی کا انتظام اور بندوبست کیا۔ اس ایک ہفتے میں ایسا ماحول پیدا ہو گیا کہ یہ شہر ملک کی سب سے بڑی منڈی بن گیا۔ لوگ خوشحال ہو گئے ان کے چہروں پر تازگی آگئی۔ جو لوگ نقل مکانی کر چکے تھے ان کو جب یہ خبر ملی تو وہ واپس آنے لگے اور جن لوگوں نے نقل مکانی کا ارادہ کر لیا تھا انہوں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ مزدور خوشحال ہو گئے اور اضطراب بے چینی افلاس اور بھوک کا دَور دَورہ ختم ہو گیا۔ ایک ہفتے کی خریداری کے بعد مسئلہ سامان اٹھانے کا اور جہاز میں لوڈ کرنے کا پیش آیا۔ لوڈنگ اَن لوڈنگ کے سلسلے میں بھی ایک مخلوق مصروف ہو گئی۔ اور اِس طرح اجڑتا ہوا شہر دوبارہ بس گیا۔

ان دونوں سوداگروں کے ساتھ بڑے میاں بھی تھے جو محنت مزدوری کے سلسلے میں ان کے ساتھ لگ گئے تھے۔ جب خریدا ہوا سارا سامان جہاز میں رکھ دیا گیا تو دونوں سوداگروں نے اس بزرگ مزدور سے کہا۔ اب تمہارا ہمارا ساتھ نہیں رہے گا۔ بوڑھے مزدور نے ان کے ساتھ چلنے پر اصرار کیا اور کہا کہ میں تنہا ہوں آپ لوگوں کی خدمت کروں گا اور آپ کے ساتھ میری زندگی گزر جائے گی۔ سوداگر اور مزدور جہاز میں سوار ہو گئے اور جہاز چلتے چلتے جب سمندر بیچ پہنچا تو ان سوداگروں نے اس جہاز کو سمندر میں ڈبو دیا اور بوڑھے مزدور سے کہا کہ ہم دونوں فرشتے ہیں چونکہ ایک آباد بستی کاروبار نہ ہونے کی وجہ سے برباد ہو رہی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذریعے یہ انتظام کیا تا کہ بستی دوبارہ آباد ہو جائے اور یہاں کے لوگوں کو ضرورت کے مطابق رزق ملتا رہے۔ یہ کہہ کر وہ دونوں فرشتے غائب ہو گئے اور بوڑھے مزدور کو سمندر کے کنارے پہنچا دیا۔

یہ واقعہ حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ کی خدمت میں سنا کر میں نے پوچھا کہ کیا صاحبِ تکوین یعنی اللہ تعالیٰ کے انتظام کو چلانے والے بندے اس قسم کے کام کرتے ہیں؟ حضور باباصاحبؒ نے فرمایا۔ یہ کام ان لوگوں کے سپرد ہے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ''فی الاَرضِ خلیفہ'' کہا ہے۔ زمین میں اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ اللہ تعالیٰ کے کن اختیارات کو استعمال کر کے اپنے فرائض پورے کرتا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے جو اِن شاءاللہ کسی مناسب موقع پر تفصیل سے بتائی جائے گی۔ اس وقت ہمارے پیش نظر اِستغناء اور یقین کی تعریف ہے۔ اِستغناء اور یقین میں جو بنیادی باتیں ہیں وہ یہ ہیں کہ انسانی زندگی میں ایسے واقعات پےَ در پےَ صادر ہوتے ہیں جن واقعات کی وہ کوئی توجیہ پیش نہ کر سکے اور نہ ہی ان واقعات کے صُدور میں اس کی کوئی عملی جدّ وجہد اور کوشش شامل ہو۔ غوث علی شاہ نے جس واقعہ کا تذکرہ فرمایا ہے اس واقعہ میں بھی یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ رزق کی فراہمی کا بندوبست در وبست اللہ کے ذمہ ہے۔ اب اللہ تعالیٰ رزق پہنچانے کا کوئی بھی طریقہ اختیار کریں۔ ہم ماں کے پیٹ میں بچے کی پرورش، بچے کی زندگی اور بچے کو مستقل طور پر غذا پہنچنے کی مثال پہلے دے چکے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ غذا حاصل کرتا ہے اور اس غذا سے مسلسل اور متواتر اعتدال کے ساتھ، توازن کے ساتھ پرورش پاتا رہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی عجیب ہے کہ بچے کو غذا پہنچانے کا جو ذریعہ ہے یعنی ماں، اس ذریعے کو بھی غذا پہنچانے میں کوئی ذاتی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ایک ماں کے طور پر غذا کھاتی ہے۔ اس غذا سے بالکل غیر اختیاری اور غیر ارادی طور پر خون بنتا ہے اور یہ خون شریانوں اور رگوں میں دوڑنے کی بجائے بچے کی غذا بنتا رہتا ہے۔ شریانوں اور رگوں کو خون کی جتنی ضرورت ہوتی ہے اس مقدار میں شریانوں اور وریدوں کو بھی خون فراہم ہوتا رہتا ہے۔

یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچے کی پرورش کس ارادے اور کس اختیار کے ساتھ ہو رہی ہے؟ بندے کا اس میں ذرا سا بھی عمل دخل نہیں ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد بچے کو غذا فراہم ہونے کا طریقہ یکسر بدل جاتا ہے۔ وہی خون جو بچے کو ماں کے پیٹ میں براہِ راست منتقل ہو رہا ہے اب دوسرا صاف شفاف طریقہ اختیار کرتا ہے اور یہی خون ماں کے سینے میں بہترین غذا دودھ بن جاتا ہے۔ یہ بات پھر اپنی جگہ اہم ہے کہ خون دودھ کیسے بنا؟ کس نے بنایا؟ اس میں آدمی کا کون سا اختیار کام کر رہا ہے؟ اور یہ بات کیا عجیب نہیں ہے کہ بچے کی پرورش جب مقصود نہیں ہوتی تو ماں کے سینے میں دودھ نہیں اترتا۔ اس کے بعد بچہ دودھ کی منزل سے ذرا آگے بڑھتا ہے تو اسے دودھ کی مناسبت سے کچھ بھاری غذاؤں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان بھاری غذاؤں کو چبانے اور پینے کیلئے قدرت دانت فراہم کرتی ہے۔

دنیا میں کون سا ایسا علم ہے۔ ایسی کون سی سائنس، ایسا کون سا بندہ ہے جو ارادے اور اختیار کے ساتھ ایسا کر سکے؟ جیسے جیسے بچے کی نشوونما بڑھتی ہے اور بچے کے جسمانی نظام کو بھاری اور قوت بخش غذاؤں کی ضرورت پیش آتی ہے اس کی آنتیں معدہ اور دوسرے اعضاء اُسی مناسبت سے کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عقل و شعور کے پاس ایسا کونسا علم ہے جس علم کی بنیاد پر وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مشین کی نقّالی کر سکے ...یعنی وہ آنتیں بنا دے معدہ بنا دے، دل پھیپھڑے تخلیق کر دے۔ چونکہ غذاؤں میں کثافت ہے۔ اور یہ غذائیں وہ غذائیں نہیں ہیں جن غذاؤں کو اللہ تعالیٰ نے لطیف کہا ہے تو ان غذاؤں سے نکلی ہوئی کثافت کے اخراج کا بھی اہتمام ہے۔ آدمی اگر اپنے اندر خود کار مشین کا معائنہ کرے تو اس پر بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی زندگی میں انسانی اختیار کو اور انسانی علم کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اب مسئلہ یہ درپیش ہے کہ جب انسان کو زندگی گزارنے پر کوئی اختیار نہیں ہے تو پھر یہ جزا اور سزا کے معاملے میں اختیار کیا چیز ہے؟ سزا اور جزا کے معاملے میں اختیار یا بے اختیاری روحانیت کا ایک بہت بڑا باب ہے۔ اس باب کو اگر اس وقت کھول دیا گیا تو اِستغناء والے باب کی پوری طرح وضاحت نہیں ہو سکے گی۔ ہم مسلسل اس باب پر بحث کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین اس وقت کامل ہوتا ہے جب آدمی کے اندر وہ قوت متحرّک ہو جائے جس قوت کا نام تصوّف نے شُہود رکھا ہے۔

بابِ چہارم

شُہود کی قسمیں

سوال: کیااللہ تعالیٰ نے ہماری کفالت کاذمہ لے رکھاہے؟

جواب: شُہود کی تین قسمیں ہیں(۱۔) علم الیقین (۲۔) عین الیقین (۳۔) حق الیقین۔علم الیقین کے دائرے میں داخل ہونے کے بعد انسان پر پہلی بات جو منکشف ہوتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارا خالق اللہ ہے۔ایسااللہ جس نے ہماری تر ضروریات کی کفالت اپنے ذمہ لے لی ہے۔ضروریات پوراہونااور مسلسل پوراہونااور بغیر کسی مادّی قانون کے پوراہونا آدمی کو بالآخر یہ سوچنے پر اور یقین کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ فی الواقع رازق اللہ ہے۔فی الواقع ربّ اللہ ہے۔فی الواقع زندگی دینے اور زندگی لینے والا اللہ ہے۔اللہ ہی عزت دیتا ہے،اللہ ہی ذلّت دیتا ہے،اللہ ہی ابتداء ہے،اللہ ہی انتہا ہے۔اللہ ہی ظاہر ہے،اللہ ہی باطن ہے۔اور اللہ ہی ہر شئے پر محیط ہے۔اس منزل میں داخل ہوئے بغیر آدمی کے اندر کبھی اِستغناءپیدا نہیں ہوتااور جس بندے کے اندر اِستغناءپیدا نہیں ہوتاوہ راہِ سلوک کا بھٹکا ہوا مسافر ہوتا ہے۔اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔دنیامیں ایسے بے شمار لوگ ہیں جنھوں نے اپنی باطنی قوتوں کو بیدار کر کے متحرّک کر کے ایسے کمالات اور خرقِ عادات کا اظہار کیا کہ لوگ حیران ہیں پریشان ہیں۔بعض باتیں ان سے اس قسم کی بھی سرزد ہوتی ہیں کہ بڑے بڑے صاحب علم لوگ ان کی روحانی قوت پر ایمان لے آتے ہیں۔اور راستہ بھٹک جاتے ہیں۔میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آدمی اپنی استطاعت اپنی صلاحیت اپنی استعداد اپنے ارادے سے خرقِ عادت کو پیدا کر سکتا ہے لیکن ایسے بندے کے اندر اِستغناءپیدا نہیں ہوتا۔کیاآپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے کہ جو جادو ٹونے کا کام کرتے ہیں۔لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور لوگوں کے بنے ہوئے کاموں کو خراب کر دیتے ہیں لیکن فیس

لیتے ہیں۔ کیا آپ نے ایسے عامل نہیں دیکھے کہ پیری کی گدی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ صورت شکل فرشتوں جیسی بنائی ہوئی ہے۔ قال اللہ اور قال الرّسولؐ کا چرچا ہے۔ لباس عین اسلام کے مطابق ہے۔ جبے قبّے میں ڈھکے ہوئے ہیں لیکن لوگوں سے پیسے وصول کر رہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں میں میرے پاس ایک خاتون تشریف لائیں۔ انہوں نے جو عامل صاحب کا نقشہ کھینچا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی بہت ہی عابد زاہد زندہ شب بے دار ہے۔ مسائل اور مشکلات کا حل یہ بتایا کہ صدقہ کر دو۔ خاتون نے پوچھا کس چیز کا صدقہ کروں؟ پیر صاحب نے بتایا کہ اونٹ کا صدقہ کرو اور ۳۰۰۰ روپے لے لئے۔ میرے مرشدِ کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ایک سائل کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ پیر اور فقیر میں فرق ہے۔ فقیر کی تعریف یہ ہے کہ اس کے اندر اِستغناء ملے گا۔ اس کے اندر دنیاوی لالچ نہیں ہوگا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس کا کفیل صرف اور صرف اللہ ہے۔ اللہ اس کو اطلس و کمخواب پہنا دیتا ہے۔ وہ خوش ہو کر پہن لیتا ہے، اللہ اس کو کھدّر پہنا دیتا ہے۔ اس میں بھی وہ خوش رہتا ہے۔ اللہ اس کو لنگوٹی پہنا دیتا ہے۔ وہ اس میں بھی خوش رہتا ہے۔ اللہ اس سے لنگوٹی چھین لیتا ہے وہ اس میں بھی خوش رہتا ہے اور دوسری پہچان یہ فرمائی کہ جب تک بندہ فی الواقع کسی فقیر کی صحبت میں رہتا ہے اس کا ذہن صرف اللہ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ شاذ و نادر ہی اسے دنیا کے کام کا خیال آتا ہے۔

خرقِ عادات کے ضمن میں آج کل سائنسی نقطہ نظر سے جو کوشش کی جا رہی ہیں ان سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان اپنی ذاتی کوششوں سے اور مُتعیّنہ مشقوں سے اپنے اندر ماورائی صلاحیتوں کو بیدار کر لیتا ہے۔ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کے سلسلے میں یورپ اور بالخصوص روس میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے انسان اس بات پر یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر ہم عبادت و ریاضت کو ماورائی علوم کے حُصول کا ذریعہ سمجھیں تو یہ بات بظاہر کمزور نظر آتی ہے۔ کیونکہ روس جس کا مذہب پر کوئی عقیدہ نہیں ہے، ماورائی علوم کے حُصول میں قابل تذکرہ حد تک ترقی کر چکا ہے۔

تصوف میں ایک تذکرہ آتا ہے ''تصرّف کرنا''...یعنی شیخ اپنے مرید پر توجہ کر کے اس کے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ یہ تصرّف آج کی دنیا میں ایک سائنس دان بھی کر لیتا ہے۔ اور وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنے حسبِ منشاء دوسرے آدمی کو متاثر کر کے اس کو وہ کام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو اس کے ذہن میں ہوتا ہے۔ تصوّف میں دوسری بڑی اور اہم چیز اندر دیکھنا ہے یعنی آدمی کے اندر ایسی باطنی نظر کام کرنے لگتی ہے جس نظر سے وہ سیارے سے باہر کی دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے۔ آج کے دور میں یہ بات بھی ہمارے سامنے آچکی ہے کہ مراقبہ بھی ایک سائنس بن چکا ہے۔ یورپ میں لاکھوں کی تعداد میں ایسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو مراقبہ اور مراقبے کی کیفیات پر سیر حاصل بحث کرتی ہیں۔ تیسری چیز جو روحانیت، تصوّف یا مذہب میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن صلاحیتوں کی بنیاد پر وہ ایسے علوم کا اظہار کرتا ہے جو علوم بظاہر کتابوں میں نہیں ملتے۔ سائنس نے اس سلسلے میں بھی کافی پیش رفت کی ہے اور ایسے علوم کا اظہار ہو چکا ہے کہ جن پر شعور انسانی نے یقین بھی نہیں کیا اور بالآخر وہ چیزیں وجود میں بھی آئیں ار انسان ان پر یقین کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ان حالات میں تصوّف کی اصطلاحیں توجہ، تصرّف، باطنی نگاہ کا کھلنا، ٹائم اسپیس یا زمان و مکاں سے آزادی ایک معمّہ بن گئی ہیں۔ اب تک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ ماورائی نظر کا متحرّک ہونا صرف ذکر و فکر اور اشغال سے ممکن ہے۔ ان حالات میں سمجھنا بہت ضروری ہو گیا ہے کہ جب ایسے لوگ جو مذہب پر عقیدہ نہیں رکھتے تصرّف کر سکتے ہیں، ان کی باطنی نگاہ بیدار ہو سکتی ہے، وہ نئے نئے علوم کی داغ بیل ڈال سکتے ہیں پھر یہ تصوّف کیا ہے؟ تصوّف کے ساتھ ساتھ مذہب کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ مذہب کی بنیادیں بھی انہی اصولوں پر رکھی گئی ہیں کہ آدمی مذہبی فرائض پورے کرنے کے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی یا دوسروں کی زندگی میں تصرّف کر سکے۔ اس کی باطنی نگاہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے لگے۔ لیکن جب ہم مذہب کے پیروکاروں کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہزاروں لاکھوں میں ہمیں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملتا جس کے تصرّف کی طاقت بحال ہو گئی ہو اور جس کے اندر باطنی نگاہ کام کرتی ہو۔ یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ مذہبی لوگ ان علوم سے بے خبر ہیں جن علوم کی نشان دہی ایسے لوگوں نے کی ہے جو مذہب پر عقیدہ نہیں رکھتے یا مذہب کو ایک مجبوری

سمجھتے ہیں۔ان حالات میں ہر سنجیدہ آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہے تو پھر تصوّف اور مذہب کیا ہے؟اس بات کو ہم یہاں مختصر کر کے پھر اپنے اصل موضوع اِستغناء کی طرف لوٹتے ہیں۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے تذکرہ میں وضاحت کے ساتھ فرعون اور جادو گروں کا تذکرہ کیا ہے۔فرعون نے جب یہ دیکھا کہ اس کی خدائی پر حرف آرہا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام اس کی تباہی اور بربادی کا ذریعہ بن رہے ہیں تو اس نے اپنی مملکت کے تمام جادو گروں کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے مقابلہ کریں۔اس دعوت میں جادو گروں کے لئے جو متوجہ کرنے کی سب سے بڑی چیز تھی وہ یہ تھی کہ اگر تم نے موسیٰ کو شکست دے دی تو تمہیں انعام واکرام سے مالا مال کر دیا جائے۔

ایک میدان اور تاریخ مقرر ہوئی۔جادو گر جمع ہو گئے۔موسیٰ علیہ السّلام بھی تشریف لائے۔جادو گروں نے لاٹھیاں بانس اور رسّیاں میدان میں پھینکیں وہ سانپ بن گئے۔اژدہے بن گئے، لگتا تھا کہ میدان بڑے بڑے سانپوں اور اژدھوں سے بھرا ہوا ہے۔ہر طرف چیخ وپکار اور سانپوں کی پھنکار تھی۔صورت حال جب بہت نازک ہو گئی اتنی نازک کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام بھی گھبرا گئے۔حضرت موسیٰ علیہ السّلام اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔اے موسیٰ ڈر مت! اپنا عصا پھینک۔موسیٰ علیہ السّلام نے اپنا عصا زمین پر پھینک دیا۔وہ عصا ایک بہت بڑا اژدھا بن کر میدان میں دوڑتے ہوئے تمام سانپوں اور اژدھوں کو نگل گیا۔اور اس طرح فرعون جس کو اپنی دنیاوی دولت اور مال واسباب پر گھمنڈ تھا ذلیل وخوار ہوا اور وہ جادو گر جو دولت اور انعام واکرام کے لالچ میں دور دراز سے موسیٰ علیہ السّلام کو شکست دینے آئے تھے وہ بھی نامراد لوٹ گئے۔اس واقعہ میں اگر تفکر کیا جائے تو بہت سادہ بات یہ ہے کہ جادو گروں نے جب بانس پھینکے تو اُن سے خرقِ عادت کا ظہور ہوا اور وہ سانپ بن گئے۔موسیٰ علیہ السّلام نے جب عصا پھینکا وہ اژدھا بن گیا اور تمام سانپوں کو نگل گیا۔ابھی ہم نے عرض کیا ہے کہ آدمی اپنی کوششوں اور متعیّن طریقوں پر مشقیں کرنے کے بعد اس قابل بن جاتا ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے خرقِ عادت کا اظہار کر سکے جیسا کہ جادو گروں نے اپنے ارادے اور اختیار سے خرقِ عادت کو ظاہر کیا کہ ایک مخلوق نے اس کا مشاہدہ کیا لیکن

اس میں ایک بنیادی فرق ہے۔ جادو گر لاتعداد ہیں، بانس اور رسیاں جو اژدہے اور سانپ بنے وہ بے شمار ہیں۔ جادو گروں کو ایک بہت بڑے بادشاہ کا تعاون بھی حاصل ہے۔ موسیٰ علیہ السّلام تنہا ہیں اُن کا تکیہ اُن کا بھروسہ اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس بات کو اس طرح سمجھا جائے گا کہ جادو گروں کے دلوں میں چونکہ مال ودولت کی خواہش موجود ہے اس لئے ان میں اِستغناء نہیں تھا۔ یہی صورت حال تصوّف میں توجہ تصرّف اور باطنی نگاہ کی بھی ہے۔ اگر کسی بندے میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلقِ خاطر پیدا نہیں ہوا اور اس کے اندر اِستغناء کی قوتیں نہیں ابھریں تو اس سے جو کچھ خرقِ عادت صادر ہو گی وہ استدراج ہے، جادو ہے۔ مذہبی عبادت کا بھی یہی قانون ہے۔ مذہب نے جو عبادتیں فرض کر دی ہیں ان فرائض کی ادائیگی میں اگر بندے کا ذہن اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہے تو یہ عبادت ہے ورنہ یہ عبادت نہیں ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکٰوۃ یہ سب ارکان اس بنیاد پر قائم ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس طرح چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ان فرائض کی ادائیگی میں ہم کوئی کوتاہی نہ کریں لیکن اگر فرض کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ یقین قائم نہ ہو تو یہ فرض کی ادائیگی نہیں ہو گی اور بندہ بالآخر نقصان اور خسارے میں ہو گا۔

زندگی میں دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ عید کا چاند دیکھنے کے بعد بچوں کی عیدی کے سلسلے میں فکر لاحق ہوئی۔ اور میں اپنے ایک دوست کے پاس کچھ روپے ادھار لینے کیلئے چلا گیا۔ دوست نے مجھ سے کہا۔ یہ روپے تو میرے پاس موجود ہیں لیکن کسی کی امانت ہیں۔ طبیعت نے اس بات کو گوارہ نہ کیا کہ دوست کو امانت میں خیانت کرنے کا مجرم قرار دیا جائے۔ وہاں سے چلتا ہوا میں بازار میں آ گیا۔ وہاں مجھے ایک دوست ملے۔ بہت اچھی طرح پیش آئے اور انہوں نے پیشکش کی کہ آپ کو عید کے سلسلے میں کچھ روپے پیسے کی ضرورت ہو تو لے لیں۔ میرے پاس کافی رقم موجود ہے۔ نہ معلوم طریقے پر میں نے ان کی اس پیشکش کو نامنظور کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ صاحب میں نے آپ سے کسی زمانے میں کچھ روپے ادھار لئے تھے۔ وہ میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اور انہوں نے میری جیب میں ساٹھ روپے ڈال دیئے۔ میں گھر چلا آیا اور ان ساٹھ روپوں سے عید کی تمام ضروریات پوری ہو گئیں۔ اس واقعہ پر بہت زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ دوست سے میں ۳۰ روپے ادھار لینے گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنے پیسے دیئے جو میری ضروریات کے لئے پورے

تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر ۳۰ روپے قرض مل جاتے تو ضرورت پوری نہ ہوتی۔ یہ پیسے اور روپے کے سلسلے میں دو واقعات میں نے گوش گزار کئے ہیں۔ اس قسم کے بے شمار واقعات زندگی میں پیش آئے۔ ان بے شمار واقعات پیش آنے کے نتیجہ میں یہ یقین مستحکم اور پختہ ہو گیا کہ ضروریات کے واحد کفیل اللہ تعالی ہیں۔ اللہ تعالی نے وعدہ کیا ہے کہ ہم رازق ہیں۔ وہ بہر حال رزق پہنچاتے ہیں اور اللہ تعالی کے وہ کارندے جن کے بارے میں اللہ تعالی نے "فی الارض خلیفہ" کہا ہے، اِس بات پر کاربند ہیں کہ وہ مخلوق کو زندہ رکھنے کے لئے وسائل فراہم کریں۔ بہت عجیب بات ہے کہ اللہ تعالی اپنی مرضی سے پیدا کرتے ہیں۔ جب تک وہ چاہتے ہیں آدمی زندہ رہتا ہے۔ اور جب وہ نہیں چاہتے تو آدمی سیکنڈ کے ہزارویں حصّہ میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن آدمی یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اپنے اختیار سے زندہ ہوں۔ معاشی سلسلہ میرے اپنے اختیار سے قائم ہے۔ اِسی سلسلے میں ایک مرتبہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا۔ "کسان جب کھیتی کاٹتا ہے تو جھاڑو سے ایک ایک دانہ سمیٹ لیتا ہے اور جو دانے خراب ہوتے ہیں یا گھن کھائے ہوئے ہوتے ہیں ان کو بھی اکٹھا کر کے جانوروں کے آگے ڈال دیتا ہے۔ جس زمین پر گیہوں بالوں سے علیحدہ کر کے صاف کیا جاتا ہے وہاں اگر آپ تلاش کریں تو مشکل سے چند دانے نظر آئیں گے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالی کی مخلوق پرندے اربوں اور کھربوں کی تعداد میں دانہ چگتے ہیں، اُن کی غذا ہی دانہ ہے، تو یہ معمّہ حل نہیں ہوتا کہ کسان تو ایک دانہ نہیں چھوڑتا۔ ان پرندوں کے لئے کوئی مخصوص کاشت نہیں ہوتی پھر یہ پرندے کہاں سے کھاتے ہیں؟" حضور قبلہ ؒ نے فرمایا کہ قانون یہ ہے کہ پرندوں کا غول جب زمین پر اس ارادے سے اترتا ہے کہ ہمیں یہاں دانہ چگنا ہے، اِس سے پہلے کہ اُن کے پنجے زمین پر لگیں قدرت وہاں دانہ پیدا کر دیتی ہے۔ اگر پرندوں کی غذا کا دارومدار حضرتِ انسان یعنی کسان پر ہوتا تو سارے پرندے بھوک سے مر جاتے۔ دوسری مثال حضور بابا صاحبؒ نے یہ ارشاد فرمائی ہے کہ چوپائے بہر حال انسانوں سے بہت بڑی تعداد میں زمین پر موجود ہیں۔ بظاہر وہ زمین پر اُگی ہوئی گھاس کھاتے ہیں، درختوں کے پتے چرتے ہیں۔ لیکن جس مقدار میں گھاس اور درختوں کے پتے کھاتے ہیں۔ زمین پر کوئی درخت نہیں رہنا چاہئے۔ قدرت ان کی غذا کی کفالت پوری کرنے کے لئے اتنی بھاری تعداد میں درخت اور گھاس پیدا کرتی ہے کہ چرندے سیر ہو کر کھاتے رہتے

ہیں۔ گھاس اور پتوں میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ ان درختوں اور گھاس کا تذکرہ ہے جس میں انسان کا کوئی تصرّف نہیں ہے۔ قدرت اپنی مرضی سے پیدا کرتی ہے۔ اپنی مرضی سے درختوں کی پرورش کرتی ہے۔ اور اپنی مرضی سے انہیں سرسبز و شاداب رکھتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جو زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر انسان کی زندگی میں دو چار واقعات ایسے ضرور پیش آتے ہیں جن کی وہ کوئی عملی، عقلی، سائنسی توجیہ پیش نہیں کر سکتا۔ اَنہونی باتیں ہوتی رہتی ہیں آدمی اتفاق کہہ کر گزر تا رہتا ہے۔ حالانکہ کائنات میں کسی اتفاق کسی حادثہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔

سائنسی ایجادات

سوال: کیا سائنسی ایجادات کا مقصد مالی منفعت ہی رہا ہے؟

جواب: سائنس کی موجودہ جتنی بھی ترقی اب تک سامنے آچکی ہے۔ جب ہم اس کے افادی پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ نوعِ انسانی کی فلاح و بہود کے پردے میں اس ترقی کا ماحصل دنیاوی لالچ ہے۔ جتنی بھی سائنس نے ترقی کی اس ترقی سے نوعِ انسانی مستفیض ہوئی ہے لیکن جن لوگوں نے یہ ایجادات کیں ان کے پیش نظر مالی اور دنیوی منفعت رہی۔ ہم طرزِ فکر کے بارے میں بہت واضح طور پر یہ بیان کر چکے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ موجود ہے اس کا تعلق براہِ راست طرزِ فکر سے ہے۔

ایک طرزِ فکر وہ ہے جس کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے...اور

ایک طرزِ فکر وہ ہے جس طرزِ فکر کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرزِ فکر کا مشاہدہ ہر آن اور ہر گھڑی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود بھی قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ ''ہماری نشانیوں پر غور و تفکر کرو اور عاقل بالغ باشعور اور سمجھ دار اور فہیم لوگ وہ ہیں جو ہماری نشانیوں پر غور کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں ظاہر حواس سے دیکھی جانے والی نشانیاں جن سے ہم ہر وقت مستفیض ہوتے رہتے ہیں وہ یہ ہیں... ہَوا، پانی، دھوپ، رنگ، زمین کی نشوونما اور نئی نئی چیزیں تخلیق کرنے کی صلاحیت۔ اللہ تعالیٰ نے اس کوکھ سے ایسی ایسی چیزیں پیدا کیں جن چیزوں پر نہ صرف یہ کہ نوعِ انسانی بلکہ زمین کے اوپر جتنی بھی مخلوق موجود ہے اس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ہَوا ایک ایسی نشانی ہے کہ جس سے زمین پر رہنے والا ایک متنفّس بھی محروم نہیں ہے۔ پانی ایک ایسی نشانی ہے جو انسان کی زندگی کو فیڈ Feed نہ کرے تو زندگی ختم ہو جائے گی۔ نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی ختم ہو جائے گی، پورا سیارہ زندگی سے محروم ہو جائے گا۔ یہی حال دھوپ کا ہے۔ یہی حال چاندنی کا ہے۔ یہی حال درختوں کے سرسبز و شاداب ہونے کا ہے اور یہی حال رنگ برنگے پھولوں کا ہے۔ یہ ساری چیزیں براہِ راست اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہیں۔

ان تخلیقات پر جب تفکر کیا جاتا ہے تو بجز اس کے کوئی بات سامنے نہیں آتی کہ ان تمام تخلیقات سے اللہ تعالیٰ کا منشاء اور مقصد یہ ہے کہ نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچے۔ ایسا فائدہ کہ جس فائدہ کے پیچھے کوئی غرض، کوئی صلہ، کوئی مقصد، کوئی لین دین اور کوئی کاروبار نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام چیزیں اس لئے پیدا کی ہیں کہ بندے اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں تو پھر ہم یہ کیسے تسلیم کریں گے کہ جو لوگ اللہ کی ذات و صفات کا انکار کرتے ہیں اور برملا کفر کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ہَوا ان کو بھی زندگی دے رہی ہے، پانی سے وہ بھی سیراب ہو رہے ہیں۔ دھوپ میں جو حیاتین اور توانائی موجود ہے ان سے بھی انہیں فائدہ پہنچ رہا ہے۔ نوعِ انسانی سے ہٹ کر سانپ، بچھو، کنکھجورے اور بے شمار حشرات الارض بھی اللہ تعالیٰ کے اس مفت انعام سے مالا مال ہیں۔ اس مختصر سی تمہید سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرزِ فکر یہ ہے کہ وہ جب انعام فرماتے ہیں تو مخلوق کو بلا تخصیص اس سے فائدہ پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی طرف سے کسی صلہ یا ستائش کی غرض نہیں ہوتی۔ بس یہ ان کی شان کریمی ہے کہ انہوں نے مخلوق کو پیدا کیا اور اس مخلوق کو زندہ رکھنے کے لئے اتنے وسائل فراہم کر دیئے کہ فی الواقع مخلوق اس کا شمار ہی نہیں کر سکتی۔

للہ تعالیٰ نے وسائل بے حد وحساب عطافرمائے ہیں۔اس کے بر عکس جب ہم سائنسی ترقیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں سائنس کی ہر ترقی میں ذاتی منفعت اور دنیاوی لالچ ملتا ہے۔ یہ وہ طرزِ فکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرزِ فکر کے متضاد ہے۔ ظاہر ہے جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرزِ فکر کے مطابق نہیں ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے پسندیدہ نہیں ہے۔ جتنا قرب اللہ تعالیٰ سے بندے کو ہوتا ہے اسی مناسبت سے بندے میں اللہ تعالیٰ کی طرزِ فکر منتقل ہوتی رہتی ہے اور اس سے ایسے اعمال سرزد ہوتے رہتے ہیں جن سے مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن اس بندے کا اپنا ذاتی فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔ تمام اولیائے کرام کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ انہوں نے نوعِ انسانی کی جو بھی خدمت کی اس خدمت کے پیچھے ان کا اپنا کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا اور اگر کسی بندے کا ذاتی فائدہ ہے تو وہ ہر گز اولیاء اللہ کی صف کا بندہ نہیں ہے۔ کوئی آدمی اپنی کوشش اپنی ریاضت سے اپنے اندر روحانی صلاحیتوں کو بیدار کر کے یقیناً خرقِ عادات کا اظہار کر سکتا ہے لیکن اگر اس کی طرزِ فکر اللہ تعالیٰ کی طرز فکر سے ہم رشتہ نہیں ہے تو یہ تصوّف نہیں ہے۔ایک سائنس ہے ایسی سائنس جو لا مذہب لوگ بھی اختیار کر سکتے ہیں اور جیسا کہ اس زمانے میں ہو رہا ہے۔

یورپ میں جو روحانیت کے اوپر ریسرچ ہو رہی ہے یا روحانی نقطہ نظر سے بقول ان کے جو ترقیاں ہمارے سامنے آرہی ہیں ان ترقیوں میں ایک ہی بات لگتی ہے وہ یہ کہ اس ترقی سے ہم نوعِ انسانی کو کس طرح تباہ کر سکتے ہیں۔ اس ترقی سے ہم اپنا اقتدار کس طرح مضبوط کر سکتے ہیں۔اس ترقی سے ہم دوسرے لوگوں کو شکست خوردہ قوم کس طرح بنا سکتے ہیں یعنی آدمی اپنے خول کے اندر بند ایسی ایجادات کو کہ جن ایجادات کا فائدہ براہِ راست اللہ کی مخلوق کو نہیں پہنچتا اور اگر کسی تخلیق یا ایجاد کا فائدہ پہنچتا بھی ہے تو وہ بھی یہ باامر مجبوری پہنچتا ہے۔اب تک کے حالات شاہد ہیں کہ جن لوگوں نے سائنسی ترقی حاصل کی ہے اور جو قومیں دنیا میں سب سے آگے ہیں وہاں ایک ہی کشمکش ملتی ہے کہ ہم کس طرح دوسروں کو نیست و نابود کر کے غالب آجائیں۔ یہ اس وقت ہے جب کوئی ترقی براہِ راست ترقی نہیں ہے۔ جو بھی ترقی اب تک ہوئی ہے یا آئندہ ہو گی یا ہو چکی ہے اس کے مصالحہ پر غور کیا جائے تو اس مصالحہ کی تخلیق کوئی نہیں۔

بجلی اللہ تعالیٰ کی ایک تخلیق ہے۔ بجلی کو دریافت کرنے کا سہرا بے شک آدمی کے سر پر بندھا ہوا ہے۔ لیکن یہ کہ بجلی اس نے پیدا کر دی ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بجلی اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ زمین کے سَوتے خشک کر دیں یا پہاڑوں سے آبشار گرنا بند ہو جائیں۔ بادل برسنا چھوڑ دیں، سارے سمندر خشکی بن جائیں۔ اس وقت بجلی کہاں سے پیدا ہو گی؟ بجلی پیدا ہونا تو ایک جملہ معترضہ ہے۔ زندگی ہی ختم ہو جائے گی۔ انبیاء کرام کی تعلیمات پر روحانی نقطہ نظر سے اور قلبی مشاہدے کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ انبیاء کی ساری تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ بندے کی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی طرف موڑ دیا جائے یعنی اگر بندہ انفرادی طور پر زندہ رہتا ہے تو اس لئے زندہ نہ رہے کہ اس کو اس کی مرضی کے بغیر اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ وہ زندہ رہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر صلاحیتوں کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، تو جب اللہ تعالیٰ اسے توفیق دیں اور وہ ان صلاحیتوں کا استعمال کرے تو اس کے ذہن میں یہ بات رہے کہ میری صلاحیتوں کا اظہار اس لئے ہو رہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو فائدہ پہنچے۔

یہ کہنا کہ اِستغناء کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہشات کو ختم کر دے ہر گز صحیح نہیں ہے۔ یہ سراسر کوتاہ عقلی کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ زندگی بجائے خود خواہشات کا نام ہے۔ زندگی سے خواہشات کو نکال دیا جائے تو زندگی روشنیوں میں تحلیل ہو جائے گی، کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ کیا پانی پینا، بھوک لگنا، سونے اور جاگنے کا تقاضہ، بچوں کی خواہش پیدا ہونا، بچوں کی تربیت کرنا، اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے کا تقاضہ پیدا ہونا خواہشات نہیں ہیں؟ یہ سب خواہشات ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تمام خواہشات پوری کی جائیں لیکن خواہشات کو پورا کرنے میں انسان کا ذہن یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ چونکہ یہ چاہتے ہیں لہٰذا ہم یہ کر رہے ہیں۔

اِستغناء سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ آدمی ساری زندگی روزے رکھتا رہے۔ اِستغناء سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ وسائل عطا فرمائیں اور آدمی سوکھی روٹی کھاتا رہے۔ اِستغناء سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کرے اللہ کے

لئے کرے۔اللہ تعالیٰ اگر اطلس و کمخواب کے کپڑے پہناتا ہے تو وہ کپڑے اس لئے پہنے کہ اللہ تعالیٰ نے پہنائے ہیں، اللہ تعالیٰ اگر ٹاٹ کے کپڑے پہنائے تو آدمی اس میں بھی اتنا ہی خوش رہے جتنا وہ اطلس و کمخواب کے کپڑے پہن کر خوش ہوتا۔آدمی کو اللہ تعالیٰ مرغی کھلائے تو وہ مرغی کھائے۔لیکن اگر حالات کے تقاضے کے تحت آدمی کو چٹنی سے روٹی ملے یا ایک وقت روٹی ملے تو اس میں بھی اتنا ہی خوش رہے جتنا وہ مرغی کھا کر خوش ہوا تھا۔اور یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ ہماری زندگی کی ہر حرکت ہر عمل ہماری گفتار کی بنیاد اللہ کا ایک انعام ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں بولنے کی صلاحیت دی۔ہم بولتے ہیں،اللہ تعالیٰ نے ہمیں سننے کی صلاحیت عطا کی، ہم سنتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ہمیں سوچنے سمجھنے اور تفکر کرنے کی صلاحیت دی ہم سوچتے ہیں، تفکر کرتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اس لئے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ایسا کیا جائے۔

اسی قسم اور ایسی قبیل کے لوگوں کے لئے ارشادِ خداوندی ہے:

"وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ"سورۃآلِ عمران—7

اور وہ لوگ جو "راسخ فی العلم"ہیں کہتے ہیں کہ یہ بات یقین اور مشاہدے میں ہے کہ ہر بات ہر چیز مِن جانب اللہ ہے۔

اس آیت پر غور کیا جائے تو سوچنے اور سمجھنے کے کئی رخ مُتعیّن ہوتے ہیں۔تفصیل میں جانے کی بجائے ہم دو رخوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وہ لوگ علمی اعتبار سے مستحکم ذہن رکھتے ہیں یعنی ایسا ذہن جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ایسا ذہن جو شیطانی وسوسوں سے پاک ہے۔ایسا ذہن جس کے اندر کثافت اور علمی آلودگیاں نہیں ہیں۔علمی کثافت اور

علمی آلودگی سے مراد یہ ہے کہ اس علم سے بندوں کو تکلیف پہنچے۔ جس کو عرف عام میں تخریب کا علم کہا جاتا ہے اور وہ لوگ جو علمی اعتبار سے ایسی مَسند پر قیام فرما ہیں جس پر شکوک و شبہات کی چھاپ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا یقین ہے، ایمان ہے کہ ہر چیز اس کی دنیا میں کوئی بھی حیثیت ہو، چھوٹی ہو، بڑی ہو، راحت ہو، تکلیف ہو ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ اس آیت مبارکہ میں مختصراً دو رخوں کا تذکرہ اس طرح ہے کہ کچھ لوگ ہیں جو راسخ فی العلم ہیں اور ان لوگوں کا کہنا یہ ہے یا ان لوگوں کی پہچان یہ ہے یا ان لوگوں کی طرزِ فکر یہ ہے کہ یہ بات ان کے مشاہدے میں ہوتی ہے کہ:

کائنات میں جو کچھ موجود ہے، جو ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے، اس کا براہِ راست تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کے ذہن میں ہے اسی طرح اس چیز کا یا اس عمل کا مظاہرہ ہو رہا ہے یا فلسفیانہ طرزِ فکر کو نظر انداز کرتے ہوئے عامیانہ سطح پر ہم اس بات کو چند مثالوں میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

علم کی حیثیت

سوال: علم کی حیثیت کیا ہے اور یہ نوعِ انسانی میں کس طرح منتقل ہوتا ہے؟

جواب: بحیثیت انسان جب ہم عقل و شعور سے کام لیتے ہیں تو یہ بات ہمارے اوپر پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا میں یا کائنات میں جو کچھ موجود ہے دراصل اس کی حیثیت علم کی ہے۔ اگر کسی چیز کے بارے میں ہماری عقل یا ہمارا شعور علمی طور پر باخبر ہے تو ہم اس چیز سے براہِ راست یا بالواسطہ متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ علم کی دو حیثیتیں ہیں۔

ایک علم یہ ہے کہ شعور اس سے واقف ہو اور واقفیت کے ساتھ ساتھ وہ چیز وجودی اعتبار سے آنکھوں کے سامنے بھی ہو۔ دوسری حیثیت علم کی یہ ہے کہ وجودی اعتبار سے ظاہرہ آنکھ کے سامنے وہ چیز موجود نہ ہو لیکن نوعِ

انسانی کا شعور انفرادی شعور میں منتقل ہو گیا ہو۔اِن دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت ہو انسان علم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ علم ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات میں موجود ہر شئےاس علم کی بنیاد پر ایک دوسرے سے متعارف ہے۔ تعارف میں کہیں راحت سرور اور مسرت کے خاکے نمایاں ہوتے ہیں اور کہیں پریشانی، بے قراری اور اضمحلال موجود ہوتا ہے۔ غم اور خوشی کا جہاں تک تعلق ہے،اُس کی بنیاد بھی علم کے اوپر ہے۔ علم جب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس چیز کے نہ ہونے سے ہمارا نقصان ہے تو ہمارے اوپر تکلیف کی کیفیات مرتّب ہوتی ہیں۔ علم جب ہمیں بتاتا ہے کہ یہ کام یا یہ عمل یا یہ چیز ہمارے فائدے کے لئے ہے تو اس علم کے نتیجے میں ہمارے اوپر جو کیفیات مرتّب ہوتی ہیں،ان کا نام ہم خوشی،مسرت، سکون،اطمینانِ قلب وغیرہ وغیرہ رکھتے ہیں۔

یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ آگ ایک ایسی مخلوق ہے کہ جو ہمیں راحت بھی پہنچاتی ہے اور نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ چونکہ علم میں مثبت اور منفی دونوں رخ موجود ہیں اس لئے آگ سے ہم منفی اور مثبت دونوں قدروں میں متاثر ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ پانی سے ہمارے اندر موجود رگوں،پٹھوں اور اعصاب کی سیرابی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ہمارے علم میں موجود ہے کہ اگر پانی اعتدال سے زیادہ ہو جائے تو یہ زمین اور نوعِ انسانی کے لئے بربادی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانی سے مثبت اور منفی پہلوؤں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ علیٰ ھٰذاالقیاس اس قسم کی مثالیں بے شمار ہیں۔ مختصراً عرض یہ کرنا ہے کہ زندگی کے اندر کام کرنے والے تمام جذبات احساسات میں اسی قسم کی وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ علم کی حیثیت اگر منفی ہے تو دانستہ اور نادانستہ اس سے ایسے کام سرزد ہو جاتے ہیں جن کے نتیجے میں نہ صرف یہ ہے کہ وہ پریشان ہوتا ہے۔اس کی نوع بھی تکلیف میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ علم کی حیثیت اگر مثبت ہے تو اس سے دانستہ یا غیر دانستہ ایسے اعمال ایسی حرکات کا صدور ہوتا ہے جن سے وہ خود بھی راحت محسوس کرتا ہے اور نوعِ انسانی بھی اس کے پر مسرت جذبات سے فائدہ حاصل کرتی ہے۔دوسری صورت جو جذبات واحساسات کی تخلیقی حیثیت ہے وہ یہ ہے کہ انسان علم کو معانی پہناتا ہے۔ جس قسم کے وہ علم کے اندر معانی اور مفہوم داخل کر دیتا ہے اسی قسم کے تاثرات اس کے اوپر قائم ہو جاتے ہیں۔

کیا قرآنی آیات پڑھنی چاہئیں؟

سوال :آپ ماہانہ ہزاروں افراد کے مسائل حل کرتے ہیں بہت سے لوگوں کو آپ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وظائف پڑھنا بند کر دیں۔ سوال یہ ہے کہ وظائف قرآنی آیات پر مبنی ہوتے ہیں۔ کیا قرآنی آیات پڑھنے سے بھی نقصانات ہو سکتے ہیں؟

جواب: قرآن کریم میں سورہ حشر میں ارشاد ہے ''اگر ہم قرآن کو پہاڑوں پر نازل کر دیتے تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے۔'' پہاڑ ریزہ ریزہ ہونے میں جو حکمت پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کے اندر ایک طاقت ہے۔ ایک قوت ہے اور یہ طاقت و قوت اتنی زیادہ ہے کہ اس کو پہاڑ جیسی سخت چیز بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

اگر انسان چوبیس گھنٹے وظیفے پڑھتا رہے تو اس کے دماغ میں اللہ کی آیتوں کا نور ذخیرہ ہوتا رہتا ہے اور جب یہ ذخیرہ سکت سے زیادہ ہو جاتا ہے تو شعور کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنے ہوئے کام بگڑ جاتے ہیں۔ مزاج چڑچڑا پن کا شکار ہو جاتا ہے اسے ذرا ذرا سی بات پر غصہ آتا ہے۔ اسی فرمان کی دوسری حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ انسان محنت کرنا چھوڑ دے اور وظیفوں پر اکتفا کر کے جمود کا شکار بن جائے۔

اللہ ہر آن اور ہر لمحہ کائنات اور افرادِ کائنات کو متحرّک دیکھنا چاہتا ہے۔ جدّ وجہد اور کوشش سے غفلت اللہ کے نظام میں ممنوع اور ناپسندیدہ ہے۔ قرآن پاک تخلیقی فارمولوں کا مکمل ضابطہ ہے۔ جو ہماری زندگی کے تمام امور اور حرکات کا احاطہ کرتا ہے۔ قرآن کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ سمجھنا چاہئے تاکہ ہمارے اوپر اس کتاب کے اندر موجود تسخیری قوتیں آشکار ہو جائیں۔ جس سے کام لے کر ہم کامیابی و کامرانی کو اپنا مقدر بنا سکتے ہیں۔

تعویذ کے اندر کونسی طاقت ہے؟

سوال: آج کل جبکہ ہر طرف سائنسی ترقی کا دَور دورہ ہے۔ نت نئے امراض اور اس کا علاج ممکن ہے۔ پھر یہ کیسے ہو جاتا ہے کہ بہت سی بیماریوں کے علاج میں تمام ڈاکٹر ناکام ہو جاتے ہیں؟ اور وہی بیماری ایک عامل کے تعویذ اور عمل سے ختم ہو جاتی ہے۔ سوال یہ کرنا ہے کہ تعویذ کے اندر وہ کونسی طاقت ہے جس کے ذریعے سے بیماری دور ہو جاتی ہے اس کی علمی اور روحانی تشریح فرمادیں۔

جواب: انسان کے اندر کام کرنے والی ساری صلاحیتوں کا تعلق اور دارومدار ذہن پر ہے۔ ذہن کی طاقت ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیتی ہے۔ جہاں شعور بھی ہراساں اور خوفزدہ نظر آتا ہے۔ انسان کی ایجاد کا یہ کتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے ایک ایٹم کو اتنا بڑا درجہ دے دیا ہے کہ اس ایک ایٹم سے لاکھوں جانیں ضائع ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ایٹم کو لاکھوں اشرف المخلوقات انسانوں پر فضیلت دی گئی ہے۔

جس طرح ایٹم میں مخفی طاقتیں موجود ہیں بالکل اسی طرح کائنات کی ہر تخلیق میں مخفی اور پوشیدہ طاقتوں کا سمندر موجزن ہے اور ان ساری طاقتوں کی اصل روشنی ہے۔ عملیات اور تعویذ میں بھی یہی روشنی کام کرتی ہے۔ چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لئے روشنی پر اس کو تصرّف کا اختیار دیا گیا ہے۔ تعویذ میں جو روشنیاں کام کرتی ہیں وہ ذہنِ انسانی کے تابع ہیں لیکن اس کیلئے اجازت لینا ضروری ہے۔ کسی بھی عمل کے صحیح نتائج اس وقت سامنے آتے ہیں جب ہماری صلاحیتیں دلچسپی اور یکسوئی کے ساتھ عمل پیرا ہوں۔ قانون یہ ہے کہ دلچسپی اور یکسوئی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے روشنیاں بکھر جاتی ہیں یہی حال تعویذ کے اوپر لکھے ہوئے نقوش اور ہندسوں کا ہے۔ کوئی عامل جب تعویذ لکھتا ہے تو وہ اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی ماورائی قوتوں کو حرکت میں لے آتا ہے۔

فقہی علم کیا ہے؟

سوال: حضور ﷺ کی حدیث ہے کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ درخواست ہے کہ اس بات کی وضاحت کر دیں کہ علم سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد فقہی علم ہے؟

جواب: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے علم حاصل کرنا عورت اور مرد پر فرض ہے۔ حضور ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ اگر تم کو چین میں علم ملے تو چین میں جا کر حاصل کرو۔ دینی علم ہو یا دنیاوی علم دونوں کا سیکھنا ضروری ہے۔ قرآن پاک میں جو علوم اللہ تعالیٰ نے بیان کئے ہیں اس کے تین درجے ہیں۔

قرآن پاک کا ایک حصّہ ان علوم سے متعلق ہے جو پیدائش سے پہلے کی زندگی سے متعلق ہیں یعنی آدمی پیدا ہونے سے پہلے کہاں تھا اور پیدائش سے پہلے اس کے اوپر کیا کیفیات گزریں اور کن مراحل سے گزر کر وہ اس دنیا میں آیا۔ دوسرا حصّہ وہ ہے جب آدمی مر جاتا ہے تو مرنے کے بعد آدمی کہاں چلا جاتا ہے، کہاں رہتا ہے، مرنے کے بعد کی زندگی کیا ہے، حشر و نشر کیا ہے، حساب کتاب کیا ہے، جنّت دوزخ کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایک حصّہ قرآن پاک کا ان علوم سے بحث کرتا ہے جو ہماری پیدائش سے متعلق ہیں پیدائش کے بعد مرنے کے بعد کی زندگی سے متعلق ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی جنّت دوزخ اور حشر و نشر سے متعلق ہے۔ قرآن کا دوسرا حصّہ جو علوم ظاہر کرتا ہے وہ تاریخ ہے کہ یہ دنیا کیسے بنی اور اس میں کتنے پیغمبر تشریف لائے۔ قوموں نے اچھے کام کئے تو اس کے کیا نتائج مرتّب ہوئے اور لوگ دنیا میں کس طرح رہے۔ آیا کہ انہوں نے حیوانوں کی طرح زندگی گزاری جیسے گائے، بیل، بکری وغیرہ یا انہوں نے حیوانات سے ہٹ کر اس زمین کے اوپر اللہ تعالیٰ کی منشاء پر غور و فکر کیا اور اس غور و فکر کے نتیجے میں انہوں نے کیا ترقی کی۔ انہوں نے روحانی سائنسی علوم بھی حاصل کئے یا نہیں۔ سائنسی علوم میں تسخیر کائنات کے اصول ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم آسمانوں میں کس طرح داخل ہو سکتے ہیں؟ وہ کونسے علوم ہیں جن علوم کی بنیاد پر ہم چاند، سورج، ستاروں اور زمین کے اندر موجود چیزوں کو اپنے طابع حکم کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (قرآن کریم کی آیات ہیں) ''ہم نے

تمہارے لئے مسخر کر دیا تمہارے تابع کر دیا جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب'' یہ ان علوم سے متعلق ہے جو انسانوں کو معلومات فراہم کرتا ہے کہ حیوانات سے ممتاز ہو کر کس طرح زندگی گزارنی چاہئے۔ آپ کا رہن سہن کیا ہو، آپ لباس کیسا پہنیں، آپ کا لین دین کیسا ہو، آپ جھوٹ نہ بولیں، سچ بولیں اپنے ہمسایوں سے محبت کریں، اپنی اولاد کی صحیح تربیت کریں وغیرہ وغیرہ۔ اسی کا نام شریعت ہے۔ قرآن پاک تین حصوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ایک حصّہ زندگی سے متعلق ہے۔ وہ زندگی پیدائش سے پہلے کی ہو یا مرنے کے بعد کی۔ دوسرا حصّہ تاریخ، ان علوم کے اوپر ہے جن قوموں نے علوم حاصل کر کے ترقی کی ہے مثلاً یہ کہ آج کا دور سائنس کا دور ہے۔ اگر آپ پیچھے جائیں تو ہمارے اسلاف سارے کے سارے سائنٹسٹ تھے۔ انہوں نے گھڑی ایجاد کی، پانی کا جہاز مسلمانوں نے بنایا، زمین کی پیمائش مسلمانوں نے کی، دوربین مسلمانوں نے ایجاد کی وغیرہ وغیرہ۔ بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو مسلمانوں نے ایجاد کیں اور مسلمانوں کی ایجاد کو جب غیر مسلموں نے پڑھا، اس کو سمجھا، انہوں نے اس پر غور و فکر کیا نتیجہ میں مسلمان پیچھے رہ گیا اور وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ قرآن ریسرچ کی بھی دعوت دیتا ہے اور دوسرے یہ کہ آپ تاریخوں سے عبرت بھی حاصل کر سکتے ہیں مثلاً یہ کہ حضرت نوح علیہ السّلام کا واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ حضرت لوط علیہ السّلام کا قصہ آپ کے سامنے ہے۔ عاد و ثمود کی قوموں کا قصہ آپ کے سامنے ہے کہ اللہ کا عذاب آیا۔ لوگ بندروں کی شکل بن گئے، جوئیں اور پھر مینڈک کے عذاب میں مبتلا ہوئے۔ قرآن پاک آپ پڑھیں تو پوری تاریخ سامنے آ جاتی ہے۔ لوگوں نے جب اچھے کام کئے تو ان پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہُوا اور جب لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور پیغمبروں کی باتوں کو جھٹلایا تو ان کے اوپر سختیاں آئیں اور پریشانیاں آئیں اور نتیجہ میں عذاب میں گرفتار ہوئے۔

اس وضاحت سے یہ معنی نکلے کہ علم کوئی بھی ہو اس کو سیکھنا ہے۔ دین کا علم بھی سیکھنا ہے۔ دنیوی علوم بھی سیکھنے ہیں اور سائنسی علوم بھی سیکھنے ہیں مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ دین سے مراد یہ ہے کہ ہم فقہ کا علم سیکھ لیں۔ مسئلے مسائل حل کر لیں اور دنیا کا علم نہ سیکھیں یہ کہ موچی کا کام نہ سیکھیں، موچی کا کام بھی ایک علم ہے مثلاً یہ کہ لوہار کا کام

نہ سیکھیں، لوہار کا کام بھی ایک علم ہے، بڑھئی کا کام نہ سیکھیں، یہ بھی ایک علم ہے تو اگر یہ سب علوم ہم نہیں سیکھیں گے تو نوعِ انسان کی زندگی پریشان کن ہو جائے گی اور وہ آرام و آسائش کی زندگی سے نکل جائے گی۔ علم کوئی بھی ہو ہمیں سیکھنا ہے۔ علم کا سیکھنا ہماری ضرورت، ہمارا فرض ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد پر علم سیکھنا فرض ہے اور علم چاہے آپ کو چین میں ملے تو وہاں سے سیکھیں۔ ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں لوگ فقہ اور شریعت کا علم سیکھنے کیلئے چین تو نہیں گئے ہوں گے۔ قرآن بھی نہیں سیکھنے گئے ہوں گے، حدیث بھی نہیں سیکھنے گئے ہونگے۔ چونکہ اس زمانے میں چین سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اُس زمانے میں چین نے کاغذ ایجاد کر لیا تھا۔ اُس زمانے میں چین نے روشنائی ایجاد کر لی تھی چونکہ چین ایک ترقی یافتہ ملک تھا۔ ساری دنیا میں علم کے لحاظ سے اس کی ایک ممتاز حیثیت تھی اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا:

"اگر چین میں علم ملے تو وہاں جا کر سیکھو۔"

سلطان کیا ہے؟

سوال: اے گروہ جنّات اور انسان اگر تم نکل سکتے ہو تو آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل کر دکھاؤ، تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان کے ساتھ۔ (قرآن)۔ سلطان کیا ہے اور ہم اس کو کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟

جواب: سورہ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں"

اے گروہ جنّات اور اے انسانوں کے گروہ تم اگر زمین اور آسمانوں کے کناروں سے نکل سکتے ہو تو نکل کر دکھاؤ۔ اگر تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے باہر جا سکتے ہو تو جا کر دکھاؤ تم زمین اور آسمانوں کے کناروں سے باہر نہیں جا سکتے مگر سلطان کے ساتھ۔"

اس آیتِ مبارکہ میں بہت زیادہ غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک صورت اور ایک صلاحیت انسانوں کے اندر ایسی ہے کہ اگر وہ اس صلاحیت کو تلاش کر لیں اور اپنے اور Aura کو بیدار اور متحرّک کر لیں تو انسان غیب کی دنیا میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بات ثابت ہے کہ اگر انسان کو سلطان حاصل ہو جائے تو وہ غیب کی دنیامیں داخل ہو جاتا ہے۔آسمانوں اور زمین کے کناروں سے تم نکل سکتے ہو...آسمانوں کے کناروں سے نکلنا کیا معنی رکھتا ہے؟ صورتال یہ ہے کہ کناروں سے باہر خلاء ہے۔ جو چیز نظر نہیں آتی یا جس چیز کے بارے میں ہمیں علم نہیں ہے وہ غیب ہے۔ جو کچھ زمین کے کناروں سے باہر اور آسمانوں میں ہیں۔ غیب میں سات آسمانوں کے کناروں کے بعد عرش ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ اگر وہ سلطان حاصل کر لے تو زمین اور آسمانوں سے نکل کر عرش اس کے سامنے آجاتا ہے۔ عرش پر اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔اس کا مفہوم یہ نکلا کہ ہر بندہ اللہ کو دیکھ سکتا ہے۔ کچھ لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی کیسے دیکھ سکتا ہے جبکہ موسیٰ علیہ السّلام تجلی دیکھ کر بیہوش ہو گئے، وہ نہیں دیکھ سکے تو ایک عام آدمی کیسے دیکھ سکتا ہے! پہلی بات تو یہ کہ موسیٰ علیہ السّلام نے کچھ نہیں دیکھا تو وہ بیہوش کیسے ہو گئے؟ بہت زیادہ غور طلب بات ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ضرور لیکن موسیٰ علیہ السّلام کا شعور اسے برداشت نہ کر سکا اس لئے بیہوش ہونا اس بات کی علامت ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام نے اس تجلی کا دیدار کیا لیکن برداشت نہیں کر سکے۔ آپ ۱۰۰ واٹ کا بلب دیکھتے ہیں اور دیکھنے کے عادی ہیں اور ایک دَم آپ کے سامنے ۵۰۰۰ واٹ کا بلب روشن کر دیا جائے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ آپ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آجائے گا۔ لیکن پھر وہی بلب اگر آپ بار بار دیکھیں گے تو آپ دیکھ لیں گے۔ موسیٰ علیہ والسّلام جب بھی اللہ تعالیٰ سے بات کرتے تھے تو کوہِ طُور پر تشریف لے جاتے تھے۔اللہ تعالیٰ کی باتیں سنتے تھے لوگوں کے پیغام لے جاتے تھے، لوگوں کے جوابات لاتے تھے۔ ۴۰ رات اور ۴۰ دن انہوں نے کوہِ طُور پر قیام کیا اور تورات کتاب لائے۔اِس بارے میں قرآن کریم کی آیات۔ پہلے آسمان ہے اور پھر زمین ہے تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان کے ذریعے۔

سلطان کیا ہے؟

سلطان انسان کے اندر اس کی اپنی روح ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، پیدا کرنے کے بعد خود اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو انسان سے متعارف کرانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا۔" اَلَسْتُ بِرَبِّکُم "میں تمہارا ربّ ہوں۔ جب انسانوں کے ذہن میں یہ آواز پڑی کہ میں تمہارا ربّ ہوں تو سارے انسانوں کے ذہن اُس طرف متوجہ ہو گئے کہ یہ بولنے والی ہستی کون ہے؟ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟ جب انسان اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اُن کے سامنے موجود ہے تو انہوں نے دیکھ کر کہا۔"قَالُوا بَلٰی"۔ جی ہاں آپ ہمارے ربّ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عالمِ ارواح میں ہماری روح نے اللہ تعالیٰ کی آواز بھی سنی اور اللہ تعالیٰ کو دیکھا بھی اور اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار بھی کیا۔ پس ثابت ہوا کہ ہماری روح اللہ تعالیٰ کو پہلے سے دیکھے ہوئے ہے اور پہلے سے جانتی ہے۔ اگر ہم اس روح کو تلاش کر لیں جس نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا اور اللہ تعالیٰ کی آواز سنی تھی اور اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا تھا تو ہمارے اندر وہ صلاحیت منتقل ہو جائے گی اور اس صلاحیت ہی کا نام تو اللہ تعالیٰ نے سلطان رکھا ہے۔ سلطان سے یہ مراد ہے کہ اگر تم اپنی روح کو تلاش کر لو اور اس روح کو جس روح نے عالمِ ارواح میں ہماری ربوبیت کا اقرار کیا ہے تو تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل سکتے ہو۔

مٹھاس یا نمک

سوال: کتاب جنّت کی سیر میں مراقبہ کے بارے میں پرہیز اور احتیاط کے سلسلہ میں پہلا لفظ بیان کیا گیا ہے کہ روحانی ترقی کیلئے مٹھاس کم سے کم استعمال کی جائے مگر آپ اکثر مٹھاس زیادہ استعمال کراتے ہیں اور نمک کم استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس کی وضاحت کریں۔

جواب: روحانی ڈائجسٹ میں ہم بیماریوں کا علاج اور مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہم جہاں یہ بتاتے ہیں کہ نمک کم سے کم کر دیا جائے وہ روحانی تسکین کیلئے نہیں کہتے بلکہ نفسیاتی مریض کیلئے مشورہ دیتے

ہیں دماغی مریض، نفسیاتی مریض، پاگل پن کے مریض، اُن کے لئے ہم کہتے ہیں کہ نمک کم کر دو اور مٹھاس زیادہ کر دو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مٹھاس انسان کے زمینی شعور کو طاقت پہنچاتی ہے۔ اگر مٹھاس کم ہو جائے تو انسان کا زمینی شعور کمزور ہو جاتا ہے۔ جب شعور کمزور ہو جاتا ہے تو بسا اوقات اسے ماورائی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ ماورائی دنیا نظر آنے لگتی ہے۔ وہ اس آواز کے اپنے حساب سے معانی پہناتا رہتا ہے چونکہ عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ ایک قسم کا پاگل پن بن جاتا ہے جتنا کوئی آدمی مٹھاس زیادہ کھاتا ہے اسی مناسبت سے اس کے زمینی شعور میں کشش ثقل زیادہ ہو جاتی ہے اور پھر وہ دنیاوی زندگی زیادہ اچھی گزارتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کے اندر نمک کی زیادتی ہو جائے تو اس کا شعور کمزور ہو جاتا ہے اور لاشعور متحرّک ہو سکتا ہے۔ لاشعور متحرّک (Active) ہونے سے دنیاوی کام میں خلل پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے کوئی استاد تو ہوتا نہیں ہے وہ اس میں اپنے ہی آپ معنی پہناتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے لئے پریشانی خرید لیتا ہے اور گھر والوں کے بھی عذاب بن جاتا ہے۔ دماغی امراض، ٹینشن، ڈپریشن (اگر لو بلڈ پریشر نہ ہو) مرگی ہائی بلڈ پریشر، برص، استقیٰ، جلدی امراض، بے خوابی اور شیزوفرینیا میں نمک کا زیادہ استعمال بہت زیادہ مضر ہے۔ معالج کے مشورہ سے نمک کے استعمال میں احتیاط کرنا ضروری ہے۔

خیالی اور حقیقی خواب

سوال: خیالی خواب اور حقیقی خواب میں کیا فرق ہے نیز یہ کہ انسان جب کسی کے بارے میں مسلسل سوچتا رہتا ہے تو وہ خیال کی صورت میں خواب میں نظر آ جاتا ہے۔ اگر رجحان اچھی باتوں کی طرف ہے تو جو خواب دیکھتا ہے اس کو اچھا کہا جاتا ہے لیکن جب برے خیال خواب بنتے ہیں تو اس کو برا کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ وہ بھی خیال ہوتا ہے۔

جواب: کائنات میں کوئی بھی خیال کوئی بھی واہمہ اور کوئی بھی تصوّر بے معنی نہیں ہے۔ ہر خیال کے دو قسم کے معنی نکلتے ہیں۔ اس خیال میں رحمانی قدروں سے متعلق معنی ہوتے ہیں، یا خیالات شیطانی قدروں سے متعلق ہوتے ہیں۔ علوم کی دو قسمیں ہیں۔ شیطانی علوم، اور رحمانی علوم۔

جتنے بھی پیغمبر اس دنیا میں تشریف لائے، حضور ﷺ تک انہوں نے ایک ہی بات کہی ہے کہ رحمانی علوم سیکھنے کے بعد ان پر عمل کرو تاکہ تم رحمان سے قریب ہو جاؤ۔ شیطانی علوم نہ سیکھو اور شیطانی علوم پر عمل بھی نہ کرو اس لئے کہ اگر تم نے شیطانی علوم پر عمل کیا تو شیطان سے قریب ہو جاؤ گے۔ ظاہر ہے کہ جو بندہ شیطان سے قریب ہو جائے گا وہ رحمان سے دور ہو جائے گا اور جو بندہ رحمان سے قریب ہو جائے گا وہ شیطان سے دور ہو گا۔

خواب و خیال کی بات جو آپ نے پوچھی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان کے ذہن میں ۲۴ گھنٹے ایک ہی خیال رہتا ہے ''پیسہ، پیسہ، پیسہ'' اس کو پیسہ کی ہوس ہے تو خواب میں وہ دولت ہی دیکھے گا اور ایک آدمی کے ذہن میں اللہ کی محبت پیغمبروں کی تعلیمات، اولیاء اللہ کی محبت ہو گی تو وہ ہر وقت اسی خیال میں رہتا ہے کہ اس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت مل جائے۔ حضور ﷺ کا قرب نصیب ہو جائے۔ حضور ﷺ کی زیارت ہو جائے تو اس کے خواب بھی پاکیزہ ہوں گے۔ پیغمبروں نے شیطینت کو رد کیا ہے اور شیطانی خیال سے دور رہنے کی ہدایت کی ہے اور اللہ تعالی سے قریب ہونے کیلئے اور رحمانی علوم سیکھنے کیلئے پوری نوعِ انسانی کو دعوت دی ہے۔ خواب کی دو طرزیں ہیں۔ ایک یہ کہ جو خیالات ہر وقت ذہن میں گشت کرتے رہتے ہیں وہ مسخ صورت ہو کر نظر آ جائیں۔ دوسری یہ کہ عالم بالا میں جو پاکیزہ خیالات گشت کر رہے ہیں وہ نظر آ جائیں۔ مسخ صورت خواب رویاءِ کاذبہ اور حقیقی خوابوں کو رویاءِ صادقہ کہا جاتا ہے۔

دعا آسمان سے کیوں پھینکی جاتی ہے؟

سوال: جنّت کی سیر میں سعیدہ خاتون عظیمی نے ایک جگہ خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ فرشتے جن دعاؤں کو مقبولیت کے قابل نہیں سمجھتے اسے آسمان سے پھینک دیتے ہیں جبکہ ارشاد خداوندی ہے کہ لوگو مجھے پکارو، میں سنوں گا، مجھ سے دعا مانگو میں دونگا۔ انسان خدا سے دعا کے ذریعہ مانگتا ہے۔ دعا کے ذریعہ خدا کو پکارتا ہے تو فرشتے دعا کو قابل قبول کیوں نہیں سمجھتے، آسمان سے کیوں پھینک دیتے ہیں؟

جواب: بات سیدھی ہے کہ ہر چیز کے آداب اور اصول ہیں۔ دعا مانگنے کے بھی آداب ہیں۔

کچھ بھی مانگنے کے اصول ہیں مثلاً بیٹا باپ سے کہے کہ ’’ابے ابّا ! پیسے نکال‘‘۔ ابّا اسے پیسے نہیں دیں گے بلکہ تھپڑ ماردیں گے اور کہیں گے کہ دُور ہو جاؤ، دفع ہو جاؤ اور اگر وہی بیٹا یہ کہے کہ ابّا جی مجھے پیسے چاہئیں، مجھے پیسوں کی ضرورت ہے تو ابّا دو روپے کی بجائے اسے ۵ روپے دے دیں گے۔ موجودہ دور میں جو دعائیں مانگی جاتی ہیں آپ اس پر ذرا غور کریں کہ اس کے اندر نہ گداز ہوتا ہے نہ عاجزی ہے نہ انکساری ہوتی ہے بلکہ ایک آرڈر ہوتا ہے کہ اللہ میاں یہ کر دے، اللہ میاں یہ کر دے، اس میں نہ ادب ہے نہ احترام ہے، نہ گداز ہے نہ یقین ہے تو وہ دعائیں فرشتے آسمان سے نیچے نہیں پھینکیں گے تو کیا کریں گے؟

میں ۶۰ سال سے ایک بات سنتا ہوا آرہا ہوں کہ یا اللہ بنی اسرائیل کا بیڑہ غرق کر دے۔ حج میں بھی یہ دعا ہوتی ہے، ہر مسجد میں یہ دعا ہوتی ہے، ہر مدرسہ میں یہ دعا ہوتی ہے اور لاکھوں، کروڑوں آدمی آمین کہتے ہیں لیکن یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ ۶۰ سال تو ہو گئے ہم کو سنتے ہوئے جتنا دعا مانگتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا بیڑہ غرق ہو جائے اتنا ہی بنی اسرائیل کا عروج ہو رہا ہے۔ آخر کیا مطلب ہے؟ ۶۰ سال کیا کسی دعا کے قبول ہونے کیلئے کم وقت ہے؟ کروڑوں مسلمان یہ دعا مانگ رہے ہیں کہ بنی اسرائیل کا بیڑہ غرق ہو جائے مگر بنی اسرائیل کا بیڑہ غرق نہیں ہوتا جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: مجھ سے مانگو میں دونگا میں قبول کروں گا، تم دعا مجھ سے مانگو تو سہی... جب آپ دعا کے آداب ہی پورے نہیں کرتے، اللہ کے اوپر یقین ہی نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ زبانی جمع خرچ کو نہیں مانتا۔

قرآن کریم میں ہے اعمال سے قوموں کی تقدیروں میں ردّ و بدل ہوتا ہے اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ہمارے اعمال ہی قرآن کے مطابق نہیں ہیں۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے مگر وہ جھوٹ بولتا ہے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ کسی کی دل آزاری کرنا بہت بڑا پاپ ہے لیکن ہر شوہر بیوی کی دل آزاری کر رہا ہے، ہر بیوی شوہر کی دل آزاری کر رہی ہے، ماں باپ بچوں کی دل آزاری کر رہے ہیں۔ آپ غور تو کریں کہ معاشرہ میں کس قدر برائیاں داخل ہو گئی ہیں۔ اس معاشرہ میں کیسے آپ کی دعا قبول ہو گی؟ کس بات پر آپ اللہ تعالیٰ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپ کی دعا قبول کریں گے؟ مسلمان ہر وہ کام کر رہا ہے جو رسول اللہ ﷺ کو ناپسند ہے، جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے

بلاشبہ اللہ ان کی دعا قبول کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ سب کی دعائیں رد ہو جاتی ہیں۔ جن لوگوں کا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرتا ہے۔

میرا بیٹا اسلام عارف عظیمی بتا رہا تھا کہ جامع مسجد راولپنڈی میں ایک مولوی صاحب تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے دعا کرائی یا اللہ ایسا کر کہ بنی اسرائیل کا بیڑہ غرق کر دے، ایسا کر کہ کفار اس دنیا سے نیست و نابود ہو جائیں۔ جوش خطابت میں کہنے لگے کہ یا اللہ بنی اسرائیل کی توپوں میں کیڑے ڈال دے...یعنی توپ کو اللہ انسان بنا دے، آٹا بنا دے اور اس میں کیڑے ڈال دے۔ یہ کتنی بڑی بے ادبی اور گستاخی ہے کہ آدمی کو یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ میں کس کے سامنے کھڑا ہوں اور کیا مانگ رہا ہوں تو دعا کیسے قبول ہو گی؟ دعا وہی رد ہوتی ہے جس کے ساتھ گداز نہ ہو جس کے ساتھ دلی تعلق نہ ہو اور جس کے ساتھ یقین نہ ہو۔ اگر دعائیں گداز ہیں اگر دعا میں آپ کا دل شامل ہے اگر دعا کے ساتھ ساتھ یقین ہے تو دعا ضرور قبول ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خالی دعا کو نہیں مانتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پہلے عمل کرو پھر دعا کرو پھر قبول کرونگا۔ حضور ﷺ کی زندگی ہمارے سامنے ہے حضور ﷺ نے پہلے عمل کیا پھر دعا فرمائی۔ آپ ﷺ کو جتنے مجاہد میسر آئے انہیں لے کر میدان میں جہاد کیلئے تشریف لے گئے۔ پھر عرض کیا کہ اے میرے اللہ میں اتنے بندے ہی لا سکتا تھا۔ اب آپ ہماری مدد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کر کے فرشتے نازل کر دیئے...تو بغیر عمل کے دعا قبول نہیں ہوتی۔ عمل کے ساتھ ساتھ گداز ہونا چاہئے، یقین ہونا چاہئے تو ایسی دعائیں قبولیت کے درجہ پر فائز ہوتی ہیں۔

باب پنجم

مرشد کس طرح فیض منتقل کرتا ہے؟

سوال : فیض سے کیا مراد ہے؟ مرشد جب اپنے مرید کو فیض منتقل کرتا ہے تو وہ کیا چیز منتقل کرتا ہے؟ کیا اس کا تعلق ماورائی لہروں سے ہے۔ ماورائی لہریں اگر منتقل ہوتی ہیں تو مرید کے اوپر کس قسم کے تاثرات قائم ہوتے ہیں؟

جواب: دوسرے علوم کی طرح روحانیت بھی ایک علم ہے۔ کوئی بھی استاد اپنے شاگرد کو علم منتقل کرتا ہے، جس طرح دنیاوی علوم کا استاد کسی کو اپنا علم منتقل کرتا ہے۔ اسی طرح روحانی استاد اس کا نام پیر و مرشد ہو اس کا نام روحانی استاد ہو، بہر حال وہ روحانی استاد ہے۔ جس طرح دنیاوی علوم استاد اپنے شاگرد کو منتقل کر دیتا ہے اسی طرح روحانی استاد روحانیت منتقل کر دیتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دنیاوی علوم میں استاد کی جو طرزِ فکر ہے اس سے آدمی کافی حد تک متاثر ہوتا ہے اپنے استاد کی جو طرزِ فکر ہے اس کو قبول کر کے اس کے مطابق چلتا ہے لیکن جب روحانی استاد یا روحانی شاگرد کا تذکرہ آتا ہے اور کوئی روحانی استاد روحانیت منتقل کرتا ہے تو استاد کی طرزِ فکر منتقل ہو جاتی ہے مثلاً ایک روحانی آدمی کیلئے ضروری ہے کہ اس کا توکل اللہ کے اوپر ہو اس کے اندر استغناء ہو، جب اچھے حالات ہوتے ہیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور جب وہ خراب حالات سے گزرتا ہے تو اللہ سے رجوع کرتا ہے، اللہ سے معافی مانگتا ہے، استغفار کرتا ہے اور یہ بھی سوچتا ہے کہ اس میں بھی کوئی بہتری ہے۔ اب جو پریشانی لاحق ہے اس میں بھی اللہ کی طرف سے بہتری ہے، لیکن ہم کمزور ہیں، ضعیف ہیں، ان پریشانیوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ ہمیں معاف کر دیں۔ ہمارے لئے اچھا راستہ کھول دیں۔ مقصد یہ ہے کہ روحانیت ایک طرزِ فکر ہے اور روحانی علوم کا تعلق طرزِ فکر سے ہے اور وہ طرزِ

فکر یہ ہے کہ روحانی آدمی کا ذہن ہمہ وقت اللہ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ تمام پیغمبروں کی تعلیمات پر اگر غور کیا جائے اور الہامی کتابوں کا خلاصہ بیان کیا جائے تو ایک ہی حقیقت سامنے آئے گی کہ :

بندے کا اللہ کے ساتھ ایک رشتہ ہے۔ ایک تعلق ہے، بندہ مخلوق ہے اور اللہ خالق ہے۔ جب بندے اور اللہ کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے تو بندہ اپنے ہر عمل کو اللہ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ مثلاً اگر وہ کھانا کھاتا ہے تو کھانا کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو وسائل مہیا کیے۔ پہلے اچھا کھانا کھایا پھر یہ کہ اللہ نے مجھے اچھا ہاضمہ دیا یہ نہیں ہُوا کہ میں کھانا کھا کر قے کر دوں، کھانا کھا کر اسہال ہو جائے۔ مطلب یہ کہ کھانا میں نے کھایا وہ پیٹ میں رہا اور ہضم ہوا۔ اس کا خون بنا، خون سے انرجی بن کر جسم میں دوڑ رہی ہے۔ وہ مسلسل غور و فکر، صبر و شکر کے اعمال سے یہ جان لیتا ہے کہ زندگی میں بندے کا اپنا ذاتی عمل دخل کچھ نہیں ہے۔ ایک آدمی کھانا کھاتا ہے اگر اندر کی مشینری بند ہو جائے، اگر آنتیں چلنا بند ہو جائیں تو کھانا ہضم نہیں ہو گا۔ بندے کی یہ طرزِ فکر بن جاتی ہے کہ انسان دروبست اللہ کے تابع ہے اور جو بھی کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کر رہا ہے اور جو بھی کچھ اس کو مل رہا ہے وہ اللہ کی طرف سے مل رہا ہے۔ متقی لوگوں کی یہ پہچان ہے، جن کا ایمان مکمل ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہے سب ہمارے ربّ کی طرف سے ہے۔ (سورۃ آلِ عمران—آیت نمبر 7)

اگر اللہ بارش نہ برسائے، زمین نہ بنائے، اللہ دھوپ نہ نکالے، اللہ چاند نہ نکالے، اللہ زمین میں پانی نہ پیدا کرے تو زمین میں کوئی چیز اُگ ہی نہیں سکتی۔ آپ زمین نہیں بنا سکتے۔ آپ پانی نہیں بنا سکتے، آپ بیج نہیں بنا سکتے۔ اگر گیہوں کا بیج زمین سے ناپید ہو جائے تو بتائیں کون سی ایسی سائنس ہے جو بیج بنا دے گی۔ جو بھی چیز آپ استعمال کرتے ہیں وہ بہر حال قدرت کی پیدا کردہ ہو گی۔ ہم زمین کی پیداوار بڑھانے کیلئے کھاد استعمال کرتے ہیں۔ اگر قدرت زمین میں وہ چیزیں پیدا نہ کرے جن سے کھاد بنتی ہے تو کھاد کیسے بن سکتی ہے؟

مثلاً آپ اپنی مرضی سے پیدا بھی نہیں ہو سکتے۔ اگر اللہ نہ چاہے، کون آدمی پیدا ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالی پیدائشی پاگل پیدا کر دے، کون سا ایسا علاج ہے جو پاگل پن کو صحیح کر دے؟ پاگل پن کا کوئی علاج ہی نہیں ہے۔ نئی نئی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، مثلاً کینسر، کینسر کا ابھی تک علاج ہی دریافت نہیں ہوا ہے۔ اتنے بڑے بڑے سائنٹسٹ ہیں وہ کہتے ہیں، ہم چاند پر چلے گئے، خلاء میں چہل قدمی کر آئے ہیں اور یہ ہو گیا۔ وہ ہو گیا۔ ان کے بڑے سارے مر گئے۔ وہ سائنسی ایجادات سے موت کے ہاتھ میں کیوں پنجہ نہ ڈال سکے؟ موت کو کیوں نہیں مار سکے؟ جب ہم غور کرتے ہیں اپنی زندگی پر زمین کی زندگی پر آئندہ مستقبل کے اوپر، ماضی کے اوپر، اِس کے سوا ہمیں کچھ نظر نہیں آتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اللہ کے حکم سے ہو رہا ہے اور اللہ کر رہا ہے۔ مثلاً جب بچہ پیدا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ماں باپ کے دل میں محبت ڈال دیتا ہے۔ اگر ماں کے دل میں اللہ محبت نہ ڈالے تو بچہ کی پرورش ہی نہیں ہو سکتی۔ ماں چاہے بلی ہو، بکری ہو، بھینس ہو، انسان کی ماں ہو، جنّ کی ماں ہو ... کسی کی بھی ماں ہو، ایک نظام ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس کی پرورش کیلئے اس کی نشو نما کیلئے اللہ ماں باپ کے دل میں محبت ڈال دیتا ہے۔ اگر اللہ ماں باپ کے دل سے محبت نکال لے تو کوئی بچہ پرورش نہیں پا سکتا، پیدائش سے پہلے اللہ ماں کے سینہ کو دودھ سے بھر دیتا ہے۔ اس میں ماں کون سا کردار ادا کرتی ہے دودھ بنانے میں؟ آپ جتنا بھی گہرائی میں تفکر کریں آپ کو ایک ہی بات نظر آئے گی کہ انسان کچھ نہیں کر رہا ہے، سب کچھ اللہ کر رہا ہے۔ یہ انسان کی نادانی ہے کہ انسان سمجھ رہا ہے کہ سب کچھ میں کر رہا ہوں۔ اچھا سب کچھ آپ کر رہے ہیں تو کاروبار میں نقصان کیوں ہوتا ہے؟ آپ بیمار کیوں ہوتے ہیں؟

حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا۔ آپ نے اللہ تعالی کو کیسے پہچانا؟ انہوں نے فرمایا کہ ارادوں کی ناکامی سے، جو میں نہیں چاہتا وہ ہوتا ہے اور جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں ہوتا۔ ارادہ تک تو آپ کو اختیار نہیں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ اپنی زندگی کا تجربہ کریں، بھوک ہے، بھوک خود لگتی ہے، کوئی آدمی بھوک پر کنٹرول حاصل نہیں کر سکتا کہ ساری زندگی روٹی نہیں کھاؤں گا، ممکن ہی نہیں ہے کھانا کھانا پڑے گا۔ کوئی آدمی ساری زندگی سو نہیں سکتا، اٹھنا پڑے گا، کوئی آدمی ساری زندگی بیدار نہیں رہ سکتا، سونا پڑے گا کوئی آدمی ساری زندگی بے کار نہیں بیٹھ سکتا، چلنا پڑے گا۔ کون

سا ایسا مقام ہے آپ کی زندگی میں، میری زندگی میں، زمین کی زندگی میں کہ ہم کہہ سکیں ہماری زندگی، ہماری اپنی ذاتی زندگی ہے؟ اس فلسفہ کو تو آپ عقلی توجیہ اور دلیل کے ساتھ بیان بھی نہیں کر سکتے۔ آپ نہیں کہہ سکتے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے محتاج نہیں ہیں مثلاً سائنسی ایجادات میزائل، ایٹم بم اور دوسری عام ایجادات ان کا تعلق کسی بھی شعبہ سے ہو، یہ ساری ایجادات چیزوں سے بنی ہیں جو پہلے سے موجود ہیں۔ اگر گندھک نہ ہو، نَوشادر نہ ہو تو بارود نہ بنے گا۔ آپ ایک پٹاخہ بھی نہیں بنا سکتے۔ کوئی سائنس دان زمین بنا کر دکھادے اور زمین کے اندر جتنی صلاحیتیں ہیں، جتنی معدنیات ہیں وہ بنا کر دکھادے۔ زمین کے اوپر پہلے سے موجود یورینیم دریافت ہوئی تو ایٹم بم بنا۔ اگر اللہ تعالیٰ زمین میں یورینیم نہ پیدا کرتے تو ایٹم بم نہیں بن سکتا تھا۔ اس میں لوہے کی ضرورت ہے۔ لوہا نہ ہو تو میزائل تو بڑی بات ہے آپ کیل بھی نہیں بنا سکتے۔ جتنی بھی کائنات میں چیزیں ہیں اور جتنی بھی ایجادات اور ترقی ہوئی ہے۔ آدم سے لے کر اب تک اس میں وسائل ضرور زیر بحث آئیں گے۔ زمینی وسائل کو اگر آپ نظر انداز کر دیں تو کوئی ایجاد ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ خود چاہتے ہیں کہ نئی نئی ایجادات ہوں، وہ خود دعوت دے رہے ہیں کہ سائنس دان وسائل استعمال کریں۔

قرآن پاک میں اللہ میاں کا یہ ارشاد پڑھیں کہ ہم نے لوہا اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ اب آپ دیکھیں آپ جہاں بیٹھے ہیں، یہاں آپ کو دس جگہ لوہا نظر آئے گا۔ چھت میں لوہے کا گاڈر، دروازہ میں کنڈی، چھپکا، کھڑکی میں گرل، کنویں کے اوپر ڈول کھینچنے کیلئے چرخی، پانی لیجانے کیلئے پائپ۔ زمین کھودنے کیلئے بیلچہ گیتی۔ کھرپا، باڑ، کانٹے کیل، لوہے کی بڑی ساری قینچی اور جناب لوہے سے مراد دھات ہے۔ اس میں المونیم بھی ہے، تانبا بھی ہے، پیتل بھی ہے۔ اگر تمام دھاتوں کا ایک نام لوہار کھ لیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ہر جگہ لوہے کا استعمال آپ کو ملے گا۔ ایٹم بم میں میزائل میں ریل کی پٹری میں پانی کے جہاز میں وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ خود کہہ رہے ہیں کہ میں نے جو وسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو تم استعمال کرو اور یہ وسائل اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ان کے استعمال سے انسان نئی نئی ایجادات کرے۔ غرض یہ کہ زمین پر کچھ بھی تخلیق ہو اللہ کے بنائے ہوئے وسائل سے ہی تخلیق ہوتی ہے۔

روحانی استاد جو علم منتقل کرتاہے وہ یہ ہے کہ بندہ کا اللہ تعالیٰ سے ایسا ربط اور تعلق قائم ہو جائے کہ بندہ بہترین غذا کھائے، بہترین لباس پہنے، بہترین گھر میں رہے، بہترین خوشبو، بہترین باغ لگائے۔ درختوں کے سائے میں طیور کی آواز سنے، ہوا سے جھومتے درختوں کے ساز سنے لیکن ذہن اللہ سے ادھر ادھر نہ ہو۔

مثال: آپ دن بھر کام کرتے ہیں، کھانا بھی کھاتے ہیں، چلتے بھی ہیں، گاڑی میں سفر کرتے ہیں، دفتر بھی جاتے ہیں لیکن دن کی روشنی سے آپ کا ذہن کبھی نہیں ہٹتا، اختیاری طور پر یا غیر اختیاری طور پر اگر دن کی روشنی سے آپ کا ذہن ہٹ جائے گا تو آپ کے سامنے تاریکی آجائے گی اور آپ نہ چل پھر سکیں گے، نہ پڑھ سکیں گے۔ رات ہوتی ہے رات کی تاریکی بھی ایک روشنی ہے، جتنے رات کے کام ہیں مثلاً سونا، آرام کرنا، ذہن کا سکون وغیرہ وغیرہ۔ اگر رات کی روشنی سے آپ کا ذہن ہٹ جائے گا تو آپ رات کے کام نہیں کر سکتے۔ ہماری زندگی کا تجربہ ہے کہ ہم دن میں رہتے ہوئے اختیاری طور پر اور غیر اختیاری طور پر روشنی سے الگ نہیں ہو سکتے تو اسی صورت میں جس اللہ نے روشنی بنائی ہے تو اس اللہ سے ہم کیوں ہم رشتہ نہیں رہ سکتے۔ دراصل یہ پریکٹس ہے اس بات کی کہ آپ کا ذہن یہ جان لے کہ میں روشنی میں چل رہا ہوں، روشنی میں کھا رہا ہوں، روشنی میں لکھ رہا ہوں، روشنی میں سو رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ روشنی ہمارے اوپر محیط ہے۔

روحانی استاد جو اپنے شاگرد میں ایسی طرزِ فکر منتقل کر دیتا ہے کہ وہ کچھ بھی کرے شادی کرے، بچوں کی تربیت کرے کاروبار کرے، جس طرح دن کی روشنی اس پر محیط رہتی ہے اور وہ سارے کام کرتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اس پر محیط ہو جاتا ہے اور قرآن پاک کی اس آیت کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ''اللہ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہیں۔''

دنیاوی علوم اور روحانی علوم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ روحانی استاد اگر اس کو روحانیت آتی ہے تو وہ مرید کو وہ طرزِ فکر منتقل کر دیتا ہے جس طرزِ فکر میں آپ کا اور اللہ کا براہِ راست رشتہ قائم ہے۔ آپ کچھ بھی کریں جہاں بھی جائیں، آپ کا ذہن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہٹے گا اور آپ کے اندر یہ طرزِ فکر منتقل ہو جائے گی تو ظاہر ہے آپ کو

اللہ تعالیٰ سے جتنی قربت منتقل ہو گی اتنے ہی آپ اللہ کے دوست بن جائیں گے۔ اللہ کے قریب ہو جائیں گے۔ دوستی کسے کہتے ہیں۔ دوستی کا مطلب ہے قربت اور دشمنی کا مطلب ہے دوری۔ جب آپ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو گئے تو اللہ کے دوست ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمادیا ہے کہ ''اللہ کے دوستوں کو غم و خوف نہیں ہوتا۔''

آپ کی زندگی جو دوزخ بنی ہوئی ہے اگر اللہ تعالیٰ سے قربت حاصل ہو جائے تو یہ ساری زندگی جنّت بن جائے گی۔ جنّت کیا ہے؟ جنّت کی خصوصیت یہ ہے کہ جنّت میں تجلی کا دیدار ہو گا۔ اگر جنّت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ ہو تو جنّت کا کوئی مصرف نہیں رہے گا۔ دوزخ اللہ تعالیٰ سے دوری کا نام ہے تو اس دنیا میں آپ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ سے آپ کا رشتہ اس طرح جڑ گیا کہ آپ کھا رہے ہیں تو اللہ آپ کے سامنے ہے جیسے دن کی روشنی آپ کے سامنے ہے۔ پہن رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کے سامنے ہے جیسے دن کی روشنی آپ کے سامنے ہے۔ آپ کاروبار کر رہے ہیں تو آپ کے سامنے اللہ ہے، جیسے دن کی روشنی یا رات کی تاریک روشنی آپ کے سامنے ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ہر آدمی اپنی جنّت دوزخ ساتھ لئے پھرتا ہے۔ مخلوق میں سے قریب ترین بندہ اللہ کا اگر کوئی ہوتا ہے تو وہ پیغمبر ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی طرزِ فکر جب آپ کو منتقل ہو گی تو آپ بھی اللہ تعالیٰ سے قریب ہو جائیں گے۔ روحانی استاد کا یہ بہت بڑا وصف ہے کہ وہ اپنے شاگرد کے اندر وہ طرزِ فکر منتقل کر دیتا ہے جو طرزِ فکر اس کو حضور ﷺ سے منتقل ہوئی ہے۔

کتنی نیند کرنی چاہئے؟

سوال: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے دن کام کرنے کیلئے اور رات آرام کیلئے بنائی ہے۔ آپ اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ لاشعور کو بیدار کرنے کیلئے نیند کم کرنی چاہئے۔ باباتاج الدینؒ رات کو مراقبہ کرتے تھے، رات میں جاگنے سے لاشعور بیدار ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص اس طرح کرے تو بیمار نہیں ہو گا؟ کہتے ہیں کہ لوگ رات میں عبادت

کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتے ہیں، کتنی نیند کرنی چاہئے؟ کس وقت سوئیں؟ کس وقت اُٹھیں؟ لاشعور کو بیدار کرنے کیلئے نیند کم کرنے سے بیمار تو نہیں ہونگے؟

جواب: نیند اور کھانے پینے کا تعلق عادت سے ہے مثلاً ایک آدمی خوراک ہے کہ وہ ۱٦ روٹیاں کھاتا ہے تو وہ ۱٦ روٹیاں کھاتا رہے گا، جسم اس کا پھیلتا رہے گا۔ایسے بھی لوگ آپ نے دیکھے ہوں گے کہ میں نے اپنے پیر و مرشد کو دیکھا وہ چھوٹی چھوٹی دو ٹکیاں...ایک ٹکیہ صبح اور ایک ٹکیہ شام کو کھاتے تھے۔ چلتے پھرتے تھے، کام کاج بھی کرتے تھے۔ نماز، روزہ، غسلخانہ جانا، اپنا چھوٹا موٹا کام کرنا، وہ سب کرتے تھے تو غذا کا جو مسئلہ ہے وہ ایسا ہے کہ اس کو جتنا چاہے بڑھالو اور جتنا چاہے گھٹالو۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ مجھے حیرت ہے کہ لوگ کھاتے ہیں اور مر جاتے ہیں یعنی وہ اتنا کھاتے ہیں کہ بیمار ہو جاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔اب یہی صورت حال نیند کی ہے جو غذا کی ہے ...کم کریں یا زیادہ کریں ...۱٦ روٹیاں کھائیں، ۴ روٹیاں بھی کھا سکتے ہیں۔دو صبح کھائیں دو شام کھائیں۔آپ کی صحت اچھی رہے گی۔آپ اپنی غذا کو کم بھی کر سکتے ہیں اور اعتدال سے ہٹ کر زیادہ سے زیادہ بھی کر سکتے ہیں۔یہی صورت حال نیند کی بھی ہے۔میں نے ایسے ایسے لوگ بھی دیکھتے ہیں جو ۱٦۔۱٦ گھنٹے سوتے ہیں ان کی کمر ہی نہیں دُکھتی۔تو اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے اپنی نیند بڑھالی اور ایسے بھی لوگ ہیں جو تین چار گھنٹے سوتے ہیں اور تین چار گھنٹے سونے کے بعد بڑے چاق و چوبند رہتے ہیں اور حاضر دماغ رہتے ہیں۔بہت کام کرتے ہیں خود میں جب شروع شروع میں کالم لکھتا تھا تو معمولاً ۱۹ گھنٹے روزانہ کام کرتا تھا۔یہ آپ کے جو خطوط آتے ہیں وہ میں سارے خود ہی کرتا تھا۔اب تو ماشاءاللہ مجھے بہت سارے لوگ مل گئے ہیں اُن سے بھی پورا نہیں ہوتا جبکہ میں اکیلا کر لیا کرتا تھا۔۱۹ گھنٹے میں، میں کبھی نہیں تھکا اس میں ذوق و شوق کا بھی حساب کتاب ہوتا ہے۔میرے پیر و مرشد حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے مجھ سے یہ فرمایا ہے کہ اللہ سے دوستی کرنی ہے تو مخلوق سے محبت کرو، خدمت کرو۔تو ذوق و شوق میں نیند کا کوئی غلبہ نہیں ہوتا تھا۔

اللہ تعالٰی نے حضور ﷺ سے فرمایا:

اے پیغمبر ﷺ! کمبل اوڑھنے والے۔

اللہ تعالٰی اپنے حبیب ﷺ کو نت نئے ناموں سے یاد کرتے ہیں اپنے محبوب ﷺ کو بڑے بڑے خطاب دیئے... کبھی حٰم کہہ دیا... کبھی یٰسین کہہ دیا ...یَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ... کہہ دیا ...یَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ... کہہ دیا، اپنے حبیب ﷺ کو

بھئی اپنے محبوب ﷺ کو جس طرح بھی یاد کریں!

اے پیغمبر ﷺ رات کو آدھی رات گزر جائے یا آدھی رات سے کم گزر جائے یا تھوڑی زیادہ گرزر جائے اٹھو اور اٹھ کر قرآن پڑھو...اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ نیند پر کنٹرول حاصل کریں۔ تو زیادہ سونا جو ہے ... جس طرح آدمی کم سونے سے بیمار ہوتا ہے یعنی اتنا کم سوئیں، ایک گھنٹہ ہی سوئیں، تو لازمی بیمار ہو جائیں گے۔ لیکن فرض کریں ایک آدمی کی نیند کا وقفہ ۵ گھنٹہ ہے اور وہ ۴ گھنٹہ سوئے تو بیمار نہیں ہو گا، عادت پڑ جائے گی اور ایک آدمی بالکل سوتا رہے تو وہ بیمار پڑ جائے گا۔ روحانی لوگ یہ کہتے ہیں کہ ۵ گھنٹہ سے زیادہ نہیں سونا چاہیئے۔

آدمی اگر ایک دم جاگنے کی پریکٹس شروع کر دے تو بیمار ہو سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ اگر پریکٹس کی جائے تو ۵ گھنٹے کی نیند انسان کی لئے کافی ہے۔ آدمی چست بھی رہتا ہے، خوش بھی رہتا ہے، صحت بھی اچھی رہتی ہے، بھوک بھی زیادہ لگتی ہے، آپ کبھی تجربہ کر لیں کہ کم سونے والے بندوں کو بھوک زیادہ لگتی ہے، کس لئے؟ اس لئے کہ جتنا کام کریں گے حرکت ہو گی، کھانا زیادہ ہضم ہو گا۔ اگر کسی چیز کو اعتدال سے ہٹ کر کیا جائے تو آدمی بیمار ہو جائے گا اور اگر کسی چیز کو اعتدال میں رہ کر کیا جائے، آہستہ آہستہ کیا جائے اور ساتھ یہ کہ اس کے پیچھے کوئی رہنما بھی ہو استاد بھی ہو تو اس میں کوئی اس کا نقصان بھی نہیں ہو گا تکلیف نہیں ہو گی۔ جس طرح زندگی کے دوسرے تقاضے پورے کرنے کیلئے

ہم اعتدال اختیار کرتے ہیں۔ اگر اسی صورت سے نیند کی کمی کر دیں، نیند کی کمی سے بلاشبہ لاشعور بیدار ہوتا ہے۔ نیند کی کمی اس حد تک کر لیں کہ جتنی ہمیں نیند کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں ۵ گھنٹہ نیند کی ضرورت ہے تو ٦ گھنٹے کیوں سوئیں؟ اگر ہمیں ٦ گھنٹے نیند کی ضرورت ہے تو ہمیں چاہئے کہ ٦ گھنٹے سوئیں، ۷ گھنٹے کیوں سوئیں؟ ان ۷ گھنٹوں میں دنیا کا کام کریں، مطالعہ کریں اللہ کے نام کو پھیلانے کیلئے تبلیغ کا کام کریں۔ دسیوں کام کر سکتے ہیں۔ آدمی اعتدال سے ہٹ کر کوئی بھی کام کرے گا بیمار ہو جائے گا۔ وہ نیند ہو، چاہے وہ کھانا ہو۔ کھانا آپ اعتدال سے ہٹ کر کھائیں گے بیمار ہو جائیں گے اور اگر اعتدال میں رہ کر کام کیا جائے تو وہ کام خوشی کا باعث بن جاتا ہے اور اس سے صحت مندی حاصل ہوتی ہے۔

کیا رنگین روشنیاں غذائی ضروریات پوری کرتی ہیں؟

سوال : کیا مادے کی بنیاد رنگین روشنیاں ہیں کیا ہم مختلف رنگوں سے کسی طرح پر غذا حاصل کر سکتے ہیں۔ کیا گندمی رنگ کی روشنیاں غذائی ضروریات پوری کریں گی؟

جواب: اگر گندم کے اندر دَور کرنے والی انرجی کی روشنیاں آپ معلوم کر لیں اور انہیں استعمال کرنا سیکھ لیں تو نتیجہ تو وہی ہو گا مگر سوال یہ ہے کہ آپ تو سائیکل کی بھی نقل کرتے ہیں جو قوم خرافات میں پڑی ہوئی ہے جس کے اندر ریسرچ اور تلاش نہیں ہے وہ روشنیوں کو کس طرح تلاش کرے گی؟

کائنات میں جتنی بھی اشیاء ہیں ان سب کی بنیاد روشنی ہے اور اس بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان فرمایا ہے کہ اللہ زمین اور آسمان کی روشنی ہے۔ اللہ نے یہ زمین اور آسمان اور اس کے اندر جو کچھ بھی ہے وہ روشنیوں سے تخلیق کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود نور ہیں یعنی روشنی ہیں تو جو کچھ بھی پروگرام دنیا کا بنا، ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سارا پروگرام اللہ کے ذہن میں موجود تھا۔ تو جب کائناتی پروگرام اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارا پروگرام نُورانیت اور روشنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذہن کے مطابق اس پروگرام کو ظاہر کرنا

چاہاتواللہ تعالیٰ نے کہا کہ ... کُن۔ نُور کے اندر سے نکلے ہوئے الفاظ بھی نُور ہوتے ہیں۔ روشنی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آواز کو نور اور روشنی کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ قرآن پاک کے قانون کے مطابق پوری کائنات روشنی ہے۔ اللہُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْض ...اس پورے رکوع میں اس کی وضاحت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پورے رکوع میں پورا روشنی کا فارمولا بیان کیا ہے۔ روشنی کس طرح بنی روشنی کیا ہے، انسان کے اوپر روشنیوں کے کتنے پرت ہیں، کتنے غلاف ہیں اور پھر روشنی میں ایک طرف گرمی ہے اور ایک طرف ٹھنڈک ہے ...نُّورٌ عَلَىٰ نُورٍ (سورۃالنّور—آیت نمبر 35)..... قرآن کریم کی آیت۔۔۔۔۔۔ کہ وہ نور کے اوپر نور ہے۔ غلاف در غلاف آدمی روشنی کا بنا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس نُور کو دِکھا بھی دیتا ہے۔

اب گندم کی روشنیاں کوئی آدمی معلوم کرے اور ان روشنیوں کو کسی بھی صورت سے اپنے اندر داخل کرے تو آدمی کی غذائی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ یہ میرا اپنا تجربہ بھی ہے۔ کچھ عرصہ تک آدمی بغیر کھانا کھائے رہ سکتا ہے۔ اگر آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ سیب کتنی روشنیوں سے بنا ہوا ہے اور مشاہداتی طور پر وہ بات آپ کو نظر بھی آ جائے کہ سیب اتنی روشنیوں سے بنا ہوا ہے تو آپ اس سیب کی روشنیوں کو اپنے اندر جذب کر کے اپنے اندر منتقل کر کے سیب سے غذائیت حاصل کر سکتے ہیں۔ سیب بذات خود کچھ نہیں... سیب روشنی ہے۔ آدمی گندم کھاتا ہے فُضلہ نکل جاتا ہے۔ اصل میں گندم جن روشنیوں کا بنا ہوا ہے وہ روشنیاں ہمیں انرجی فراہم کرتی ہیں۔ انسان روشنیوں کا بنا ہوا ہے۔ روحانی لوگ جسے جسمِ مثالی کہتے ہیں۔ سائنسدان اسے اَورا Aura کا شَیڈو (Shadow) کہتے ہیں۔

روشنی روشنی کو کھاتی ہے اگر آدمی آدھا کلو گرام گندم روزانہ کھاتا ہے تو اس نے ایک ماہ میں پندرہ کلو گرام گندم کھایا ہے۔ تو سال بھر ایک سو اسی ۱۸۰ کلو گندم اس کی غذا بنی جبکہ سال بھر میں اس کا وزن اتنا نہیں بڑھا۔ اگر آپ فُضلہ کا وزن کریں تو ایک ماہ میں فُضلہ پندرہ کلو گرام نہیں ہوتا۔ قانون یہ ہے کہ آدمی Quantitiy نہیں کھا رہا ہے بلکہ روشنی کھا رہا ہے۔

قرآن تسخیر کائنات کی دستاویز ہے۔ یہ المیہ ہے کہ ہم تسخیری فارمولے معلوم کرنے کے لئے قرآن نہیں پڑھتے۔ یہاں تو مسئلہ یہ ہے کہ ہر مسلمان گروہوں میں بٹ گیا ہے۔ کوئی دیوبندی ہے، کوئی بریلوی ہے، کوئی اہلحدیث

ہے اور پتہ نہیں کیا کیا ہے اور ہر فرقہ کے دانشور قرآن پاک کو اپنے تفرقہ میں استعمال کر رہے ہیں۔ تفرقہ بازی میں استعمال ہونے کی وجہ سے مسلمان قرآن پاک کے اندر سے قرآن کریم کی حکمتوں سے اور قرآنی فارمولوں سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی رسی کو مضبوطی سے متحد ہو کر ایک جگہ جمع ہو کر پکڑ لو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ لیکن اب اسلام صرف نام ہی تفرقہ کا ہے۔ دیوبندی حضرات بریلوی حضرات کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ بریلوی حضرات دیوبندی علماء کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور جتنے فرقے ہیں ہر فرقہ اپنے آپ کو جنّتی اور دوسروں کو دوزخی کہتا ہے حالانکہ کسی کو پتہ نہیں ہے کہ کون جنّتی ہے اور کون دوزخی ہے۔ یہ تو اللہ میاں فیصلہ کریں گے کہ کون جنّتی ہے اور کون دوزخی ہے۔ ابھی یوم حساب قائم نہیں ہوا ہے۔ یوم میزان نہیں ہوا تو کون کہہ سکتا ہے کہ کون جنّتی ہے، کون دوزخی ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا اپنا فیصلہ ہے کہ وہ کس کو جنّتی اور کس کو دوزخی قرار دیتے ہیں۔

ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم فرقوں میں جنّت دوزخ کو بانٹ رہے ہیں تو جب ہم قرآن پڑھیں گے نہیں اور قرآن کے اندر تسخیری فارمولے تلاش نہیں کریں گے تو قرآن کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنے فارمولے آپ کے اوپر ظاہر کرے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ میں نے ساری دنیا میں جو کچھ بھی ہے مقداروں کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ ہومیوپیتھک کی اتنی سی گولی ہوتی ہے، خشخاش کے برابر اس گولی کی طاقت ایک لاکھ ہو جاتی ہے۔ کہاں سے اس میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی اگر Matter میں سبھی کچھ ہے تو ہومیوپیتھک کی ایک لاکھ کی طاقت کی اتنی چھوٹی گولی آپ کے جسم میں کیسے تبدیلی کر دیتی ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ quantity کی حیثیت نہیں ہے۔ آپ جب گیہوں کھاتے ہیں تو جو مقداریں اللہ تعالیٰ نے گیہوں کے اندر متعیّن کر دی ہیں وہ آپ کھاتے ہیں۔ روحانی آدمی کو ابتدائی تعلیمات میں یہ بتایا جاتا ہے کہ گیہوں کیسے بنا؟ روحانی استاد اپنے شاگرد کو یا مرید کو مشاہدہ کراتا ہے کہ گیہوں کا ایک دانہ ہے، استاد اس کو بڑا کرتا ہے، جتنا بڑا ہو جاتا ہے تو ایک گیہوں کا دانہ امرود کے برابر ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اس سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ استاد کے ہاتھ پر امرود کے برابر ایک گیہوں کا دانہ رکھا ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں دیکھو کہ مقداریں کتنی ہیں؟ اس میں مٹھاس کتنی ہے؟ اس میں نشاستہ کتنا ہے؟ اس میں بُھر بُھرا پن کتنا ہے؟ اس کے اندر رنگ کتنے ہیں؟ اگر رنگ ۴ ہیں تو سات رنگوں (مقداروں) میں پھیلنے کی صلاحیت کتنی ہے؟ اس کے اندر پانی جذب کرنے کی کتنی صلاحیت ہے؟ استاد اس کے

بعد دکھاتا ہے کہ روٹی بنانے کے لئے آگ برداشت کرنے کے لئے اس کے اندر کتنی صلاحیت ہے۔ ساری مقداریں مشاہدہ کرا کے زمین کے اندر گیہوں کا دانہ ڈال دیا جاتا ہے۔ شاگرد کو پتہ چل جاتا ہے کہ گیہوں کوئی چیز نہیں بلکہ۔۔۔۔۔اصل چیز اُس کی مقدار ہے۔

مقدار سے مراد یہ ہے کہ ہم نے یہ سمجھ لیا ہے مٹھاس کی ایک مقدار ہے تو روحانی لوگ کہتے ہیں کہ مٹھاس میں کتنی مقداریں کام کرتی ہیں تو پھر مٹھاس کا تذکرہ کر کے اس مٹھاس کی مقدار کا تعیّن کرتے ہیں پھر یہ کہتے ہیں کہ گیہوں کے اندر پانی جذب کرنے کی کتنی صلاحیت موجود ہے تو للہٰذا وہ دیکھتے ہیں کہ پانی اب جذب ہو رہا ہے تو پانی کتنی مقدار میں جذب ہو رہا ہے۔ وہ تجربہ کرتے ہیں گندم کے دانہ سے متعلق فارمولا یہ بنا کہ اس میں اتنا پانی ہے، اتنی شکر ہے، اتنا نشاستہ ہے، اتنا اس کے اندر بُھر بُھرا پن ہے۔ اتنی اس کے اندر سختی ہے، اتنا اس کے اندر پھیلاؤ ہے۔ اتنا اس کے اندر کڑکڑا پن ہے۔ تقریباً ۲۰ مقداروں سے مل کر ایک گیہوں بنا۔ گیہوں بنا تو اس کو زمین میں ڈالتے ہیں اور اس کی کاشت کرتے ہیں۔ اس نے اس گیہوں کو پکڑا اور پکڑ کر اس کو فضا میں رکھا تو وہاں شاگرد نے دیکھا کہ اس گیہوں کے اوپر فضا میں جتنی گیسیں ہیں، جتنی روشنیاں ہیں، ان روشنیوں کا اس گیہوں کے اندر جو مقداریں ہوتی ہیں ان کے اوپر کیا اثر ہوتا ہے۔ وہ کس طرح ایک دوسرے سے multiply ہوتی ہیں، کس طرح ایک دوسرے میں جذب ہو کر بڑھتی ہیں۔ پھر اس کو نیچے پھینکتے ہیں۔ دیکھیں پکڑی ہوئی چیز الگ ہے اور اوپر سے نیچے آنے والی چیز الگ ہے۔ اب اوپر سے جب چیز آرہی ہے تو زمین کی جو کشش ثقل ہے جس کو آپ gravity کہتے ہیں وہ گیہوں کو کھینچ رہی ہے۔ اب یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ gravity کی مقداریں ہیں۔ اس کے بعد زمین پر گیہوں گر گیا ہے۔ اب زمین پر جب گیہوں گرا، پھر فضا کے اندر جتنی روشنیاں ہیں جتنی گیسیں ہیں وہ اس میں شامل ہو گئیں۔ اب زمین پر جب وہ گرا تو زمین کی ساخت زیر بحث آجاتی ہے کہ زمین کن عناصر سے ترتیب پائی ہے۔ زمین میں کتنے عناصر کام کر رہے ہیں مثلاً زمین میں تانبا ہے۔ زمین میں پیتل ہے۔ ایلومینیم ہے۔ زمین میں فاسفورس ہے۔ زمین میں چاندی ہے۔ زمین میں سونا ہے۔ زمین میں بے شمار معدنیات ہیں۔ ابرق ہے، نمک ہے، پھٹکری ہے وغیرہ وغیرہ۔ بے شمار معدنیات کا اس گیہوں پر کیا اثر ہوا اور ان معدنیات کی الگ الگ کتنی مقداریں ہیں۔ جب وہ ساری مقداریں گیہوں میں شامل ہو گئیں تو گیہوں زمین کے اندر چلا گیا اور زمین نے اس کو بند کر لیا۔ پھر گیہوں کے اندر کیا تبدیلی واقع ہوئی۔ کس طرح اس کے اندر کلّا پھُوٹا۔ کس طرح وہ

گیہوں پھول کر پھٹا۔ پھٹنے کے بعد اس میں کلّا آیا۔ پھر پتی بنی پھر درخت بنا اس درخت کے اندر ہزاروں لاکھوں گیہوں لگ گئے پھر یہ مسئلہ زیر بحث آجاتا ہے کہ ایک گیہوں میں ہزار گیہوں کیسے لگ گئے ؟

یہ روحانی تعلیمات کا ایک طریقہ ہے۔ اب آپ دیکھیں اس میں سوائے روشنی کے، سوائے مقداروں کے کوئی چیز نہیں ہے۔ اب وہ جب گیہوں بنا اور آپ نے بہت سارے گیہوں کو اکٹھا کر کے اس کو پِسوایا، وہاں پر بھی مقداریں زیر بحث آگئیں۔ اگر وہ چکی کے پاٹوں میں مخصوص heat پیدا نہ ہو تو آٹا نہیں بنتا۔ چکی چلے بغیر آٹا نہیں بنے گا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب آٹا پِستا ہے آپ ہاتھ لگا کر دیکھیں اچھا خاصا گرم ہوتا ہے، انگلیاں جل جاتی ہیں۔ پھر وہ گرم آٹا ٹھنڈا ہوا پھر آپ نے اس آٹے کو گوندھا، اس میں پانی جذب کیا، اس کو توے پر ڈالا یہ ساری چیزیں مقداروں کے علاوہ کچھ نہیں۔ اب ہم جو کچھ بھی کھا رہے ہیں، مادّی اعتبار سے تو ہم matter کھا رہے ہیں۔ لیکن روحانی نقطہ نظر سے کوئی آدمی matter نہیں کھا رہا ہے۔ انسان خود روشنیوں کا بنا ہوا ہے روشنی روشنی کو کھا رہی ہے۔ یا یوں کہیں کہ روشنی روشنی کو جذب کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے جتنی ہم خوراک کھاتے ہیں اس کے حساب سے ہمارا وزن نہیں بڑھتا۔

کوئی چیز مقدار کے بغیر نہیں ہوتی اور مقدار روشنیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی تو روشنی کو آپ کو کوئی نہ کوئی الگ نام ضرور دینا پڑے گا۔ اگر آپ کسی ذریعہ سے سیب کی، گیہوں کی، پپیتے کی جو مقداریں ہیں ان کو آپ دیکھ کر سمجھ کر اپنے اندر ذخیرہ کر لیں تو یہ بات صحیح ہے کہ آپ کو کھانا کھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جنّت میں بھی matter نہیں ہے اِسی لئے جنّت میں بُول و بَراز نہیں ہوتا۔ پاخانہ، پیشاب نہیں ہوتا جنّت میں چیزیں تو سب ہیں دودھ بھی ہے، پھل بھی ہیں، شہد بھی ہے، پانی بھی ہے۔ غذائی انتظام وہاں سارا کا سارا ہے لیکن وہاں ہر چیز روشنی سے بنی ہوئی ہے۔

طریقت اور شریعت

سوال: معرفت، طریقت اور شریعت میں کیا فرق ہے؟

جواب: جب ہم قرآن پاک کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے اندر تفکر کرتے ہیں، ایک تو اس طرح مطالعہ کرنا ہے کہ پڑھتے جائیں اور ایک یہ کہ قرآن پاک میں غور و فکر کر کے اس کی حکمت کو تلاش کیا جائے۔ یہ اصل میں قرآن کا منشاء ہے۔ جو بندے قرآن پاک کو ترجمہ کے ساتھ پڑھ کر اس کی حکمت تلاش کرتے ہیں ان کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ قرآن پاک میں بے شمار علوم بیان کئے گئے ہیں۔ ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1. ان میں سے ایک حصّہ اس بارے میں ہے کہ حیوان میں اور انسان میں کس طرح امتیاز قائم ہوا اور اس امتیاز کو قائم کرنے کے لئے انسان کو کیا کرنا ہے مثلاً جہاں تک زندہ رہنے کا تعلق ہے ایک بھینس بھی زندہ رہتی ہے، اسے بھی بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے، وہ بھی پانی پی کر پیاس بجھاتی ہے۔ بھینس کے بھی بچے ہوتے ہیں۔ بھینس اپنے بچے کو دودھ بھی پلاتی ہے۔ جس طرح انسان اپنے بچے کو دودھ پلاتا ہے بھینس اپنے بچے کی تربیت کرتی ہے، پرورش بھی کرتی ہے۔ بھینس کو گرمی، سردی بھی لگتی ہے اور اس کو نہانے کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ اب ہم انسان کی اور بھینس کی زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں ساری باتیں ایک ہی نظر آتی ہیں لیکن جب ہم قرآن پاک کی آیات میں تفکر کرتے ہیں تو باوجود یہ کہ انسان اور حیوان کی زندگی یکساں ہے۔ انسان ایک ممتاز مخلوق بن کر سامنے آتا ہے اور قرآن یہ بتاتا ہے کہ انسان کس طرح زندگی گزارے، کس طرح پاکیزگی اختیار کرے، کس طرح ہمسایوں کے حقوق پورے کرے، حُصول معاش میں اس بات کا خیال رکھے کہ دوسروں کا حصّہ نہ مارا جائے۔ دوسروں کی حق تلفی نہ ہو، بے ایمانی نہ ہو۔ بچوں کی تربیت کیسے ہو؟ انسان عبادات کیسے کرے؟ وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے حصّہ میں تاریخ بیان کی گئی کہ نوعِ انسانی میں کس قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی باتیں ان پیغمبروں کی کیا تعلیمات تھیں لوگوں نے ان پیغمبروں کو کس حد تک سنا اور کس حد تک رد کیا۔ نہ صرف یہ کہ اللہ کی بات سامنے آئی کہ قوموں کا عروج و زوال اس بات پر منحصر ہے کہ قومیں کتنی جدّوجہد کرتی ہیں، کتنی کوشش کرتی ہیں۔ تیسرا حصّہ مُعاد کہلاتا ہے، روح کیا ہے؟ اس حصّہ میں ساری گفتگو روح پر ہے۔ کہاں بنی؟ کیسے بنی؟ روح کے کتنے روپ ہیں؟ عالمِ ارواح میں اگر روح تھی تو زمین تک آنے تک اس کو کن کن مدارج سے گزرنا پڑا؟ پھر اس دنیا میں آنے کے بعد کن کن مدارج سے آدمی گزر کر بوڑھا ہوا اور بالآخر مر گیا؟ مرنے کے بعد کہاں چلا گیا اور

مرنے کے بعد کی زندگی کا نقشہ؟ دوبارہ پھر انسان اس طرح زندہ ہو جائے گا جس طرح مرنے سے پہلے تھا۔ حساب کتاب ہو گا، حشر نشر ہو گا، جنّت دوزخ وغیرہ وغیرہ تو قرآن کے تین حصے ہمارے سامنے آئے۔

ایک حصّہ یہ کہ انسان اللہ کی منشاء پر چلتے ہوئے پاکیزہ زندگی کس طرح گزارے۔ دوسرا تاریخ، اور تیسرا مُعاد۔ مُعاد کا جو حصّہ ہے اس میں سب سے پہلی بات یہ کہ انسان فی الواقع گوشت پوست کے جسم کا نام نہیں ہے بلکہ یہ جان لینے کے بعد کہ گوشت پوست کا جسم اصل نہیں بلکہ اس کی روح اس کا اصل ہے۔ یہ علم جاننا ضروری ہے کہ روح کیا ہے؟ جب آپ نے روح کو سمجھ لیا تو یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ روح بنانے والا کون ہے؟ جب روح کے بنانے والے کے بارے میں آپ سوچیں گے تو اس ہستی کو آپ ڈھونڈیں گے۔ یہ کھوج لگانا اور تلاش کرنا یہ سب طریقت کے دائرے میں آتا ہے۔

انسان حیوانات سے ممتاز ہو کر زندگی گزارے۔ اچھائی، برائی، حرام، حلال وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب شریعت ہے۔ شریعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے لئے وہ لائحہ عمل منتخب کرے جس لائحہ عمل سے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ انسان کو متعارف کرایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقلِ سلیم عطا کی وہ عقلِ سلیم اس کو بتاتی ہے کہ بھئی اپنے وجود کو تلاش کر ...تُو پیدا ہونے سے پہلے کہاں تھا؟ اور پیدا ہونے کے بعد تُو کہاں چلا جاتا ہے؟ اور تُو پیدا کیوں ہوتا ہے؟ اور چاہتا یہ ہے کہ میں کبھی نہ مروں مگر تو مر جاتا ہے؟ یہ کیا معاملہ ہے کہ اپنی مرضی سے تُو پیدا بھی نہیں ہو سکتا ہے، اپنی مرضی سے تُو زندہ بھی نہیں رہتا؟ آخر پھر تیرے آنے کا یہاں مقصد کیا ہے؟ تیرا تو اپنا کوئی اختیار ہی نہیں ہے ! پیدائش پر تجھے اختیار نہیں ہے، موت کو کچھ وقفہ کیلئے ملتوی کرنے کا تجھ کو اختیار نہیں ہے۔ جب کوئی ہستی چاہتی ہے تو تُو پیدا ہو جاتا ہے اور جب کوئی ہستی چاہتی ہے تو تُو مر جاتا ہے۔ اب لا محالہ ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ یہ گورکھ دھندا کیا ہے؟ ہمیں پیدا کیوں کیا گیا ہے؟ اگر ہمیں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ کھانا کھائیں، ہماری اولاد ہو، ہم ماں باپ بنیں تو چڑیا بھی ماں باپ بن رہی ہے، چڑیا بھی کھا پی رہی ہے، چڑیا بھی سارے کام کر رہی ہے، چڑیا بھی عبادت کر رہی ہے۔ اگر انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ گھر بنائے تو چڑیا بھی گھونسلہ بنا رہی ہے۔ چوہے بھی اپنا بل بناتے ہیں۔ عقلِ سلیم کے تحت جب

انسان اپنا اور حیوانات کا موازنہ کرتا ہے کہ میں بھی پیدا ہو رہا ہوں حیوان بھی پیدا ہو رہا ہے، میں بھی بچہ ہوں، حیوان بھی بچہ ہے، حیوان بھی جوان ہے، میں بھی جوان ہوں۔ حیوان بھی مر رہا ہے، میں بھی مر رہا ہوں تو اس کے پیچھے کیا بات ہے؟

تو یہ جو تلاش ہے، اپنی تلاش، اپنی روح کی تلاش، اپنے پیدا کرنے والے کی تلاش، کائنات کی تلاش، یہ جو ہے یہ سب طریقت ہے۔

اِس تلاش کے نتیجے میں جب آپ اُس ہستی کو پہچان لیتے ہیں، اُس ہستی سے واقف ہو جاتے ہیں، اُس ہستی کا آپ تعارف حاصل کر لیتے ہیں جس ہستی نے آپ کو بنایا ہے، اِس کا نام معرفت ہے۔

شریعت، طریقت اور معرفت یہ تینوں چیزیں اس طرح ہیں۔ اب یہ کہ کوئی انسان شریعت کے بغیر حیوانات سے ممتاز نہیں ہو سکتا۔ شریعت کے بغیر کسی انسان میں عقلِ سلیم نہیں پیدا ہوتی۔ مثال ہمارے سامنے ہے۔

ہمارے سامنے جو سائنٹسٹ ہیں، کیا ٹھکانہ ہے ان کے دماغوں کا کہ وہ آسمانوں میں بھی چلے گئے اور جین جیسی چیز انہوں نے دریافت کر لی لیکن چونکہ عقلِ سلیم ابھی پیدا نہیں ہوئی اس لئے ہر چیز کو وہ اتّفاقی کہتے ہیں۔ ہر چیز حادثاتی اور اتفاقی طور پر ہو گئی۔ باوجود اس کے کہ نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اس بات کا بر ملا اظہار نہیں کرتے کہ کوئی ہستی ایسی ہے کہ جس نے ہر چیز بنائی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُن کا زندگی کا جو رہن سہن ہے، زندگی گزارنے کا اُن کا جو پروگرام ہے، اُس میں پیغمبروں کی وہ تعلیمات نہیں ہیں جن تعلیمات کا نام شریعت ہے۔

عقلِ سلیم حاصل کرنے کے لئے پیغمبروں اور حضور ﷺ کا دیا ہوا پروگرام ضروری ہے۔ شریعت کا علم اور عقلِ سلیم حاصل ہونے کے بعد کائنات کا کھوج لگانا ضروری ہے اور کائنات کا کھوج لگانے کے بعد اللہ کا عرفان ضروری ہے۔

بڑے پیر صاحبؒ کا ایک بڑا مشہور واقعہ ہے۔ وہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک دم آسمان میں چکا چوند ہوئی اور ذہن میں یہ بات آئی کہ میں نے نور دیکھا ہے، روشنی دیکھی ہے۔ اس میں سے آواز آئی کہ اے عبدالقادرؒ! ہم نے تم پر نماز معاف کر دی۔ تھوڑی دیر انہوں نے سوچا اور سوچ میں پڑ گئے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضور ﷺ کے اوپر تو نماز معاف نہ ہوئی جبکہ وہ معصوم بھی ہیں۔ میرے اوپر نماز کیسے معاف ہو گئی؟ اگر ان کو شریعت کا علم نہ ہوتا تو کبھی بھی اُن کے ذہن میں یہ بات نہ آتی کہ حضور ﷺ معصوم ہیں اور جب ان کے اوپر نماز معاف نہ ہوئی تو کسی اور کے اوپر نماز کیسے معاف ہو سکتی ہے۔ تو کہا ...تُو شیطان ہے۔ انہوں نے لاحول پڑھی پھر آواز آئی کہ تجھے تیرے علم نے بچا لیا۔ پھر یہ خیال آیا کہ حضور ﷺ کے متعلق یہ خیال اگر اللہ میرے ذہن میں نہیں ڈالتا تو میں کیسے بچتا؟ میرا تو علم ناقص ہے اور یہ خیال میرے ذہن میں نہیں آتا۔ انہوں نے پھر توبہ استغفار کی تو بڑے پیر صاحب کے واقعے سے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ جس طرح شریعت کا علم ہمارے لئے ضروری ہے اسی طرح طریقت کا علم بھی ضروری ہے۔ نماز ایک بنیادی رکن ہے۔ ٧٠٠ دفعہ نماز کے بارے میں قرآن میں تذکرہ آیا ہے۔ اب اس کے بعد جب آپ نے نماز کی نیّت باندھی یہ شریعت ہے۔ اب نماز میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہو جانا یہ طریقت ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ نماز میں تعلق قائم نہیں ہوا وہ قرآن پاک کے ارشاد کے مطابق ہرگز نماز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

"اور ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں۔" (سورۃ الماعون)

اللہ نے یہ نہیں کہا کہ ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو نماز نہیں پڑھتے۔ وہ تو بات ہی الگ ہے نماز تو ایک رکن ہے بات تو یہ ہے کہ ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں۔ حالانکہ وہ نماز تو پڑھ رہے ہیں لیکن ان کو کچھ پتہ نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں تو نماز کا پڑھنا اور نماز کے لئے کھڑے ہو جانا۔ نماز کے آداب پورے کرنا یہ سب شریعت ہے اور نماز کے اندر ذہنی یکسوئی قائم ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ قائم ہو جانا حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ کو دیکھنا یا اللہ کا بندہ کو دیکھنا اللہ کو پکارنا اور اللہ کو اس پکار پر سن کر جواب دینا

یہ سب طریقت ہے۔ صرف اسلام قبول کر لینے سے کوئی انسان مومن کے درجہ پر فائز نہیں ہو سکتا، مسلمان ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے:

''یہ کہتے ہیں یہ مسلمان ہیں مسلمان بے شک ہیں لیکن ابھی ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔''
(سورۃ الحجرات)

مسلمان ہونا شریعت پر عمل کرنا ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا، تمام ارکان کو پورے کرتے ہوئے، یہ ایمان ہے اور ایمان کی تکمیل کے بعد جو مرحلہ ہے وہ عرفان ہے، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ تو یہ جو شریعت، طریقت اور تصوّف کی بات ہے یہ کوئی لمبی چوڑی نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے شریعت آداب ہیں اس راستہ پر چلنے کے جو راستہ آدمی کو عرفان تک لے جاتا ہے۔ آپ راستے کے آداب سے واقف نہ ہوں، یہ پتہ نہ ہو کہ کہاں سے مڑنا ہے، کہاں جانا ہے، کیا سائن ہے، سگنل کہاں ہے، آپ سارے راستے چلتے رہیں منزل تک نہ پہنچیں گے۔ راستے کے آداب یہ ہیں کہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ سڑک کدھر جاتی ہے اور اگر آپ دائیں بائیں مڑ گئے تو کہاں پہنچیں گے اور اگر آپ راستے کے آداب سے واقف نہیں ہیں تو آپ کا پہنچنا مشکوک ہے۔ پہنچ ہی نہیں سکتے، کبھی اِدھر مڑ جائیں گے، کبھی اُدھر مڑ جائیں گے۔ اِھدِنَاالصِّرَاطَ المُستَقِیم کا مطلب یہ ہے کہ یا اللہ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت دے۔ آپ سیدھے راستے کی ہدایت مانگتے ہیں۔ ہر نماز کی ہر رکعت میں آپ الحمد شریف پڑھتے ہیں۔ تو جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے تو کیا آپ صراط مستقیم پر نہیں ہیں۔ تو کیا آپ نماز پڑھنے کے باوجود سیدھے راستے پر نہیں ہیں؟

مقصد یہ ہے کہ ہم شریعت کے تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے تیرے حضور میں کھڑے ہو گئے ہیں۔ یا اللہ اب ہم کو طریقت کے راستے پر چلا، تاکہ ہم طریقت کے راستے پر چلتے ہوئے آپ کا عرفان حاصل کر لیں اور

ہمارے اوپر انعام کر، ہمیں ان لوگوں میں شمار نہ کیجئے جن سے آپ ناراض ہیں، بلکہ ہمیں ان لوگوں میں شمار کر لیجئے جن سے آپ راضی ہیں۔

یہ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں مگر ابھی ان کے دلوں میں ایمان تو داخل ہی نہیں ہوا ہے ... (سورۃ الحجرات) ...تو اسلام لانا الگ چیز ہے اور ایمان دل میں داخل ہونا الگ چیز ہے۔ آپ دن میں کتنی بار دوسرا کلمہ پڑھتے ہیں جس کا مطلب گواہی دینا ہے۔ کیا آپ بغیر دیکھے گواہی دے رہے ہیں؟ جھوٹی گواہی دے رہے ہیں؟ آپ کی یہ دنیاوی اعتبار سے تو بغیر دیکھے گواہی تسلیم نہیں کی جاتی ہے۔ یہ دنیاوی معاملات بغیر دیکھے گواہی عدالت تسلیم نہیں کرتی تو اللہ آپ کی گواہی کیسے تسلیم کرے گا؟

اصل بات یہ ہے کہ آپ اللہ کو دیکھ چکے ہیں اور سب اس کی ربوبیت کا اقرار کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو پیدا کیا تو ...أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (سورۃ الاعراف) کہہ کر خود کو آپ کو دکھا دیا اور آپ نے دیکھ کر اس کی آواز سن کر یہ کہا کہ قَالُوا بَلَىٰ (سورۃ الاعراف)۔ ہاں ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہی ہمارے ربّ ہیں۔

آپ دیکھیں تو سہی، بات کیا ہے نظروں پر ہماری پردہ پڑا ہوا ہے، نفس کا پردہ ...اِسی کو حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے ربّ کو پہچانا۔

تو اپنے آپ کو جان لو، پہچان لو، اِس پردہ کو دیکھ لو، جس پردہ نے تم کو اور تمہارے ربّ کو الگ کر دیا ہے اور جیسے ہی اس پردہ کو جان کر ہٹاؤ گے، ربّ تمہارے سامنے ہو گا۔ شریعت کے بغیر طریقت کی تکمیل نہیں ہوتی اور شریعت اور طریقت کے بغیر عرفان کی تکمیل نہیں ہوتی۔

اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنے ربّ کو پہچاننے کے لئے یہ تینوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔

روح کا عرفان

سوال : بتایا گیا ہے کہ انسان ناقابل تذکرہ شئے تھا۔ اور اس سے ظاہر ہونے والے افعال و حرکات کا سرچشمہ روح ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی جلوہ نمائی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس جلوہ نمائی یا صناعی یا تخلیق سے کس طرح تعارف حاصل کیا جائے اور یہ کیسے سمجھا جائے کہ روح کا عرفان کیا ہے؟

جواب: یہ سوال جب سے دنیا بنی اور دنیا میں آدم علیہ السّلام کا وجود ظاہر ہُوا، اُس وقت سے ہی ذہنِ آدم میں بار بار ابھر رہا ہے۔ جب آدم کی اولاد زمین پر پھیلی تو رفتہ رفتہ اس کی زندگی میں نئے نئے تقاضے پیدا ہوئے اور ان تقاضوں کی تکمیل کے لئے نئی نئی ایجادات کی گئیں۔ انواع و اقسام کے علوم کی داغ بیل پڑی۔ یہ علوم شاخ در شاخ پھیلتے گئے اور نتیجہ میں بے شمار فلسفے اور اَن گنت تحقیقی راہیں ہمارے سامنے آئیں۔ جب ان علوم کی کوئی انتہا نظر نہ آئی اور انسان نے باوجود عقل و شعور کے خود کو بے بس اور مجبور پایا تو بالآخر اس کے سامنے یہ بات آئی کہ کوئی ہستی ہے جو کائنات اور کائنات میں موجود سیّارے اور سیّاروں میں مخلوقات اور مخلوقات میں موجود علم و ہنر کی تحریک کو سنبھالے ہوئے ہے۔

اب اس ذات کی تلاش شروع ہوئی۔ جب تلاش کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوا، تو لوگ کوشش اور جدّوجہد ترک کرنے پر آمادہ ہوئے اور بھٹک گئے۔ جب یہ صورت حال واقع ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہم الصّلوٰۃ والسّلام بھیجے۔ انبیائے کرام نے نوعِ انسان کے فطری اور طبعی تقاضوں کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنے کا ایک لائحہ عمل بنادیا اور قواعد و ضوابالترتیب دیئے۔ اچھائی اور برائی کے پہلو نمایاں کر کے اچھائیوں پر گامزن رہنے کی تلقین اور برائیوں سے بچنے کی ہدایت کی اور یہ بتایا کہ انسان کے اندر ہمہ وقت دو رخ کام کرتے ہیں۔ ایک رخ بھلائی کی طرف متوجہ کرتا ہے اور دوسرا رخ برائی کی ترغیب دیتا ہے۔ برائی کا رخ دراصل روح سے دور کرنے والی ایجنسی ہے اور بھلائی کا رخ روح تک پہنچنے والا ایک دروازہ ہے۔

لوگوں نے انبیاء کرام کی اس تعلیم کو سمجھا اور اس کی بنیاد پر زندگی گزارنے کا ارادہ کیا۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ بھلائیوں کے عمل کے ساتھ ایک صلہ جس کا نام ثواب رکھا گیا، مُتعیّن کر لیا گیا۔ یہ بجائے خود روح سے دوری کا پیغام ثابت ہوا۔ ایک آدمی نے اس بنیاد پر ایک اچھا کام کیا کہ اسے اس کا صلہ ملے گا۔ یہ عمل نادیدہ مستقبل میں چلا گیا۔ صلہ کب ملے گا؟ اس کا کچھ پتہ نہیں۔ انسان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ فی الواقع اس کا عمل بارگاہِ الٰہی میں قبول بھی ہوا ہے یا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی ایسا نہیں ہوا کہ جو خود سے واقف نہ ہو۔ جنّت سے واقف نہ ہو، دوزخ کے بارے میں نہ جانتا ہو، اللہ کے فرشتوں کے بارے میں وافر علم نہ رکھتا ہو، کائنات کے اسرار و رموز سے وقوف نہ رکھتا ہو۔ اسے اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل نہ ہو۔ کوئی نبی جب اپنی تعلیمات کو عام کرتا ہے تو دراصل اس کے پیشِ نظر یہ پروگرام ہوتا ہے کہ اللہ کی مخلوق اور میری امّت کے افراد میری طرح اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کو جانتے اور پہچانتے ہوں، اُس کے فرشتوں سے واقف ہوں، اِس دنیا میں رہتے ہوئے جنّت کا نظارہ کر لیں، دوزخ کی صعوبتیں اُن کے سامنے آجائیں، پیدا ہونے سے پہلے وہ کہاں تھے اور مرنے کے بعد وہ کہاں چلے جاتے ہیں اور وہاں کے شب و روز کس طرح طلوع و غروب ہوتے ہیں۔ ان کے علم میں یہ بات بھی ہو کہ گوشت پوست سے مرکب آدمی اصل آدمی نہیں ہے بلکہ اس کی اصل روح ہے۔ وہ روح جو نہ گھٹتی ہے، نہ بوڑھی ہوتی ہے اور نہ اس کے اوپر موت وارد ہوتی ہے۔

جب تک کوئی بندہ اپنی روح سے واقف نہیں ہوتا وہ دریائے توحید میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ سے متعارف ہونے کے لئے پہلے خود سے متعارف ہونا ضروری ہے۔ خود سے متعارف ہونے کے لئے مفروضہ حواس اور اس عارضی زندگی کی نفی کرنا ضروری ہے۔ نفی کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان ہاتھ پیر توڑ کر اور سب کچھ ترک کر کے گوشہ نشین ہو جائے۔ اپنی نفی کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان دنیاوی زندگی گزارنے کے لئے وظیفہ اعضاء پورا کرے لیکن نتیجہ اللہ تعالیٰ کے اوپر چھوڑ دے۔ ہر حال میں شکر کو اپنا شعار بنائے۔ مخلوقِ خدا کی خدمت کرے اور رات کی تنہائیوں میں ہر طرف سے اپنا ذہن ہٹا کر مراقبہ میں یہ تصوّر کرے کہ اسے اور اس کے ہر عمل کو اللہ دیکھ رہا ہے۔ یہ تصوّر جب مشاہدہ بن جاتا ہے تو اس کے اوپر سے مفروضہ حواس کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ اپنی روح سے واقف ہو جاتا ہے۔

عام آدمی اور مؤمن میں فرق

سوال : حدیث قدسی میں مؤمن کے بارے میں آیا ہے کہ میں مؤمن کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ چیزیں پکڑتا ہے۔ میں وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ میں وہ سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ میں وہ ذہن بن جاتا ہوں جس سے وہ سوچتا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے کیا وہ ساری کی ساری ایک عام آدمی میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی سماعت، سوچ وغیرہ تو پھر ایک عام آدمی اور مؤمن میں کیا فرق ہے؟

جواب: یہ آپ نے بڑا عجیب سوال کیا ہے۔ اس میں اگر آپ تھوڑا غور کرتے ہیں تو یہ سوال دوسری طرح ہوتا۔ ان صاحب کا سوال یہ ہوا کہ میٹریکولیٹ اور p.h.d میں کیا فرق ہے۔ حالانکہ میٹرک کرنے والا بندہ بھی روٹی کھاتا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے، عقل کی باتیں کرتا ہے، کاروبار کرتا ہے، اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کو پہچانتا ہے اور علم بھی رکھتا ہے لیکن ایک p.h.d میں ایک گریجویٹ اور میٹریکولیٹ میں بہت فرق ہوتا ہے، ان سب میں علم کا فرق ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ ہوگا اسی مناسبت سے کسی بھی آدمی کا دماغ اور ذہن روشن ہو جائے گا۔ یہ تو عام دنیاداری کی بات ہے یہی ایک عام آدمی اور مؤمن میں فرق ہے۔ مؤمن کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ مؤمن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ عام آدمی میں اور مؤمن میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی نظر عطا ہو جاتی ہے کہ نور اس کے سامنے آجاتا ہے اور وہ جو کچھ دیکھتا ہے ان انوار کی اور تجلّیات کی روشنی میں دیکھتا ہے۔

اب یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ بن جاتا ہے، کان بن جاتا ہے کا مطلب یہ نہیں کہ جس طرح ہمارے ہاتھ ہیں اللہ تعالیٰ کے بھی ہاتھ ہیں کہ جس طرح ہم ان آنکھوں سے دیکھتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی اپنی انہی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ یہ ہاتھ، کان، پیر یہ مخلوق کی بشری چیزیں ہیں۔ خالق ان سے ماوراء ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ مؤمن کوئی چیز سنتا ہے تو وہ میری معرفت سنتا ہے۔ اگر وہ کچھ دیکھتا ہے تو وہ میری معرفت دیکھتا ہے۔ اگر وہ کہیں جاتا ہے تو میری معرفت پیروں سے چل کر جاتا ہے یعنی اس کے ذہن میں میرے علاوہ کوئی تصوّر نہیں ہوتا۔ جو کام بھی کرتا ہے میری خوشنودی کے لئے کرتا ہے۔ کسی بات کو بیان کرنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے تو اب ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ بن

گیا،اللہ تعالیٰ پیر بن گیا تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرناپڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کے بھی ہاتھ ہیں۔اللہ تعالیٰ کے بھی پیر ہیں۔اللہ تعالیٰ کی بھی آنکھیں ہیں جو کہ نہیں ہیں۔آنکھ،کان،ناک،ہاتھ،پیر یہ سب جو ہے،مخلوق کی صفات ہیں۔تو اللہ آنکھ بن جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ ایسی بصیرت عطا کر دیتا ہے کہ وہ جب کچھ دیکھتا ہے تو اس دیکھنے میں اللہ تعالیٰ کی مشیئت اس کے سامنے ہوتی ہے اور وہ کوئی ایسی چیز نہیں دیکھتا کہ جس چیز کے دیکھنے سے اللہ تعالیٰ ناخوش ہوتے ہیں۔وہ کسی ایسے راستے پر قدم نہیں بڑھاتا کہ جس راستے پر قدم بڑھانے سے اللہ تعالیٰ ناخوش ہوتے ہیں۔وہ کوئی ایسی چیز ہاتھ میں نہیں پکڑتا جس سے اللہ تعالیٰ ناخوش ہوتے ہیں مثلاً ایک آدمی سودی کاروبار کرتا ہے۔اب سودی کاروبار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب رقم آئے گی تو آدمی ہاتھ سے ہی پکڑے گا۔ایک آدمی شراب خانے کی طرف چلتا ہے ایک آدمی مسجد کی طرف چلتا ہے۔وہ اگر شراب خانے کی طرف چل رہا ہے تو اللہ ناخوش ہے اور اگر وہی آدمی مسجد کی طرف چل رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔اب ایک آدمی شراب خانے سے مسجد کی طرف یا مکہ کی طرف یا مدینے کی طرف سفر کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا سارا چلنا اللہ تعالیٰ کا چلنا ہوا۔اس لئے کہ وہ اللہ کی خوشنودی کے لئے قدم اٹھا دیتا ہے۔اسی طرح ذہن کی بات ہے جب وہ کچھ سوچتا ہے تو اس کی سوچ میں رحمانیت ہوتی ہے،شیطنت نہیں،تو اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہاتھ بن جاتا ہے۔انہی بندوں کے لئے ایک اور بھی حدیث ہے کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ جب اللہ کے بھروسے پر کوئی بات کہہ دیتے ہیں تو اللہ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے اور وہ بات پوری کرتا ہے۔یہ بھی انہی بندوں کی صفات ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت ان پر عمل کرتے ہیں اور جن باتوں سے اللہ ناخوش ہوتے ہیں ان کو اختیار نہیں کرتے۔

حساب کتاب کیا ہوتا ہے؟

سوال: سنا ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں حساب کتاب ہوتا ہے جبکہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ جسم روح کا لباس ہے جب روح ہی پرواز کر جاتی ہے تو لباس سے قبر میں کیا حساب کتاب ہوتا ہے؟روحانی نقطہ نظر سے تفصیل بیان کر دیں۔

جواب: جس طرح لباس کی اپنی کوئی حرکت نہیں ہوتی اس طرح جسم بھی روح کا لباس ہے۔ جو روح کا جسم سے تعلق ختم کرنے پر بے جان ہو کر لمحہ بہ لمحہ ختم ہو جاتا ہے۔ کسی بھی قبر کو آپ دو ہفتے کے بعد کھول کر دیکھیں یا ایک مہینے کے بعد کھول کر دیکھیں تو وہاں جسم نہیں ہوتا ہڈی ہوتی ہے۔ سال بھر کے بعد کھول کر دیکھیں تو معلوم ہوا ہڈیاں بھی نہیں ہوتیں۔ جسم روح کا لباس ہے اور لباس سے تو کوئی سوال جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً ایک آدمی شلوار کرتا ٹوپی وغیرہ بانس کو پہنا کر کھڑا کر دیں اور اس سے آپ سوال جواب کریں یہ لباس کیا جواب دے گا۔ اس لباس کو آپ پھاڑ دیں تب بھی اس کی طرف سے کوئی مدافعت نہیں ہوگی۔ اس میں آگ لگا دیں لباس جل جائے گا لیکن ایک آہ بھی نہیں نکلے گی۔

قبر میں جسم اس لئے رکھا جاتا ہے تاکہ انسان کی بے حرمتی نہ ہو اور یہ قبر میں رکھنے کا رواج کوئی اسلامی نہیں ہے۔ یہودیوں کے زمانے سے حضرت سلیمان علیہ السّلام کے زمانے سے یہ قبریں بنتی چلی آ رہی ہیں۔ تو یہ انسانی عظمت کو خراب نہ کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ دیکھیں اب ایک آدمی مر گیا، اُس کی آپ لاش چھوڑ دیجئے، اب وہ پھولے گا، سڑے گا، اُس میں بدبو ہو گی، تعفن ہو گا، اُس میں کیڑے پڑیں گے، گدھ کھائیں گے، کوئے کھائیں گے، چیلیں کھائیں گی، چیونٹیاں لگیں گی، بلی کتے بھیڑیئے، سب آکر اسے کھائیں گے تو یہ آدمی کی ایک طرح سے بے عزتی ہو گی۔ تو اس بے عزتی سے بچانے کے لئے اور انسانیت کا احترام برقرار رکھنے کے لئے یہ قبر کا تصوّر قائم ہوا اور یہ حضرت آدم علیہ السّلام سے چل رہا ہے۔ ہابیل اور قابیل کا قصہ آپ نے سنا ہو گا وہاں سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ جسم کو اگر ہم روح کا لباس مان لیتے ہیں تو اس پر کوئی حساب کتاب نہیں ہو گا۔ اِس جسم کے اوپر ایک اور روشنیوں کا بنا ہوا جسم ہوتا ہے اور وہ اس جسم سے ۹ انچ اوپر ہوتا ہے وہ سارا حساب کتاب جزا و سزا سب اس کے اوپر ہوتا ہے، اور وہ چیز جو ہے وہ عالمِ اَعراف میں رہتی ہے۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ روح جب عالمِ اَعراف میں چلی گئی تو قبرستان میں کیا رکھا ہے۔ وہاں تو مٹی کا ڈھیر ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ قبرستان میں کچھ بھی نہیں رکھا۔ جسم تو مٹی ہو گیا لیکن جس جگہ جسم کو ہم دفناتے ہیں آدمی کا اسی مناسبت سے اَعراف بنتا ہے۔ یعنی زمین سے ۲۰۰ میل اوپر اس کا اَعراف بنتا ہے۔ زمین سے ۲۰۰ میل اوپر ایک اور دنیا آباد ہے۔ بالکل اسی طرح کی جیسے کہ یہ دنیا ہے۔ اس کو ہم عالمِ اَعراف کہتے ہیں۔ اب اس کی مثال یوں ہے کہ ایک پلازہ ہے۔ اس کی ۲۰۰ منزلیں ہیں تو جو زندہ آدمی ہیں مثال کے طور پر وہ پہلی منزل پر رہتے ہین اور جو مرے

ہوئے آدمی ہیں وہ دوسویں منزل پر رہتے ہیں تو اس کا تعلق اس زمین سے قائم ہے کہ پلازہ بغیر زمین کے قائم نہیں رہتا۔

ایک بات اور غور طلب یہ ہے کہ عالمِ اَعراف جو ہے وہ زمین کے کرہ سے باہر نہیں ہے۔ عالمِ اَعراف زمین کے کرہ میں ہے تو جہاں اس کو دفن کرتے ہیں کسی مردہ جسم کو تو اس کا وہاں سے ایک تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اُس گھر سے، اُس قبر سے، لیکن وہ رہتا عالمِ اَعراف میں ہے۔ تو جب ہم کسی قبر پر جاتے ہیں تو ہمارا تعلق اس بندے کے ساتھ عالمِ اَعراف سے قائم ہو جاتا ہے۔ انسان جب قبرستان جاتا ہے، وہاں جا کے بیٹھتا ہے، کچھ پڑھتا ہے، اِیصالِ ثواب کرتا ہے، تو اس کے اندر وہ صلاحیت کام کرنے لگتی ہے جو صلاحیت یہاں سے ٢٠٠ میل اوپر دیکھتی ہے۔ یعنی اِیصالِ ثواب پہنچانا اِس بات کی نشاندہی ہے کہ انسان کے اندر ایسی صلاحیت کام کر رہی ہے یا ایسی نظر کام کر رہی ہے جو ٢٠٠ میل اوپر بھی دیکھ سکتی ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تم قبرستان جاؤ تو کہو "السّلام علیکم یا اہل القبور" (اے قبرستان میں رہنے والے السّلام علیکم)۔ ظاہر ہے حضور ﷺ کی کوئی بات غلط تو ہو نہیں ہو سکتی۔ بغیر حکمت کے نہیں ہو سکتی۔ تو حضور ﷺ نے جب یہ فرمایا کہ قبرستان جا کے کہو "السّلام علیکم یا اہل القبور" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قبر میں رہنے والے لوگ ہمارا سلام سنتے ہیں اور وہ ہمارے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں لیکن تم سن نہیں سکتے۔ لیکن اگر ہم اس صلاحیت کو بیدار اور متحرّک کریں، یعنی لاشعوری صلاحیت کو یا روحانی صلاحیت کو، تو ہم ان کی آواز سن بھی سکتے ہیں اور انہیں دیکھ بھی سکتے ہیں۔ ان سے رابطہ بھی قائم کر سکتے ہیں اور اولیاء کا عام قاعدہ ہے... کشف القبور... تصوّف میں ایک باقاعدہ اصطلاح ہے لوگ جاتے ہیں، آنکھیں بند کر کے بیٹھتے ہیں، کچھ پڑھتے ہیں جو عالمِ اَعراف میں لوگ ہیں وہ سامنے آ جاتے ہیں۔ قبر کا جو تعلق ہے، جو گوشت پوست کا بنا ہوا جسم ہے، اس سے حساب کتاب نہیں ہوتا بلکہ اس گوشت پوست کے اوپر ایک اور روح کا بنا ہوا جسم ہوتا ہے، مکمل جسم ہوتا ہے جسے جسمِ مثالی کہا جاتا ہے۔

استغنائی طرزِ فکر

سوال: استغنائی طرزِ فکر کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے؟

جواب: انسان کے اندر دو دماغ کام کرتے ہیں۔ ایک دماغ وہ ہے جو آدم کو جنّت میں حاصل تھا یعنی ایسا دماغ جو نافرمانی سے ناآشنا تھا۔ اور دوسرا دماغ جو نافرمانی کے بعد حاصل ہوا۔ جب تک آدم نے جنّت میں حکم عدولی نہیں کی تھی تو اسے فرمانبرداری والا دماغ حاصل تھا۔ جب انسان نے نافرمانی کی تو اسے دوسرا دماغ ملا۔ جو حکم عدولی اور نافرمانی کا دماغ قرار پایا اور یہ ورثہ نسلِ آدم میں منتقل ہوتا چلا جارہا ہے۔ آج بھی نسلِ آدم کے پاس ورثہ میں وہی اسفلُ السافلین کا دماغ موجود ہے جس کا مظاہرہ آج بھی انسان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

جب تک آدم جنّت میں رہے ان کا ربط برابر اللہ تعالیٰ سے رہا۔ لیکن آدم نے جنّت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو وہ ربط ٹوٹ گیا۔ جہاں اس ربط کے ٹوٹنے کا اثر اور بہت سی باتوں پر پڑا اس سے یقین بھی متاثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اس ربط کو آسانی سے دوبارہ قائم نہیں کرسکا اس لئے اس کے سوچنے کا انداز متاثر ہوا۔ اور انسان وہ طرزِ فکر حاصل کرنے میں ناکام رہا جو پُرسکون اور امن اور چین کی زندگی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔

آج کا انسان ماضی کے لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مایوس ہے۔ اگر حالات یہی رہے تو مستقبل میں لوگ اس سے بھی زیادہ مایوس ہونگے۔ یہ مایوسی انسان کو کسی کام کا نہیں رہنے دیتی۔ مایوسی میں انسان پر بے یقینی چھا جاتی ہے اور وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ اس کی طرزِ فکر میں تبدیلی آجاتی ہے سوچ کا انداز وہ نہیں رہتا جو اللہ تعالیٰ پر بھروسے کے لئے ضروری ہے۔

انسان کی سوچ کا انداز یہ ہونا چاہئے کہ ہر کام، مسئلہ، معاملہ اللہ کی طرف سے ہے۔ انسان کا اس مسئلہ یا معاملہ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہورہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اور اس کی مرضی سے ہو رہا ہے یا جو چیزیں یہاں موجود ہیں ان سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ ہم سے ہر بات کا تعلق اللہ تعالیٰ کی معرفت

ہے۔جب آہستہ آہستہ سوچ کا یہ انداز ہو جاتا ہے تو یہ ایک عادت بن جاتی ہے۔اس طرح جب بھی کوئی بات ہوتی ہے تو انسان یہ سوچتا ہے کہ اس بات سے ہمارا تعلق یا واسطہ صرف اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہے۔ جب بھی کوئی مسئلہ در پیش ہو تو انسان اس مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں جدّ وجہد کرے اور نتیجہ اللہ کے حوالہ کر دے اپنی مرضی کے مطابق نتیجہ حاصل کرنے کے بارے میں سوچے بھی نہیں۔ بلکہ یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ وہ کر دے جس میں ہماری بہتری ہو۔ جب انسان کی طرزِ فکر اس طرح کی ہو جاتی ہے۔ در حقیقت یہی استغنائی طرزِ فکر ہے۔

اس صورت حال میں کبھی کبھی تکلیف اور پریشانی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے مگر یہ صورت زیادہ عرصے تک نہیں رہتی۔ صحیح طرزِ فکر کی وجہ سے کچھ عرصے بعد اچھے نتائج خود بخود بر آمد ہونے لگتے ہیں۔

استغنائی طرزِ فکر کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ کوشش اور جدّ وجہد شرطِ اوّل ہے۔ یہ سوچ لینا کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر دے گا ہم خود کچھ نہ کریں۔ یہ سوچ غلط ہے۔ اس سے انسان پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔ یہ جمود انسان کو بے کار اور ناکارہ بنا دیتا ہے۔ انسان ایک حرکت ہے۔ زندگی حرکت کا نام ہے۔ یعنی متحرّک رہنا زندگی کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ جمود ایک طرح سے انسانی صلاحیتوں کی موت ہے۔ اس لئے انسان متحرّک رہ کر ہی اللہ تعالیٰ سے اچھے نتائج حاصل کرنے کی توقع کر سکتا ہے۔

اگر انسان کے سوچنے کا انداز صحیح راستہ اختیار کرے اور انسان پختہ یقین کے ساتھ اس طرزِ فکر کو اپنا بنا لے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان مایوسی سے بچ جائے اور مسائل کے بہتر نتائج حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو۔ اصل مسئلہ یقین کا ہے۔ یقین میں اتنی طاقت ہوتی ہے جس کا خود انسان کو اندازہ نہیں ہوتا۔ انبیاء اور اوّلیاء اللہ کو یہی یقین کی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ہر طرف سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود ان کی مدد اور کفالت فرماتا ہے۔ انسان یقین محکم کے ساتھ کوشش و جدّ وجہد کرے تو اللہ تعالیٰ ایسے بندہ کی تمام تر ذمہ داری خود اٹھا لیتا ہے۔

اِستغناء اللہ تعالیٰ کی صفَت صمدیت کا عکس ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اسے کسی چیز کی ضرورت و حاجت نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر ایک بندہ اپنی تمام حاجتوں اور ضرورتوں کا کفیل اللہ تعالیٰ کو ٹھہرا کر بَریُ الذِّمہ ہو

جائے یعنی وہ یہ سوچنے لگے کہ میری تمام ضرورتوں کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے اور اللہ ہی ان کو پورا کرنے والا ہے۔ میرا کام صرف کوشش کرنا ہے۔ یہ سوچ ایک طرف تو بندے کو بے فکر کر دیتی ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ بھی بندہ کی ضرورتوں کی کفالت کی طرف توجہ دینے لگتا ہے۔ اگر انسان صرف اپنی کوشش اور جدّ وجہد کی طرف توجہ دے اور نتائج سے بے فکر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف پوری توجہ دے گا اور بندے کے حق میں اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔

استغنائی طرزِ فکر حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ بندے کی طرزِ فکر اس طرزِ فکر سے ہم رشتہ ہو جائے جو اللہ کی طرزِ فکر ہے۔

خود ترغیبی کیا ہے؟

سوال: مابعد النّفسیات (parapsychology) اور روحانیت پر بیرون ممالک میں سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اس وقت مابعد النّفسیات کے سلسلے میں زیادہ اہم تحقیقات ترقی یافتہ ملکوں میں ہو رہی ہے۔ یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ تعویذ گنڈے عملیات خود ترغیبی اور اِرتکازِ توجّہ کے نفسیاتی اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔ سائنس نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ جب کوئی علاج کارگر نہ ہو تو مریض کی ذہنی توانائی اور اس کے اندر یقین کے ذریعے ان شکایات کا اِزالہ کیا جا سکتا ہے۔ ممتاز سائنسدان جارجی لوزانوف (georgi lozanov) نے مابعد النّفسیات اور خود ترغیبی کے فن کو ترقی دے کر ایک مستقل علاج بنا دیا ہے۔ براہِ کرم روحانی نقطہ نظر سے اس کی علمی توجیہ پیش کریں کہ روحانیت میں خود ترغیبی اور دوسرے عملیات کی کیا حقیقت ہے؟ عملیات اگر فائدہ پہنچاتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: ایک برقی رَو تمام فضا میں گشت کرتی رہی ہے۔ یہ ہمیشہ ایک ہی رفتار سے نہیں چلتی اور ایک ہی انداز پر نہیں رہتی۔ کبھی سست ہو جاتی ہے، کبھی تیز۔ اکثر شام کے وقت دیکھا گیا ہے کہ درخت کے پتوں سے ایک قسم کی شعاع برآمد ہوتی ہے۔ یہ شعاع بھی اِسی برقی رَو کا نتیجہ ہے۔ اگر برقی رَو نہ ہو تو یہ شعاع خارج نہیں ہو گی۔ اگرچہ برقی رَو اور شعاع الگ الگ چیزیں ہیں لیکن متحد ہو کر ہر پتہ کی نوک سے خارج ہوتی رہتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے اور

تیز نگاہ آدمی اسے دیکھنے کی کوشش کرے تو یہ نظر آتی ہے۔ یہی برقی رَو انسانوں، جانوروں، درختوں، گھاس اور جنّات وغیرہ میں زندگی پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ برقی رَو کسی وجہ سے اپنی توجّہ درخت کی طرف سے ہٹالے تو یہ درخت خشک ہو جائے گا۔ جب کہ ہم اس کی وجہ یہ سمجھتے ہیں کہ جڑوں کو پانی نہیں ملا یا کھاد نہیں ملی، اِس وجہ سے درخت سوکھ گیا ہے۔

انسانوں اور جانوروں کو بھی یہی برقی رَو زندگی بخشتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے انسانوں اور جانوروں سے برقی رَو کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو فوراً موت واقع ہو جاتی ہے یا جس مناسبت سے برقی رَو توجّہ ہٹالے اسی مناسبت سے زندگی مفلوج ہوتی رہتی ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ یہ برقی رَو ایک ایسی توانائی ہے جو زمین کے رہنے والوں اور زمین سے پیدا ہونے والوں کو جانتی، سمجھتی اور سنبھالتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کے اندر سمجھ نہ ہو۔ یہ ہر چیز کو سمجھتی ہے اور بقدر ضروریات کام کرتی ہے۔ اس کی ضرورت کتنی ہے؟ اور کیوں ہے؟ یہ اس کو خوب سمجھتی ہے۔

سائنسدان زندگی کی وجہ نائٹروجن اور آکسیجن کو قرار دیتے ہیں اور ان دونوں میں آکسیجن زیادہ اہمیت رکھتی ہے، لیکن آدمی مرتا ہے۔ اس کے ارد گرد آکسیجن اور نائٹروجن کی وافر مقدار موجود رہتی ہے۔ اس کے باوجود مر جاتا ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے؟

یہ مسئلہ بہت زیادہ فکر طلب ہے یہی وہ برقی رَو ہے جس کو ہم روح کا نام دیتے ہیں۔ ایک مکتبہ فکر اس کو لائف اسٹریم بھی کہتا ہے۔ لائف اسٹریم، زمین کے ہر حصّہ میں گشت کرتی رہتی ہے۔ اور اس کی توجّہ کا مرکز ہمارا پورا سیّارہ ہے۔ اور پورے سیّارے کی وہ تمام چیزیں جو سیّارے میں پائی جاتی ہیں، چاہے وہ مٹی کا ذرّہ ہو، چاہے وہ کوئی ایسی چیز ہو جس سے ہم ابھی تک ناواقف ہیں۔ بہر کیف، جس قانون کے تحت اس کی توجّہ مرکوز رہتی ہے وہ نیچر کا ہی قانون ہے، ہم اسے نیچر کے قانون سے الگ نہیں کر سکتے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کی رفتار کیا ہو سکتی ہے؟ اس کی رفتار روشنی کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہے۔ (روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار دوسَو بیاسی میل فی سیکنڈ بتائی جاتی ہے) لیکن یہ برقی رَو اتنی تیز ہوتی ہے کہ باوجود

گردش کے ہم اسے ساکت دیکھتے ہیں۔اس لئے کہ یہ بیک وقت ہر جگہ موجود ہے۔ جہاں تک انسان کے اندر اس کی گردش کا سوال ہے تو یہ اُس کے ارادہ میں موجود رہتی ہے اور ارادہ کے ساتھ بالفعل کام کرتی ہے۔

انسان ارادہ کرتا ہے۔ارادہ میں یہی روح موجود ہے اور کام کرتی ہے۔بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی کام نہیں کیا، حالانکہ یہ موجود ہے اور برابر ارادہ میں دَور کر رہی ہے۔اِس کی مثال یہ ہے کہ انسانی ہاتھ میں بھی ارادہ کام کرتا ہے۔اگر وہ ارادہ کرے اور ہاتھ کو حرکت نہ دے تو ہاتھ جنبش بھی نہیں کرے گا، یا کسی چیز کو نہیں پکڑے گا، یا کوئی وزن نہیں اٹھا سکے گا، جب تک کہ ارادہ میں کوئی چیز موجود نہ ہو۔اگر ارادہ میں وزن اٹھانے کی نیّت موجود ہے تو ہاتھ وزن اٹھا سکتا ہے ورنہ نہیں۔

سورہ یٰسین کی آیت نمبر 82 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو کہتا ہے" ہو جا "اور وہ وہ جاتی ہے۔"

غور طلب بات یہ ہے کہ صرف ارادہ کام نہیں کرتا بلکہ ارادہ میں حرکت کام کرتی ہے اور حرکت اس طرح دی جاتی ہے کہ کہا جائے۔ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ قانون بیان فرمایا ہے۔اس میں اِستثناء نہیں ہے۔اس قانون کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ روح میرے ربّ کے امر سے ہے۔جس کا مطلب یہ ہوا کہ روح کام کر سکتی ہے۔

البتہ یہ مسئلہ زیر بحث آتا ہے کہ ہر آدمی ایسا نہیں کر سکتا حالانکہ ہر آدمی کے اندر روح موجود ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ شخص ابھی ایک ارادہ کرتا ہے۔نیّت نہیں کی ہے اور ارادہ بدل دیتا ہے۔ایسا اکثر اوقات ہوتا ہے کہ دوسرا ارادہ پہلے ارادہ کے بالکل برعکس ہوتا ہے اور ارادہ میں نیّت شامل نہیں ہوتی جس کی وجہ سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

ارادہ کے ساتھ نیّت یا حرکت کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کا ذہن کسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو جائے۔

ذہن کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کے لئے مراقبہ، خود ترغیبی، سانس کی مشقیں وغیرہ کرائی جاتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں آہستہ آہستہ نیّت کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور یقین کی طاقت بڑھتی رہتی ہے۔

روح کی قوت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جتنی روح کی قوت بڑھے گی اتنا ہی اس کا سرکل (circle) بڑھتا جائے گا۔ اس کا احاطہ زیادہ ہوتا جائے گا۔ اور جتنے فاصلہ پر بھی وہ ذہنی قوت سے کام لینا چاہے گا۔ لے سکے گا۔ لیکن ایک چیز ضروری ہے اور وہ میڈیم ہے۔ آدمی کسی چیز کو میڈیم بناتا ہے اور میڈیم بنا کر کام کرتا ہے۔ خواہ وہ میڈیم کوئی بھی ہو۔ کوئی جاندار شئے ہو یا کوئی غیر جاندار چیز ہو۔ کوئی تصوّر ہو، کوئی نقطہ ہو۔

قانون:

جسے آدمی بے جان کہتا ہے دراصل وہ بے جان نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے اندر برقی رَو گردش کر رہی ہے۔ میڈیم بنانے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کسی شخص کو اپنی قوتوں پر کوئی بھروسہ نہیں ہے اور ابتدائی حالات میں تو بالکل نہیں ہوتا۔

تعویذ، عمل، توجّہ اور دَم دُرود کے ذریعے علاج عورتوں میں زیادہ رائج ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ مرد کے دماغ میں اینچ پینچ، چون چراں اور منطق کی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں۔ کم از کم ہمارے معاشرے میں عورتوں کے ذہن میں اس قسم کی باتیں نہیں ہوتیں۔ ان کو جو بتا دیا جاتا ہے وہ اس پر یقین کر لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ارادہ اور نیّت کی قوتیں الگ الگ بہت کم ہوتی ہیں۔ اکثر مجتمع ہوتی ہیں اور ان کا اجتماع جو بذات خود ''روشنی'' ہے، قوت بخشتا ہے۔

لوحِ محفوظ :

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق تخلیق میں دوہرے دورخ کام کر رہے ہیں۔

''وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْن ''(سورة الرعد – آیت نمبر ۳)

قانون یہ ہے کہ جب دو اشیاء باہم ملتی ہیں تو ایک نئی شئے وجود میں آ جاتی ہے۔

مثال:

کسی صاحب یقین نے کسی کاغذ کے پرزہ پر کوئی آیت یا کوئی نقش لکھ کر دیا۔ جس نے یہ نقش حاصل کیا ہے اس کے اندر بھی یقین ہے۔ جب دو یقین ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو جو کچھ ارادہ میں موجود ہے وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔

ایک طالب علم اِمتحان میں کامیابی کے لئے پوری محنت اور لگن سے کورس کی کتابیں پڑھتا ہے مگر ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی ہے کہ شاید اِمتحان میں کامیابی نہ ہو، اتنا اچھا رزلٹ نہ آئے جس کی اسے ضرورت ہے، وہ غیبی امداد حاصل کرنے کے لئے تعویذ حاصل کرتا ہے یا کوئی عمل پڑھتا ہے تو اس طرز عمل سے اس کے اندر یقین کی قوت پیدا ہو جائے گی۔ اور یقین کی اس طاقت سے منتشر ذہن یک سُو ہو جائے گا۔ ذہنی یکسوئی حافظہ کی بحالی اور فہم پیدا کرتی ہے۔ چونکہ ذہن منتشر نہیں ہے یقین موجود ہے۔ حافظہ ٹھیک کام کر رہا ہے۔ فہم اپنی جگہ مصروف عمل ہے۔ پرچے حل کرنے میں اسے کوئی دقّت پیش نہیں آئے گی اور وہ اپنے منشاء کے مطابق اِمتحان میں کامیابی حاصل کر لے گا۔

کیفیت اور خیال میں فرق

سوال : روحانیت کا کوئی طالب علم مراقبہ کرتا ہے تو اسے بہت ساری چیزیں نظر آتی ہیں۔ مراقبہ میں دیکھی ہوئی چیزیں کیا حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں ان کا تعلق خیال سے تو نہیں ہوتا؟ اگر ان چیزوں کا تعلق خیال سے ہے تو مراقبہ کی اپنی کیفیت اور خیال میں تمیز کیسے کی جائے گی؟

جواب: اس سوال کے جواب میں ایک سوال یہ نکلتا ہے کہ کیا ہماری زندگی میں کوئی بھی ایک ایسا عمل موجود ہے کہ جس کو ہم تخیّل کے علاوہ کوئی نام دے سکیں۔ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، ان سب کا تعلق بھی خیال سے ہی ہے۔ اگر کسی آدمی کو زندگی میں پانی پینے کا خیال نہ آئے تو آدمی کبھی پانی نہیں پئے گا۔ پہلے خیال آتا ہے پانی پینے کا یعنی پیاس لگتی ہے، پھر آدمی پانی پیتا ہے۔ بغیر پیاس کے کوئی آدمی پانی نہیں پیتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پیٹ ساتھ لگا دیا ہے۔ جب تک آدمی کو بھوک نہیں لگتی، آدمی روٹی نہیں، کھاتا تو بھوک لگنا کیا ہے۔ بھوک لگنا بھی ایک خیال ہے۔

ایک خیال کا نام بھوک رکھ لیا، پانی پینے کے خیال کا نام پیاس رکھ لیا، اعصاب تھک جاتے ہیں تو ان کو آرام کی ضرورت پیش آتی ہے، آرام کا نام نیند رکھ لیا۔ لیکن جب تک کسی آدمی کو نیند نہیں آئے گی وہ سوئے گا نہیں۔

آج کل تو یہ بہت زیادہ ہو گیا ہے کہ نیند کی گولیاں بھی کھاتے ہیں پھر بھی نیند کا خیال نہیں آتا ہے۔ اس میں کہیں گڑ بڑ ہو جاتی ہے۔ پھر یہی صورتحال ہر انسان کے ساتھ آپ دیکھتے ہیں کہ سونے کے بعد جاگنا بھی پڑتا ہے۔ کوئی انسان ساری زندگی سو نہیں سکتا۔ کوئی انسان ساری زندگی بیدار نہیں رہ سکتا۔ تو سونے کے بعد جو اٹھنا ہے وہ بھی ایک خیال ہے۔ تو یہ ساری زندگی خیال کے اوپر depend کرتی ہے۔ زندگی کا کوئی بھی ایک عمل کوئی بھی ایک جذبہ کوئی بھی ایک تقاضہ ایسا نہیں ہے کہ جس کو آپ یہ کہہ سکیں کہ یہ بغیر خیال کے ہم پورا کر لیتے ہیں۔

زندگی کے جتنے بھی جذبات ہیں ان کا تعلق خیال سے ہے۔ پہلے خیال آئے گا۔ آپ اس خیال کے اوپر depend کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی بھی ایک عمل، کوئی بھی ایک جذبہ، کوئی بھی ایک تقاضہ ایسا نہیں ہے کہ جس کو آپ یہ کہہ سکیں یہ بغیر خیال کے پورا پورا کر لیتے ہیں۔

زندگی کے جتنے بھی جذبات ہیں ان کا تعلق خیال سے ہے۔ پہلے خیال آئے گا۔ آپ اس خیال کو قبول کریں گے اس کے بعد آپ عمل کریں گے۔ یہ ساری زندگی عالم تخیّل ہے۔ عالم تخیّل کا مطلب ہے خیالات کے اوپر depend کرنا۔

اس سوال کا جواب کہ روحانیت میں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں کیا وہ حقیقت پر مبنی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انسان کے اندر یقین کا پیٹرن موجود ہو تو جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے حقیقت پر مبنی ہے اور اگر انسان کے اندر یقین کا پیٹرن موجود نہیں ہے تو وہ بھی فکشن ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ہم سب کہتے ہیں اللہ ہے، اللہ دیکھ رہا ہے اور باوجود کہ ہم کہتے ہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے، ہم گناہ کر رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ یعنی ایک آدمی کسی آدمی کے سامنے بے ستر ہونا پسند نہیں کرتا۔ شرم و حیا کی وجہ سے۔ اس لئے کہ وہ آدمی یہ دیکھ رہا ہے کہ ایک آدمی کھڑا ہے اور اُس سے وہ شرم کرتا ہے، حالانکہ وہ اسی جیسا آدمی ہے لیکن دوسری طرف جب وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے تو کوئی آدمی گناہ کیسے کر سکتا ہے؟

اِس کا مطلب کیا ہے؟

وہ جو یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے یہ اس کے لئے محض ایک لفظ ہے۔ یقین کا پیٹرن اس کے اندر موجود نہیں ہے جب یہ بات یقین بن جائے کہ اللہ دیکھ رہا ہے تو آدمی گناہ کیسے کر سکتا ہے؟ کوئی آدمی اللہ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم کیسے اٹھا سکتا ہے؟

ایک قصہ ہے کسی بزرگ کا کہ ان کے دو مرید تھے۔ ایک مرید پر وہ بہت زیادہ شفقت کرتے تھے۔ جس مرید پر زیادہ شفقت کرتے تھے اسے دوسرے لوگ ذرا محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ تجربے کیلئے اپنے ایک مرید کو کہا کہ بھائی یہ چیز ایسی جگہ دبا آؤ جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ وہ جنگل میں کہیں گیا، ادھر ادھر سب جگہ دیکھا وہاں کوئی آدمی نہیں تھا، وہ چیز وہیں دبا کے آگیا۔

پھر اس کو بلایا جس پہ زیادہ شفقت تھی کہ میاں یہ ایک چیز ہے ایسی جگہ دبا کے آؤ جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ وہ صاحب صبح کے گئے شام ہوگئی۔ لوگوں نے اپنے پیر صاحب سے کہا کہ دیکھئے حضرت اتنا ذرا سا کام تھا سارا دن لگا دیا، شام کو وہ تھکے ماندے ہانپتے کانپتے آئے اور وہ چیز پیر صاحب کے سامنے رکھ دی۔ پیر صاحب نے کہا کہ ہم نے تم سے کہا تھا کہ اس کو دبا کے آنا جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ کہنے لگے صاحب صبح سے شام ہوگئی تلاش کرتے ہوئے کوئی جگہ ایسی نہیں ملی، جہاں بھی گیا اللہ دیکھ رہا تھا۔ تو دیکھئے یہ یقین کا پیٹرن ہے تو اگر کوئی انسان مراقبے میں کچھ دیکھتا ہے اس کے اندر اگر یقین کا پیٹرن ہے تو وہ کچھ دیکھ رہا ہے، صحیح دیکھ رہا ہے اور اگر اس کے اندر یقین کا پیٹرن نہیں ہے تو اگر وہ صحیح دیکھ رہا ہے تو غلط دیکھ رہا ہے۔

مراقبہ کا تعلق ایک طرزِ فکر سے ہے۔ ہر انسان کے اندر دو طرزِ فکر کام کرتی ہیں۔ ایک طرزِ فکر یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو سامنے رکھتا ہے اور صرف اپنی ذات کو سامنے رکھنا شیطنیت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ اس نے کہا صاحب میں تو اس سے بہت زیادہ پڑھا لکھا ہوں۔ میں تو مُعلّمُ الملکوت

ہوں۔ میں تو آگ کا بنا ہوا ہوں میں اسے کیسے سجدہ کروں؟ سڑی ہوئی مٹی سے بنے ہوئے آدمی کو میں کیسے سجدہ کر سکتا ہوں؟

اِس کا کیا مطلب ہوا؟

اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیطان کی اپنی ذات سامنے تھی۔ اللہ کا حکم سامنے نہیں تھا۔ غلطی آدم بھی کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا ہم نے تمہیں منع کیا تھا۔ تم نے ہماری حکم عدولی کیوں کی۔ دیکھئے! اب اللہ تعالیٰ کے سامنے آدم نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ نے جنّت بنائی۔ آپ نے درخت بنایا۔ اگر آپ درخت ہی نہ بناتے تو میں اس کے قریب ہی نہ جاتا وغیرہ وغیرہ۔ بس انہوں نے کہا تو کیا کہا۔

"اے میرے ربّ، میں نے تو اپنے اوپر ظلم کر لیا۔ اگر آپ نے مجھے معاف نہیں کیا تو میرا تو کہیں ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ آپ میرے اوپر رحم فرمادیں مجھے معاف کر دیں۔" (سورۃ الاعراف۔آیت نمبر۔23)

اب فرق دیکھئے، شیطان نے اپنی ذات کو سامنے رکھا وہ ملعون قرار پایا۔ آدم نے اپنی ذات کی نفی کر دی، وہ پیغمبر ہو گئے۔

تو اگر اپنی ذات کی نفی ہے، پھر تو وہ روحانی طرزِ فکر ہے اور اگر انسان کی اپنی ذات کی نفی نہیں ہے، تو وہ جو کچھ بھی دیکھ رہا ہے اس میں شیطانی وسوسہ ضرور ہے۔

باب ششم

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد

سوال : سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا ارشاد ہے کہ "مر جاؤ مرنے سے پہلے"۔ حضور ﷺ کے اس حکم پر عمل کرنے کیلئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

جواب: سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ و السّلام کے اس ارشاد مبارک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انسان خواہشات کو ختم کر دے یا خواہشات پر غلبہ حاصل کر لے۔ تصوّف کا قانون یہ ہے کہ زندگی خواہشات کا دوسرا نام ہے۔ خواہشات اگر نہ ہوں تو زندگی بے معنی ہو کر رہ جائے۔ کھانا ایک خواہش ہے۔ پینا ایک خواہش ہے۔ سونا ایک خواہش ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کے معاملات میں ایثار کرنا ایک خواہش اور جذبہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ کوئی زندہ آدمی خواہشات سے انحراف نہیں کر سکتا۔ زندہ رہنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے اندر تسلسل سے خواہشات پیدا ہوتی رہیں۔

"مر جاؤ مرنے سے پہلے" کا مفہوم یہ ہے کہ موت کا یقین حاصل کر لو اور یقین کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کہ یقین مشاہدہ نہ بن جائے۔ انسان کو جب موت کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ مرنے کے بعد کی زندگی سے واقف ہو جاتا ہے۔ ہمیں اس بات کا یقین حاصل ہے کہ دنیا میں ایک جگہ لندن ہے اور دوسری جگہ لاہور ہے۔ یہ

یقین ہی ہے جو ہمیں لندن پہنچادیتا ہے اور لاہور بھی لے جاتا ہے۔ جس طرح ہم لندن اور لاہور جا سکتے ہیں اسی طرح ہم موت کے بعد کے عالم کا یقین حاصل کر کے اس زندگی میں رہتے ہوئے بھی موت کے عالم میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ چونکہ موت کے بعد کے عالم کو ہم دیکھتے ہیں اس لئے لندن اور لاہور کی طرح وہاں جانا بھی ہمارا اختیاری عمل بن جاتا ہے۔ موت سے ہم اس لئے ڈرتے ہیں کہ ہم موت کے بعد کی زندگی سے ناواقف ہیں اور ناواقفیت کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے یقین کو متحرّک نہیں کرتے۔ موت دراصل ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونے کا نام ہے۔

''مر جاؤ مرنے سے پہلے''کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس عالمِ آب و گل کی زندگی میں مرنے کے بعد کی زندگی سے باخبری حاصل کر لیں۔

تفکر کرنے سے یہ بات بہت آسانی کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالٰی نے جو کچھ ارشاد کیا ہے۔اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1. ایک حصّہ میں معاشرتی قواعد وضوابط ہیں یعنی انسان کو زندگی میں کن اقدار کا پابند ہونا ضروری ہے؟

اس حصّہ میں عام انسانوں کے حقوق، بیوی بچوں کے حقوق، شادی بیاہ، پاکی ناپاکی اور معیشت و معاشرت کے تمام مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔

2. دوسرا حصّہ نوعِ انسانی کی تاریخ پر مشتمل ہے یعنی انبیاءِ علیہم السّلام کی تعلیمات ان کے قصّے اور قوموں کے عروج وزوال کا تذکرہ، کس طرح قومیں بنیں؟ کتنی ترقی کی؟ کیسے اللہ تعالٰی کے قانون سے انحراف کیا؟ اور کس طرح مٹ گئیں؟

3. تیسرا حصّہ ''مَعاد'' یعنی انسان مر کیوں جاتا ہے؟ اور مرنے کے بعد کی زندگی کیا ہے؟ اس ضمن میں وہ تمام راز آشکار ہوتے ہیں جو تسخیر کائنات سے متعلق ہیں۔ کائنات کو مسخر کرنے کے قوانین میں اور فارمولوں میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ ٹائم اور اسپیس یعنی زمان و مکان کی نفی کس طرح ممکن ہے؟ ایک آدمی زمین پر بیٹھے بیٹھے عرش

پر کیسے پہنچ جاتا ہے؟اور اسے آسمانوں کی باتیں کس طرح معلوم ہونے لگتی ہیں؟ ظاہر ہے ان مراحل سے گزرنے کے بعد جب انسانی دماغ کو اتنی سکت مل جائے گی کہ وہ آسمانوں میں ہونے والی باتیں در پیش آنے والے حالات وواقعات کو دیکھ اور سمجھ لے تو اس کیلئے زمین پر موجود کسی شئے کو چاہے اس کا فاصلہ کتنا ہی ہو دیکھ لینا اور اس کے متعلق معلومات حاصل کر لینا معمولی بات ہے۔

موت کے بعد کی زندگی کیا ہے؟

آدمی مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے؟

وہاں اس کی بود و باش کی کیا قدریں ہیں؟

کیا کھاتا ہے؟اور کس طرح گفتگو کرتا ہے؟

یہ سب باتیں قرآن پاک میں مَعاد کے عنوان سے بیان کی گئی ہیں۔یہی باتیں چونکہ سمجھ میں نہیں آتیں اس لئے متشابہات کہہ کر چھوڑ دی جاتی ہیں حالانکہ قرآن پاک میں کوئی بات متشابہ نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی پہلی آیتوں میں اس کی وضاحت کر دی ہے:

''یہ کتاب، نہیں شک اس میں۔''

اب یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اگر ہم حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے فرمان ''مر جاؤ مرنے سے پہلے'' پر عمل کرنے کیلئے قرآن پاک میں بیان کردہ مَعاد کی باتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں تو حضور ﷺ کے شاگرد اور وراثت یافتہ کسی ایسے بندے کو تلاش کرنا پڑے گا جو حضور ﷺ کے علم کی روشنی میں قدم بہ قدم چلا کر ہمیں مَعاد کا مشاہدہ کرا دے۔

تدلّیٰ اور علم الاسماء

سوال :اسلامی تصوّف میں تخلیقی فارمولوں کے ضمن میں ''تدلّیٰ ''کی اصطلاح بیان ہوئی ہے۔تدلّیٰ سے کیامراد ہے؟تدلّیٰ اور علم الاسماء میں کیافرق ہے؟

جواب: قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے جہاں آدم علیہ السّلام کی نیابت و خلافت کاتذکرہ کیاہے وہاں بنیادی بات یہ بیان ہوئی ہے کہ آدم علیہ السّلام کو علم الاسماء عطاکیاگیاہے۔جو کائنات میں کسی کو حاصل نہیں ہے۔علم الاسماء ہی کی بنیاد پر فرشتوں نے آدم علیہ السّلام کو سجدہ کیا۔علم الاسماء کی حیثیت میں جو علم آدم علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وُدیعت کیاگیاہے اس کو روحانی زبان میں ''تدلّیٰ''کہتے ہیں۔

انسان کا شرف یہ ہے کہ وہ اللہ کریم کانائب ہے اور وہ نیابت کے علوم سے واقف ہے۔اسے بحیثیت انسان کے اللہ تعالیٰ کے اختیارات حاصل ہیں۔جب کوئی روحانی علوم کا طالب علم اپنے مرشد کی ہمت و نسبت سے نیابتی اختیارات کو جاننے، سمجھنے اور استعمال کرنے کے علوم کو حاصل کرتاہے تو اسے یہ علم ہو جاتاہے کہ اللہ کریم کا ہر اسم دراصل اللہ کی ایک صفت ہے اور یہ صفت ہر بندے کو اللہ کی طرف سے ازل میں حاصل ہوئی تھی۔بندے سے مراد نوعِ انسان اور نوعِ انسان کے تمام افراد ہیں۔

آدم کی اوّلاد جب صفت تدلّیٰ کو حاصل کرناچاہے تو اس کے علم میں یہ بات ہونی چاہئے کہ اللہ رحیم ہے اور رحیم صفاتی اعتبار سے تخلیق کرنے والی ہستی ہے۔روحانی طالبِ علم اگر مراقبہ کے ذریعے اسمِ رحیم کی صفات کازیادہ سے زیادہ ذخیرہ اپنے لاشعور میں کرلے تو اس کے اوپر وہ علوم منکشف ہو جاتے ہیں جو تخلیق میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ کریم نے اسی اسمِ رحیم کی صفت کا یا تخلیقی علم کاتذکرہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی نسبت سے کیاہے۔یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام مٹی کے جانور میں پھونک مارکراڑادیتے تھے یاپیدائشی کوڑھی یااندھے کواچھا

کر دیتے تھے۔اس عمل میں ان کے اندر اسمِ رحیم سے متعلق اللہ کی تخلیقی صفَت متحرّک ہو جاتی تھی۔یا وہ اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے اسمِ رحیم کی صفَت کو عملاً جاری فرما دیتے تھے۔اللہ کریم نے حضرت عیسیٰؑ علیہ السّلام کے اس معجزے کا تذکرہ کرکے تخلیق کا ایک فارمولا بیان کیا ہے۔ تخلیقی فارمولا یہ ہے کہ انسان کے اندر اللہ کی روح کام کر رہی ہے۔جب تک انسان کے اندر یا آدم زاد کے اندر روح موجود نہیں ہے آدم کا وجود بے حرکت مٹّی کا پتلا ہے۔یہی بات اللہ نے حضرت عیسیٰؑ علیہ السّلام سے کہی ''اور جب تو بناتا ہے مٹی سے جانور کی صورت میرے حکم سے پھر اس میں پھونک مارتا ہے تو ہو جاتا ہے جانور۔''یعنی مٹی کے جانور میں حضرت عیسیٰؑ علیہ السّلام تخلیقی فارمولے کے تحت یا اسمِ رحیم کی صفَت کے تحت پھونک مارتے تھے تو وہ اڑ جاتا تھا۔پیدائشی اندھے اور کوڑھی کے اوپر دم کرتے تھے یا پھونک مارتے تھے تو بھلا چنگا ہو جاتا تھا۔اللہ کریم کا یہ فیضان قرآن کریم کے ذریعے نوعِ انسان کے لئے عام ہے۔کوئی بھی انسان قرآن میں تفکر کرکے سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی نسبت سے اللہ کریم کے دیئے ہوئے تخلیقی اختیارات یا تدلّیٰ سے مستفیض ہو سکتا ہے۔اسی کی بنیاد پر انسان اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ ہے۔

ارتقائی منازل

سوال: روحانیت کے راستے پر چلنے والے طالب علموں کے اندر کس قسم کی طرزِ فکر ہونی چاہئے کہ وہ ارتقائی منازل طے کر سکیں؟

جواب: روحانیت کے راستے پر چلنے والے سالک کے اندر یہ طرزِ فکر ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے اوپر چھوڑ دے۔قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ

''وہ لوگ جو راسخ فی العلم ہیں کہتے ہیں ہمارا ایمان ہے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔''(سورۃ آلِ عمران ۔آیت نمبر 7)

یہی وہ اصل طرزِ فکر ہے جو انسان کے اندر راستغناء پیدا کرتی ہے۔اِستغناء کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھا رہے۔ کوشش اور جدّوجہد اس پر لازم ہے۔ کوشش اور جدّ وجہد کے ساتھ نتائج پر نظر نہیں ہونی چاہئے بلکہ نتائج اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔یعنی جو کچھ ہو رہا ہے یا ہم کر رہے ہیں وہ سب اس لئے کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا چاہتا ہے۔روحانیت میں اس بات کو ذہن نشین کرا دیا جاتا ہے کہ انسان کی زندگی اور زندگی کے تمام اعمال واشغال سب مِن جانب اللہ ہیں۔اس کی نظر عذاب ثواب، توقع اور صلہ وستائش پر نہیں ہوتی وہ برائیوں سے اس لئے بچتا ہے کہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔اچھائیوں کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔عذاب وثواب کا جب تذکرہ آتا ہے تو اس میں ڈر، خوف، دہشت، ہیبت اور آسائش وآرام اور آسانیاں پیش نظر ہوتی ہیں۔کسی سالک کے لئے یہ طرزِ فکر زہرِ قاتل ہے۔اس طرزِ فکر کا بندہ روحانیت میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں ہوتا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سراپا محبت ہے۔ جہاں ڈر آ جاتا ہے دوری واقع ہو جاتی ہے۔اللہ سے ڈرنے کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اللہ تعالیٰ سے دور ہو گیا اور اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کا منشا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے قریب ہو۔

انسان کی ذہنی طرزِ فکر ماحول سے بنتی ہے۔جس قسم کا ماحول ہوتا ہے اس ماحول میں تمام اعمال کے نقوش دروبست یا کم وبیش ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ جس حد تک یہ نقوش ہلکے یا گہرے ہوتے ہیں اسی مناسبت سے انسان کی زندگی کی ایک نہج بن جاتی ہے۔اگر کوئی بچہ ایسے ماحول میں پرورش پاتا ہے جہاں والدین اور اس کے ارد گرد ماحول کے لوگ ذہنی پیچیدگی، بددیانتی اور ان اعمال کے عادی ہوں جو معاشرے کے لئے ناقابلِ قبول اور ناپسندیدہ ہیں، وہ بچہ لازمی طور پر قبول کرے گا۔اسی طرح اگر بچے کا ماحول پاکیزہ ہے تو وہ پاکیزہ نفس ہو گا۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ بچہ وہی زبان سیکھتا ہے جو ماں باپ بولتے ہیں وہی عادات واطوار اختیار کرتا ہے جو والدین سے ورثہ میں منتقل ہوتے ہیں۔ قانون یہ ہے کہ:

بچہ کا ذہن آدھا والدین کا ورثہ ہوتا ہے اور آدھا ماحول کے زیر اثر بنتا ہے۔

یہ مثال صرف بچوں کے لئے مخصوص نہیں، اِس میں افراد اور قوموں پر بھی یہ قانون لاگو ہوتا ہے۔

ابتداءِ آفرینش تااِیں دَم، جو کچھ ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا آئندہ ہو گا وہ سب کا سب نوعِ انسانی کا ورثہ ہے۔ یہ ورثہ قوموں میں اور افراد میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اسی کو ہم ارتقاء کہتے ہیں۔

مختصراً کسی روحانی طالب علم کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ طرزِ فکر دو ہیں۔ ایک طرزِ فکر بندے کو اپنے خالق سے قریب کرتی ہے اور دوسری طرزِ فکر بندے کو اپنے خالق سے دور کرتی ہے۔ ہم جب کسی انعام یافتہ شخص سے قربت حاصل کرتے ہیں جسے وہ طرزِ فکر حاصل ہے جو خالق سے قریب کرتی ہے تو قانون کے مطابق ہمارے اندر وہی طرزِ فکر کام کرنے لگتی ہے اور ہم جس حد تک اس انعام یافتہ شخص سے قریب ہو جاتے ہیں اتنی ہی اس کی طرزِ فکر ہمیں حاصل ہو جاتی ہے اور انتہا یہ ہے کہ دونوں کی طرزِ فکر ایک بن جاتی ہے۔

نورِ باطن

سوال: بیعت ہونا کیوں ضروری ہے؟ ایک دفعہ کسی سے بیعت ہونے کے بعد کیا آدمی کسی اور سے بیعت ہو سکتا ہے؟

جواب: تصوّف نام ہے نورِ باطن کا اور نورِ باطن ایسا خالص ضمیر ہے جو تمام آلائش سے پاک ہو۔ تصوّف سالک کو غیب سے متعارف کراتا ہے اور غیب میں مصروف روحانی دنیا کا مشاہدہ و مطالعہ کراتا ہے۔ تصوّف بندہ کو خدا تک لے جاتا ہے۔ بندہ اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جس مقام کے حامل بندوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں ان کا ہاتھ ان کی آنکھ ان کی سماعت اور ان کی زبان بن جاتا ہوں۔

کسی بھی علم کو سیکھنے کے لئے استاد کی ضرورت مُسلّمہ ہے۔ استاد کے بغیر کوئی بھی علم شجرِ بے ثمر ہے۔ استاد اپنے شاگردوں کی طبیعت، صلاحیت، سکت اور سمجھ کے مطابق تربیت کرتا ہے۔ استاد اس روحانی شخصیت کا نام ہے جس کو کسی علم پر پورا پورا عبور حاصل ہو اس علم کے اصول و ضوابط اور قوانین سے پوری طرح واقف ہو اور اس کے حُصول میں پیش آنے والے مسائل، آسانیاں، مشکلات وغیرہ سے نہ صرف اچھی طرح واقف ہو بلکہ ان کا سدِّباب بھی جانتا

ہو۔استاد سالک کو مختلف منزلوں سے گزار کر وہ گوہر مقصود سالک کے حوالے کر دیتا ہے جو کسی سالک کا مقصود اور منشاء ہوتی ہے۔ تصوّف سیکھنے کے لئے اسی بیعت کا ہونا ضروری ہے۔ایک دفعہ بیعت ہونے کے بعد قانوناً آدمی کسی بھی دوسری جگہ بیعت نہیں کر سکتا۔ جس طرح کسی شخص کی دو مائیں نہیں ہو سکتیں اسی طرح روحانیت کے حُصول کے سلسلے میں دو پیر و مرشد کا تصوّر ممکن نہیں۔ جہاں تک فیض کا تعلق ہے وہ پیر و مرشد کے وصال کے بعد ان کی روح پُر فتوح سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یاد رکھئے روح کبھی نہیں مرتی وہ ہمیشہ زندہ رہتی ہے کیونکہ وہ قائم بالذات ہے۔ لیکن اگر مرید کا ظرف بننے سے پہلے اگر پیر و مرشد کا وصال ہو گیا ہو اور وہ اس کی تربیت پوری نہ کر سکا ہو تو مرید اس ظرف کو بنانے اور تربیت پوری کرنے کے لئے کسی روحانی استاد جس کو اس نے اچھی طرح پرکھ لیا ہو، کے حضور طالب ہو سکتا ہے لیکن فیض صرف اسی پیر و مرشد سے حاصل ہو گا جس کے ہاتھوں پر پہلی بار اس نے بیعت کی ہے۔

ذہن بیمار یا جسم بیمار

سوال :انسان بیمار کیوں ہوتا ہے اس کے بارے میں مختلف مکاتب فکر کی رائے مختلف ہے مثلاً اہل فلسفہ و نفسیات کہتے ہیں کہ بیماری ذہن سے جسم پر منتقل ہوتی ہے جب کہ میڈیکل سائنس بیماری کی وجوہات کو جسم میں تلاش کرتی ہے جس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ذہن بیمار ہوتا ہے یا صرف جسم ہی بیمار ہوتا ہے؟ کیا ذہنی مسئلے کو حل کرنا چاہئے یا جسم کو علاج بہم پہنچایا جائے جس سے شفا حاصل ہو؟

جواب: انسانوں کی زندگی کا دار و مدار خیالات کے اوپر ہے اور خیالات ماحول سے متاثر ہوتے ہیں یا ماحول خیالات سے بنتا ہے۔ اگر آپ کے ماحول میں صفائی نہیں pollution زیادہ ہے۔ دھوئیں کا pollution شور کا pollution ۔۔۔۔۔۔انسانی ذہنی پیچیدگی کا pollution ۔۔۔۔۔۔خود غرضی کا pollution ۔۔۔۔۔۔ ہو تو آدمی کا ذہن متاثر ہوتا ہے۔ اور انسانی ذہن کے اوپر ایک دباؤ پڑتا ہے، خیالات میں دباؤ سے معدہ متاثر ہوتا ہے۔ نیند ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔ آدمی الجھا الجھا رہتا ہے۔۔۔۔۔۔ مزاج میں تلخی اور چڑچڑاپن آ جاتا ہے۔ یہ سب عوامل مل کر بیماری بن جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔بیماری کا اثر پہلے دماغ قبول کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ اگر ماحول میں صفائی ستھرائی ہو۔۔۔۔۔۔ پانی حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق ہو، غذاؤں میں ملاوٹ نہ ہو۔۔۔۔۔۔ نمک میں پتھر پِسا ہوا نہ

ہو۔ مرچوں میں اینٹیں پسی ہوئی نہ ہوں۔۔۔۔۔۔ دھنیے میں لکڑی کا بُرادہ نہ ملایا گیا ہو۔ گھر میں ناقص تیل ملا ہوا نہ ہو تو انسان کا ذہن ہلکا رہتا ہے۔ غذا کی افادیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر خود غرض انسان! انسانی زندگی میں زہر گھولنے لگے تو نتیجے میں خیالات کی پاکیزگی بھی ختم ہو جاتی ہے اور انسان کے ذہن سے پریشر اور دباؤ جسمانی بیماری کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

بیماری کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ بیماری ہمیشہ وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں زندگی میں اور زندگی کے کسی بھی شعبے میں اعتدال برقرار نہ رہے۔ اگر انسان دولت پرستی میں مبتلا ہے۔ اس نے دولت کو زندگی کا نصب العین بنایا ہے۔ آرام و آسائش کا وقت بھی دولت کے حُصول میں صرف ہو جاتا ہے ایسی صورت میں دولت اس کے لئے عذاب بن جاتی ہے۔ عذاب کا مطلب ہے آگ، گرمی، شدت، تپش۔۔۔۔۔۔ تیز گرم جھلسا دینے والی ہوا، گیس۔ جب یہ چیزیں خون میں شامل ہو جاتی ہیں تو دماغ ان سے نبرد آزما ہو جاتا ہے اور وہ ہر حال میں اپنی حفاظت کرتا ہے۔ لیکن مسلسل تپش اور جھلسا دینے والی لہروں سے وہ متاثر ہو کر اس تپش کو جسم کے کسی حصے پر پھینک دیتا ہے اور جس حصے پر یہ عذاب نازل ہوتا ہے اس حصے میں جھلنے کی وجہ سے cavity بن جاتی ہے اور بار بار جھلنے سے اس کے اندر ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے اور یہی وہ کیڑا ہے جسے آج کی اصطلاح میں کینسر کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ کیڑا ٹشوز کے جھلنے سے اس کے اندر سڑاند سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے اس کی غذا بھی ٹشوز ہوتے ہیں۔ جتنا سیال خون ان ٹشوز کے اندر سے گزرتا ہے کینسر ان سب کو پی لیتا ہے۔ نتیجے میں ریڈ پارٹیکلز کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

بیماری کا تعلق ذہن سے ہے طرزِ فکر سے ہے جب ذہن بیمار ہو جاتا ہے تو ذہن یا دماغ اس بیماری کو جسم کے اوپر پھینک دیتا ہے۔ اگر ذہن پاکیزہ ہو۔ اگر خیالات میں یکسوئی ہو۔ بندہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہو اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہے تو اسے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے اسی مناسبت سے بیماریاں بندے کو کم شکار کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔

روح کہاں جاتی ہے؟

سوال : کہتے ہیں کہ ہر جاندار چیز کی روح ہوتی ہے۔انسان جب مرتا ہے تواس کی روح عالمِ اَعراف میں چلی جاتی ہے۔جانوروں، پھولوں اور پودوں کے مرنے، کٹنے یا سوکھ جانے کی صورت میں ان کی روح کہاں چلی جاتی ہے؟

جواب: دو طرح کی زندگی ہے ایک مکلّف دوسری غیر مکلّف۔انسان اور جنّات چونکہ مکلّف مخلوق ہیں۔ مکلّف سے یہ مراد ہے کہ انہیں جزااور سزا سے گزرنا ہے،اس لئے ان کی روحیں عالمِ اَعراف میں قیام کرتی ہیں اور حشر و نشر میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق انہیں سزا ملتی ہے یا جزا ملتی ہے۔ باقی دوسری غیر مکلّف مخلوق کی روحیں روشنیوں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

علم الغیب کیا ہے؟

سوال: علم الغیب کیا ہے اور کیارسول اللہ ﷺ کو علم الغیب حاصل تھا یا نہیں؟

جواب: رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس بہت ہی اعلیٰ وارفع، حاصلِ کائنات اور باعثِ تخلیقِ کائنات ہے۔ حضور ﷺ کو علم الغیب حاصل تھا یا نہیں تھا۔۔۔۔۔۔یہ توانتہائی بچگانہ بات ہے۔اگر کوئی آدمی یہ سوال کرے کہ جناب حضرت جبرائیل علیہ السّلام کی شخصیت مظہر کی ہے یا غیب کی؟۔۔۔۔۔۔امر ہے کہ ایک عام آدمی بھی جواب میں یہی کہے گا کہ حضرت جبرائیل علیہ السّلام کی شخصیت غیب کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب قرآنِ پاک نازل فرمایا تو حضرت جبرائیل علیہ السّلام مسلسل حضور پاک ﷺ کے پاس تشریف لاتے رہے اور قرآن کا نزول حضرت جبرائیل علیہ السّلام کے ذریعے ہوتا رہا۔اگر رسول اللہ ﷺ کو غیب کی نظر حاصل نہ ہوتی تو حضرت جبرائیل علیہ السّلام کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔یہ بالکل ایک اور ایک جمع دو والی بات ہے یعنی یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اس پر مناظرہ ہو یا مباحثہ کیا جائے۔دوسری دلیل رسول اللہ ﷺ کی معراج ہے۔رسول

اللہ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے۔ یہ آپ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ قربت حاصل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور ہمارے اور ہمارے بندے کے درمیان فاصلہ اتنا کم رہ گیا کہ دو کمانوں سے بھی کم اور ہم نے اپنے بندے سے راز و نیاز کی باتیں کیں اور ہمارے بندے نے جو کچھ دیکھا جھوٹ نہیں دیکھا۔''(سورۃ النجم)

اللہ تعالیٰ سے گفتگو، اللہ تعالیٰ سے قربت، آسمانوں کی سیر، یہ سب کیا ہے؟۔۔۔۔۔اس کو ہم کسی صورت سے غیب کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ کیا رسول اللہ ﷺ کو علم الغیب اس طرح حاصل تھا جس طرح اللہ کو ہے تو اس بات کی نفی خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ لیکن جتنا علم اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو دیا وہ سب کا سب غیب ہے اور اس کو ہم قرآنِ پاک اور احادیث مبارکہ کی رُو سے غیب کے علاوہ کوئی نام نہیں دے سکتے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''جس نے خود کو پہچان لیا اس نے ربّ کو پہچان لیا۔''

رب کو پہچان لینے سے مراد یہ ہے کہ ہر انسان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے ربّ کو پہچان سکتا ہے۔ ربّ کو ہم غیب کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''مر جاؤ مرنے سے پہلے۔''

یعنی مرنے سے قبل مرنے کی زندگی سے آشنا ہو جاؤ۔ ظاہر ہے عالمِ اَعراف اور وہاں موجود روحوں سے اگر انسان متعارف ہو جاتا ہے تو اس کو بھی علم غیب کے علاوہ کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

رسول اللہ ﷺ کو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے سکھا دیا، جو کچھ عطا کیا وہ ان کے لئے غیب کہاں رہا؟ جو چیز ظاہر ہو گئی، وہ غیب کہاں رہی؟ لیکن جو چیز حضور ﷺ پر ظاہر ہو گئی وہ ہمارے لئے غیب ہے۔ اس لئے کہ ہم نے نہ تو جبرائیل علیہ السّلام کو دیکھا ہے نہ ہی آسمانوں کی سیر کی ہے اور نہ ہی ہم نے اللہ تعالیٰ سے وہ قربت حاصل کی ہے جو رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ سے ہوئی۔ جب حضور پاک ﷺ کو وہ چیزیں حاصل ہو گئیں جن کو علم الغیب کہا جاتا ہے تو حضور ﷺ کے لئے وہ غیب غیب ہی نہیں رہا، لہٰذا یہ سوال ہی غلط ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو جو علم حاصل ہے وہ دراصل ہمارے لئے غیب ہے یعنی جو چیز ہمیں معلوم نہیں ہے جو چیز ہماری آنکھ نہیں دیکھ سکتی، اسے رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں نے دیکھا اور اسے سمجھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات تو بہت اعلیٰ و ارفع ہے ان کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے کائنات تخلیق کی ہے۔ قرآنِ پاک کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے ایک عام انسان کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اللہ سے رابطہ کر سکتا ہے۔

"کسی انسان کی یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کلام کر سکے مگر وحی کے ذریعے۔"

(سورۃ الزخرف۔ آیت ۵۱)

اللہ کا پسندیدہ بندہ

سوال: آپ کی ایک تحریر کے مطابق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب لوگ ہماری ناپسندیدہ طرزوں میں زندگی گزارتے ہیں ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور ہم نے ان کے کانوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور آنکھوں پر پردے ڈال دیتے ہیں۔ مہر لگنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے اندر وہ صفا نہیں رہیں جن سے آدمی اللہ تعالیٰ کی تجلّی کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ان کی سماعت سے وہ صفت نہیں رہی جس کے ذریعے وہ غیب کی آوازیں سنتا ہے فرشتوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔

آنکھوں پر پردہ ڈال دیا یعنی وہ سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی ذاتِ اقدس کی زیارت سے مشرف نہیں ہوتا۔اس حقیقت کی روشنی میں جب ہم اپنے اطراف دیکھتے ہیں تو مذکورہ صفات کے حامل مسلمان (سوائے اوّلیائے کرام کے) نظر ہی نہیں آتے۔ کیا اللہ کا پسندیدہ بندہ بننا اتنا مشکل کام ہے؟ کیا ہم کسی طرح مذکورہ صفات کے حامل مسلمان بن سکتے ہیں؟

جواب: ایک آدمی آپ کا دوست ہے، آپ اسے اچھی باتیں سمجھاتے ہیں۔ مثالوں سے سمجھاتے ہیں۔ ترغیب دے کر سمجھاتے ہیں۔اپنی دوستی کے تعلق کے اظہار سے سمجھاتے ہیں لیکن وہ آپ کی بات نہیں مانتا تو آپ کا یہ طرزِ عمل ہوگا کہ آپ اس بندے کو اس کے حال پر چھوڑ دیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوزخ کے عذاب سے بچانے کے لئے انسان کو اپنی نعمتیں عطا کرنے کے لئے، جنّت میں اعلیٰ مقام عطا کرنے کے لئے پیغمبر بھیجے۔لوگوں نے پیغمبروں کی بات نہیں سنی،ان کے ساتھ دشمنی کی، مخالفت کی،ان کو مارا پیٹا، قرآن کو بُرا بھلا کہا۔ جب کہ کسی پیغمبر نے اپنی ذات کے لئے قوم سے کچھ نہیں مانگا۔ان کا کام ہی یہ تھا کہ نوعِ انسانی کو عذاب ناک زندگی سے محفوظ کر کے آرام و آسائش کی جگہ جنّت میں بھیج دیا جائے۔لوگوں نے اسی بات کو جرم قرار دے دیا کہ یہ ہمیں دوزخ سے نکال کر جنّت میں کیوں بھیج رہے ہیں!

اس ضد اور سرکشی پر اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ جب تم سننا ہی نہیں چاہتے تو تمہارے کان حق کی بات نہیں سنیں گے۔جب تم دیکھنا ہی نہیں چاہتے تو تمہاری آنکھیں اب حق اور سچ کو نہیں دیکھ سکیں گے۔اور تمہارے لئے اب تمہاری پسند اور انتخاب کے مطابق دردناک عذاب ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے لئے رحیم و کریم ہیں۔ اللہ تعالیٰ گناہوں کو عیبوں کو چھپانے والے ہیں اللہ تعالیٰ سرکشی اور گناہ کو معاف کرنے والے ہیں۔ لیکن جب انسان اتنا سرکش ہو جائے کہ اللہ کی رحمت کا بھی مذاق اڑانے لگے اور اللہ کے فرستادہ محبوب بندوں سے کہے ''کہاں ہے وہ عذاب جس کی تم وعید دیتے تھے وہ آتا کیوں نہیں ہے۔''

ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی بے نیازی سامنے آگئی اور اللہ نے فرمایا:

''اب جو کچھ تم چاہتے ہو وہ تمہارے لئے مقرر کر دیا ہے۔''

''مہر لگادی اللہ نے دلوں پر اور دبیز پردے لگا دیئے آنکھوں پر اور ان کے لئے دردناک عذاب کی بشارت ہے۔''

فنا و بقا کیا ہے؟

سوال : فنا و بقا کیا ہے؟ اس میں کیا حکمت ہے؟ قائم بالذّات اللہ کے جو بندے کائنات میں تصرّف کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں انہیں یہ وصف کس طرح حاصل ہوتا ہے؟

جواب: انسان کے وجود میں ایک وجود (مادّی جسم) پر ہر لمحہ اور ہر آن موت وارِد ہوتی رہتی ہے۔ جس لمحہ موت وارِد ہوتی ہے اس ہی لمحہ ایک نیا وجود تشکیل پا جاتا ہے۔ یہ وجود لمحہ بہ لمحہ حیات ہے۔ دوسرا وجود (روح) وہ ہے جس پر لمحات، گھنٹے، دن اور ماہ و سال اثرانداز نہیں ہوتے۔ ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ دیانت اور بردباری کے ساتھ یہ سوچنا ہو گا کہ مرنے جینے اور جسم کی نت نئی تبدیلیوں کے پیچھے کیا عوامل کام کر رہے ہیں۔ کیا ہم بار بار تبدیلیِٔ جسم کے سلسلہ کو ختم نہیں کر سکتے اور کیا ہم بقاءِ دوام پا سکتے ہیں اور کیا ہم ہر آن اور ہر لمحہ جسمانی، ذہنی، شعوری تبدیلی سے نجات پا سکتے ہیں؟ ہمیں سوچنا ہو گا کہ اختلافِ لیل و نہار کے ساتھ ہم بھی کیوں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ جاننے کے لئے ہمیں اپنے دوست کو پہچاننا ہو گا اور جب ہم اپنے سچے، پاک اور ایثار کرنے والے دوست سے واقف ہو جائیں گے تو ردّ و بدل کا یہ لامتناہی سلسلہ ایک نقطہ پر ٹھہر جائے گا۔ ہمارا یہ دوست اللہ ہے۔ اللہ کے جو بندے روحانی آگہی کے ناپیدا کنار سمندر میں اتر جاتے ہیں ان کے اوپر سے Time&Space کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور زمان سے پیدا شدہ تمام عوامل رنج و غم، پریشانی و اِضمحلال، فکر و تَرَدّد سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتے ہیں۔ جب کوئی بندہ اس دائرہ کار میں منتقل ہو جاتا ہے تو اس کے اوپر انعام و اکرام کی بارش ہونے لگتی ہے ایسے ہی بندوں کے لئے کائنات مسخر کر دی گئی ہے۔

''اور مسخر کر دیا تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔'' (قرآن)

عالمِ انسانی کے قدسی نفس حضرات وہ ہیں جو اپنے اندر کام کرنے والے کہکشانی نظام سے باخبر ہوتے ہیں۔ جب کوئی بندہ اپنے Inner سے واقف ہو جاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے سے مکان اور زمان کا پردہ اٹھ جاتا ہے تو وہ دیکھ لیتا ہے کہ سب کچھ انسان کے اندر ہے۔انسان کے اندر ایک نقطہ ہے اور یہ نقطہ کائنات کی مائیکرو فلم ہے۔اس نقطہ کو جب پھیلنے اور نشر ہونے کا موقع دیا جاتا ہے تو ساری کائنات دماغ کی اسکرین پر فلم بن کر متحرّک ہو جاتی ہے۔

قدرت کا چلن یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے اور جو لوگ اس قسم کی طاقت حاصل کرنے کے بعد بے جا فخر اور گھمنڈ کے نشے میں غیر اخلاقی اور غیر انسانی حرکات شروع کر دیتے ہیں ان سے یہ طاقت چھین لی جاتی ہے۔اس لئے یاد رکھئے کہ سب سے پہلے آپ کے دل میں اپنی شخصی تعمیر اور پھر تعمیرِ کائنات کا عزم ہونا چاہئے۔

رنج و غم کیوں جمع ہوتے ہیں؟

سوال : ہمارے ارد گرد پریشانیاں اور رنج والم کیوں جمع ہو گئے ہیں۔انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔اللہ کا نائب ہے۔آسمانوں اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے وہ اس کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔پھر وہ سکون، راحت و آرام سے محروم کیوں ہے؟

جواب: صدیوں سے زمین پر ہونے والی تبدیلیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ زندگی کے اَدوار، زمانہ کے نشیب وفراز اور سائنسی ایجادات زمین کے سینے میں محفوظ ہیں۔زمین یہ بھی نہیں جانتی کہ کتنی تہذیبوں نے اس کی کوکھ سے جنم لیا اور پھر یہ تہذیبیں معدوم ہو گئیں۔

خلاء سے اُس پار آسمانوں کی وسعتوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو مایوسیوں، ناکامیوں اور ذہنی افلاس کے سوا ہمیں کچھ نظر نہیں آتا۔یوں لگتا ہے کہ زمین کے باسیوں کا اپنی ذات سے فرار اور منفی طرزِ عمل دیکھ کر نیلے پربت پر جھلمل کرتے ستاروں کی شمعِ امید کی لو مدھم پڑ گئی ہے۔وہ انسان جو اشرف المخلوات ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ذہنی اعتبار

سے حیوانات سے بدتر زندگی گزار رہا ہے۔ جو سکون ایک بلی اور بکری کو حاصل ہے، اس کا عشرِ عشیر بھی انسان کو میسر نہیں۔

بہترین تخلیق کرنے والی ہستی اور خود مختار خالقِ کائنات نے اس دھرتی کو ایک قطعۂ زراعت بنا کر آدمی کے حوالے کیا ہے کہ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر پُر سکون میٹھی نیند سو سکے۔ اس ہی لئے اس کی تخلیق کا ظاہری جسم مٹی سے بنایا گیا ہے اور اس کے استعمال کی ہر چیز اس مٹی سے بنائی گئی ہے۔ زمین کو قدرت نے اتنا سخت نہیں بنایا کہ آدم زاد اس پر چل نہ سکے۔ اتنا نرم نہیں بنایا کہ آدم زاد کے پیر زمین میں دھنس جائیں۔ اسے اختیار دیا گیا کہ وہ زمین پر تصرّف کر سکے اور زمین کے جسم میں دوڑنے والے خون (Rays) سے جس طرح چاہے استفادہ کرے۔ لاکھوں کروڑوں سال پہلے آدم علیہ السّلام کی طرح آج بھی آدم زاد زمین کے سینے پر کھیتی کرنے میں مصروف ہے۔ اس کھیتی کا ہر جُزو بھی آدم کی طرح مٹی ہے۔ جو کچھ بوتا ہے اس کا بیج بھی مٹی ہے۔ پودا بھی مٹی کی ایک شکل ہے۔ درخت بھی مٹی کے اجزاء سے مرکب ہے۔ سونا چاندی بھی مٹی کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں اور یہ جو پُر شکوہ عمارتیں ہمیں نظر آتی ہیں یہ بھی مٹی ہی ہیں۔ بڑی سے بڑی ایجادات کا بنیادی مسالہ Raw Material بھی مٹی ہے۔

آدمی جس طرح سرسبز درخت اور ہرے بھرے لہلہاتے کھیت اگاتا ہے اسی طرح عمارتیں، تعمیرات اور دیگر اشیاء بھی اس کی زراعت کی پیداوار ہیں۔ آدمی جب مٹی بوتا ہے تو نتیجہ مٹی کی ہی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ بوائی اور کٹائی کا یہ عمل متواتر اور مسلسل جاری ہے کیونکہ وہ اس زراعت کا فعّال رکن ہے اور اسے ارادے کا اختیار دیا گیا ہے اس لئے فصل بھی اس کے مطابق ہوتی ہے۔ عمل اور ردِّ عمل، حرکت اور نتائج کے اس قانون کو حضور اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔"

قول و فعل کے تضاد کا یہ عالم ہے کہ ہر آدمی یہ جانتا اور کہتا ہے کہ زمین پر وقفۂ زندگی محدود ہے لیکن اس کا عمل اِس روز مرّہ مشاہدے کے خلاف ہے۔ وہ تمام تر زندگی ان خطوط پر گزارتا ہے جو فطرت کے اٹل قانون کے منافی

ہیں۔ تخریب کا نام اس نے ترقی رکھا ہے اور فلاح و بہود کے نام پر مستقبل کی ناخوشگواریوں کو جنم دیتا ہے۔ روشن نگاہی کا دعویٰ کر کے جو کچھ کرتا ہے وہ بدترین درجے کی کوتاہ اندیشی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

انسان قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں کا امین ہے لیکن اس نے ان صلاحیتوں کو حرص و ہوس، خود غرضی، انا پرستی اور خود نمائی جیسے جذبات کی تسکین میں استعمال کیا ہے۔ اپنی ذات تک محدود عمل کے نتیجے میں آدمی کی ساری توجہ اس فانی دنیا میں مرکوز رہتی ہے اور اس کے اعمال کی بنیاد بھی فانی دنیا کی طرح بن جاتی ہے چنانچہ جب وہ دنیا بوتا ہے تو اسے دنیا ہی کاٹنا پڑتی ہے چونکہ دنیا فانی ہے۔ اس لئے اس کے حصے میں فنا کے علاوہ کچھ نہیں آتا اور وہ بقا کی زندگی سے جس میں سکون، راحت اور آرام ہے محروم ہو جاتا ہے۔

باب ہفتم

وَحدت الوجود اور وَحدت الشُہود

سوال : اہل تصوّف میں وَحدت الوجود اور وَحدت الشُہود کی دو اصطلاحات عام طور پر استعمال ہوتی ہیں اور ان کے بارے میں بہت لکھا گیا ہے۔ از راہ کرم سادہ اور مختصر پیرائے میں ان دونوں کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: کائنات کی بنیاد اور حقیقت ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کا ذہن علمِ واجِب کہلاتا ہے۔ علمِ واجِب میں کائنات کا وجود اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تحت موجود تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کا مظاہرہ پسند فرمایا تو حکم دیا ''کن''یعنی حرکت میں آ۔ چنانچہ بہ شکل کائنات، واجب میں جو کچھ موجود تھا اس نے پہلی کروٹ بدلی اور حرکت شروع ہو گئی۔ پہلی حرکت تو یہ تھی کہ موجودات کے ہر فرد کو اپنا ادراک ہو گیا۔ موجودات کے ہر فرد کی فکر میں یہ بات آئی کہ میں ہوں۔ یہ انداز فکر ایک گم شدگی اور محویت کا عالم تھا۔ ہر فرد ناپیدا کنار دریائے توحید کے اندر غوطہ زن تھا۔ ہر فرد کو صرف اتنا احساس تھا کہ میں ہوں۔ کہاں ہوں، کیا ہوں اور کس طرح ہوں اس کا کوئی احساس اسے نہیں تھا۔ اس ہی عالم کو عالمِ وَحدت الوجود کہتے ہیں۔ اس عالم کو اہل تصوّف وَحدت کا نام بھی دیتے ہیں۔ یہ وَحدت، وَحدت باری تعالیٰ ہر گز نہیں ہے کیونکہ باری تعالیٰ کی کسی صفَت کو لفظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ یہ وَحدت ذہنِ انسانی کی اپنی ایک اختراع ہے جو صرف انسان کے محدود دائرہ فکر کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے کسی لامحدود وصف کو صحیح طور پر بتانے سے قطعی کوتاہ اور قاصر ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی لفظ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی صفَت کا مکمل اظہار ہو سکے۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ''وَحدت''فکرِ انسانی کی اپنی ایک اختراع ہونے کی حیثیت میں زیادہ سے زیادہ فکرِ انسانی کے علوم کی وسعت کو بیان کرتی ہے۔ جب کوئی انسان لفظ ''وَحدت''استعمال کرتا ہے تو اس کے معنی بس یہی نکلتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یکتائی کو یہاں تک سمجھا ہے۔ بالفاظ دیگر لفظ ''وَحدت'' کا مفہوم انسان کی

اپنی حدِّ فکر تک محدود ہے۔اس محدودیت ہی کو انسان لا محدودیت کا نام دیتا ہے۔فی الواقع اللہ تعالیٰ اس قسم کی توصیفی حدوں سے بہت ارفع واعلیٰ ہے۔جب ہم ''وَحدت'' کہتے ہیں تو فی الحقیقت اپنی ہی وَحدت فکر کو تذکرہ کرتے ہیں۔

اس ہی مقام سے عالمِ وَحدت الوُجود کے بعد عالمِ وَحدت الشُہود کا آغاز ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ روحوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟(سورۃ الاعراف)

یہاں سے انسان یا امرِ ربّی کی نگاہ وجود میں آجاتی ہے۔وہ دیکھتا ہے کہ کسی نے مجھے مخاطب کیا اور مخاطب پر اس کی نگاہ پڑتی ہے۔وہ کہتا ہے ''جی ہاں!'' مجھے آپ کی ربّانیت کا اعتراف ہے اور میں آپ کو پہچانتا ہوں۔(سورۃ الاعراف)

یہ ہے وہ مقام جہاں امرِ ربّی نے دوسری حرکت کی۔اس ہی مقام پر وہ کثرت سے متعارف ہوا۔اس نے دیکھا کہ میرے سِوا اور بھی مخلوقات ہیں کیونکہ مخلوق کے ہجوم کا شُہود اسے حاصل ہو چکا تھا،اسے دیکھنے والی نگاہ مل چکی تھی۔یہ علمِ واجِب کا دوسرا تنزل ہوا۔اس تنزل کی حدود میں انسان نے اپنے وجود کی گہرائی کا احساس اور دوسری مخلوق کی موجودگی کا شُہود پیدا کیا۔پہلے تنزل کی حیثیت علم اور علیم کی تھی یعنی انسان کو صرف اپنے ہونے کا ادراک ہوا تھا۔میں ہوں۔''میں'' علیم اور ''ہوں'' علم ہے۔دوسری منزل میں گم شدگی کی حد سے آگے بڑھا تو اس نے خود کو دیکھا اور دوسروں کو بھی دیکھا۔اس ہی کو عالمِ وَحدت الشُہود کہتے ہیں۔

دماغ میں دو کھرب خانے

سوال : میں نے پڑھا ہے کہ انسان کے دماغ میں دو کھرب خانے ہوتے ہیں جن میں سے صرف دو سو متحرّک اور باعمل ہوتے ہیں اور اگر دو سو سے زیادہ خانے متحرّک ہو جائیں تو ہمیں غیب کی چیزیں نظر آسکتی ہیں اور لاکھوں سال پہلے اور بعد میں ہونے والے واقعات نظر آسکتے ہیں۔مجھے آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا ایک عام آدمی میں یہ صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے کہ اگر وہ دیکھنا چاہے کہ میرا فلاں دوست جو ہزاروں میل دور ہے وہ کیا کر رہا ہے یا

فلاں رشتہ دار یا عزیز کس حال میں ہے یا کوئی ماضی یا مستقبل کا واقعہ دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر میں یہ سب دیکھنا چاہوں تو مجھے کیا عمل کرنا ہوگا؟

جواب: تصوّف نورِ باطن ہے۔ نورِ باطن نام ہے ایسے خالص ضمیر کا جس میں آلائش قطعاً نہیں ہوتی۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اپنے سامنے دیکھنے کے بجائے پیچھے دیکھتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر مقصود صرف پیچھے دیکھنا ہوتا تو آنکھیں پیشانی پر ہونے کے بجائے سر کے پچھلے حصے میں ہوتیں۔

ہمارے تمام تر عقائد و طرزِ فکر کی بنیاد ماضی پر ہے جہاں کہیں ہمارا ذہن اٹکتا ہے۔ ہم بجائے اس کے کہ جو کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے یا جو کچھ ہمارے اپنے تجربے میں ہے اس کی روشنی میں نتائج اخذ کرتے ہیں اور یقین کر لیتے ہیں، چاہے وہ صحیح ہوں یا غلط، جس کا لازماً نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری آزاد طرزِ فکر پر ضرب شدید پڑتی ہے اور بالآخر توہم اور وسوسوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یقین مجروح ہوتا ہے ذہن منتشر ہوتا ہے اور اس طرح آدمی کے اندر دُوربینی کی صلاحیتیں مجروح اور معدوم ہو جاتی ہیں۔

اگر مستقبل بینی کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے تو پہلے ہمیں مفروضہ حواس اور شکوک و وسواس سے خود کو آزاد کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کسی ایسے استاد کی رہنمائی میں سفر کا آغاز کیا جائے جو مستقبل بینی کے علم سے پوری طرح آگاہ ہو۔ قدرت نے ہر آدمی کے اندر یہ صلاحیت وُدیعت کی ہے کہ وہ دُور دراز کی چیزوں کا مشاہدہ کر سکے اور ہزاروں میل دُور رہنے والے دوستوں اور رشتہ داروں سے ہم کلامی کر سکے۔ مادّی دنیا میں اس کی مثال سائنس کی ترقی ہے۔ ہمارے ارد گرد بہت سی آوازیں پھیلی ہوئی ہیں ان کے قُطر بہت چھوٹے اور بہت بڑے ہوتے ہیں جن کو انگریزی میں ویولینتھ (Wave Length) کہتے ہیں۔ سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ چار سو قُطر سے نیچے کی آوازیں آدمی نہیں سن سکتا۔ سولہ سو قُطر سے زیادہ اونچی آوازیں بھی آدمی نہیں سن سکتا۔ چار سَو (400) ویولینتھ سے نیچے کی آوازیں برقی رَو کے ذریعہ سنی جا سکتی ہیں اور ایک ہزار چھ سو ویولینتھ کی آوازیں بھی برقی رَو کے ذریعہ سنی جا سکتی ہیں۔ یہ ایک قسم کا حسی عمل ہے جو دماغی خلیے بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق:

''اللہ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔''

روشنی فی الواقع برقی رَو ہے۔ برقی رَو جب دماغ کے خلیوں میں دور کرتی ہے تو آسمانوں اور زمین میں موجود نظام کو دیکھنے کے لئے غیب بینی کی صلاحیت بیدار اور متحرّک ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی انسان تفکر کے ذریعہ روشنی (برقی رَو) کا مطالعہ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ کائنات میں کوئی شئے دیکھنے کے عمل میں مزاحمت نہیں کر سکتی اس لئے کہ خالق کائنات نے ہر شئے کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔

قلم خشک ہو گیا

سوال: حضور اکرم ﷺ کا ارشاد عالی مقام ہے کہ ''قلم لکھ کر خشک ہو گیا'' اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جو کچھ ہونا تھا جو کچھ ہو رہا ہے وہ پہلے سے لکھ دیا گیا ہے۔ جب ہم زندگی مجبوری کی حالت میں بسر کر رہے ہیں تو ہمارا اختیار کیوں زیر بحث آتا ہے؟

جواب: ''قلم لکھ کر خشک ہو گیا'' کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں ازل سے پہلے جو کچھ موجود تھا، اللہ تعالیٰ نے ''کُن'' کہہ کر اس کا مظاہرہ فرمایا۔ اس بات کو ہم موجودہ دَور میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جو کچھ موجود تھا جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کا مظاہرہ ہو تو جو کچھ ان کے ذہن میں تھا اس کی ایک فلم بن گئی اور یہ فلم مسلسل، متواتر اور بغیر کسی وقفے کے چل رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک ہی فلم بار بار ڈسپلے Display ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نَوع اپنے خدوخال، مزاج، جذبات و احساسات کے اعتبار سے ایک ہی دائرے میں سفر کر رہی ہے۔ مثلاً گائے کی شکل و صورت مقرر ہے۔ آج سے کئی ہزار سال پہلے جو گائے کی شکل و صورت اور حسیات تھیں وہی آج بھی ہیں۔ نَوعِ انسانی کی جو شکل آج سے کئی ہزار سال پہلے تھی وہی آج بھی ہے۔ اب سے سینکڑوں اور ہزاروں سال پہلے زندگی گزارنے کے جو تقاضے موجود تھے وہی آج بھی ہیں۔ مثلاً ہزاروں سال پہلے آدمی کو بھوک لگتی تھی۔ پیاس ہوتی تھی۔ اَولاد کا تقاضہ اس کے اندر پیدا ہوتا تھا تو آج بھی یہ سب تقاضے اسی طرح

موجود ہیں۔ سب کچھ عملاً وہی ہو رہا ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ جذبات میں کبھی تیزی آجاتی ہے اور کبھی سست روی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب ہم اس بات کو اس طرح کہیں گے کہ ماضی کو دہرایا جارہا ہے۔ تہذیبی اور تمدنی نقطہ نظر سے بھی اگر غور کیا جائے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ ماضی دہرایا جاتا ہے۔

دس ہزار سال پہلے کا دَور تھا۔ پتھر کے زمانے سے ترقی کر کے انسان آج ایٹمی دَور میں داخل ہو گیا ہے۔ لیکن پھر دس ہزار سال بعد وہ پتھر کے دَور میں داخل ہو جائے گا۔ (اس کی وجوہات پر روشنی ڈالنا اس وقت ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے)۔ یعنی ایک زنجیر ہے جس میں آدمی حواس کے اعتبار سے بچپن میں ہوتا ہے اور پھر اس کا شعور ترقی کر کے بالغ ہو جاتا ہے۔ جب شعور بلوغت کے دَور میں پہنچتا ہے تو آدمی اس کے اوپر اپنی عقل سے موت وارِد کر دیتا ہے اور چین (Chain) پھر اُلٹ جاتی ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد بتانا یہ مقصود ہے کہ ساری کائنات ہر لمحہ ہر آن پیدا ہو رہی ہے اور ہر لمحہ موت سے گزر رہا ہے۔ جب پہلے لمحے پر موت وارِد ہوتی ہے تو دوسرا لمحہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پیدا ہونے سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ رہا ہے۔ اسی بات کو قرآنِ پاک میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے کہ

"ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ کی طرف لوٹ جائے گی۔" (سورۃ البقرہ–156)

اس بات سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ آدمی کو اختیار حاصل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کا جو پروگرام بنایا ہے اور جو بار بار اپنا مظاہرہ کر رہا ہے اس کا ایک جُزو وہ حدود (اختیار) بھی ہیں جو اس نے انسان کو عطا کی ہیں۔

ترقی کا فسوں

سوال: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسی قومیں بھی گزر چکی ہیں، جو علم طاقت اور مال میں بہت زیادہ تھیں اور انہوں نے زمین کو بہت رونق بخشی۔ آج ہم سائنس کی بے پناہ ترقی دیکھتے ہیں۔ کمپیوٹر، اطلاعاتی سائنس، جینیات کی بے پناہ ترقی بھی ہمارے سامنے ہے۔ کیا ہم سے پہلے اس سے بھی زیادہ ترقی ہو چکی ہے ؟اور اتنی عظیم ترقی کے بعد ایسی کیا بات ہوئی کہ ان قوموں کا نام و نشان تک مٹ گیا؟

جواب: آج کے دَور سے پہلے بہت عظیم ترقیاں ہو چکی ہیں۔ قانون قدرت یہ ہے کہ ترقی یا ریسرچ جب اتنے عروج پر پہنچ جاتی ہے کہ جہاں انسان قدرت کے کاموں میں دخل دینا شروع کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوتا ہے اور قومیں صفحہ ہستی سے نابود ہو جاتی ہیں۔

تاریخ کی کتابوں کے مطابق حکیم مقنی ایک شخص گزرا ہے۔ اس نے چاند بنا لیا تھا۔ ایک کنوئیں میں سے باقاعدہ چاند نکلتا تھا۔ چاند کی طرح چاندنی چٹکتی تھی اور وہ چاند اپنا سفر پورا کر کے دوبارہ کنوئیں میں جا چھپتا تھا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ کتابوں میں درج ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السّلام زمین پر تشریف لائے۔ دو چھوٹے بچے کھیل رہے تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السّلام نے ان میں سے ایک بچے سے پوچھا کہ بتاؤ جبرائیل کہاں ہے؟۔۔۔۔۔۔بچے نے جواب دیا۔ جبرائیل نہ آسمانوں میں ہے، نہ زمین پر اس کا پتہ چلتا ہے۔ اب یا تو میں جبرائیل ہوں یا تُو جبرائیل ہے۔ اُڑن کھٹولوں کا تذکرہ دادیاں نانیاں عام طور سے کرتی ہیں۔ یہ اڑن کھٹولے ہوائی جہاز تھے۔ جامِ جم ایک ڈبہ تھا اس پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ بادشاہ میلوں میل دُور جنگ کے حالات اس شیشے پر دیکھتا تھا۔ اگر تاریخ میں ڈھونڈا جائے تو اس قسم کی ترقیاں سامنے آتی ہیں جو آج سے کہیں زیادہ تھیں۔ جب سائنسدانوں نے قدرت کے کاموں میں دخل دینا شروع کیا جیسے آج کل DNA اور کلوننگ وغیرہ ہیں۔ چونکہ اس ریسرچ سے براہِ راست قدرت کے کاموں میں دخل اندازہ ہوتی ہے اس لئے قدرت نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔ میں راقم الحروف اس دنیا میں نہیں ہوں گا لیکن میرے بعد

آنے والی نسلیں اس بات کی شہادت فراہم کریں گی کہ موجودہ ترقی کا فسوں جس نے انسان کا سکون برباد کر دیا ہے ختم ہو جائے گا۔

کون سا رنگ کون سا پتھر؟

سوال: آپ نے لکھا ہے کہ پتھر انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور رنگوں سے انسان اور فطرت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہمارے لئے کون سا رنگ اور کون سا پتھر مفید یا مضر ہے؟

جواب: مظاہر قدرت پر نظر ڈالئے بہت سے پودے، پھول اور پھل نظر آئیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ درختوں کے سب کے سب پتے سبز ہوتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ اس طرح پھولوں میں بھی ہوتا ہے۔ بظاہر ایک ہی رنگ جسے آپ سرخ کہتے ہیں، سبز کہتے ہیں یا کسی اور رنگ کا نام دیتے ہیں، نظر آتا ہے لیکن بغور دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر رنگ کی الگ الگ بہت قسمیں ہیں۔ قدرت کی طرف سے رنگ کا جو قانون ہماری زمین پر جاری و ساری ہے اس کا اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ جو رنگ انسان کے ظاہری روپ، چہرے پر اثر ڈالتا ہے۔ وہ شخصیت پر بھی گہرا اثر رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی شخصیت رنگوں کے اجزاء کا مجموعہ ہوتی ہے۔ رنگ خواہ شیشے کا ہو یا جواہرات کا ہو یا لباس کا ہو، شخصیت کی تعمیر یا تخریب میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ بات صرف رنگوں کی فطرت جاننے والے ہی سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے لئے کون سا رنگ تعمیری ہے اور کون سا تخریبی۔ ایک چھوٹے سے نگینے میں رنگین لہروں کا بہت بڑا اجتماع ہوتا ہے جو نگینے سے مسلسل خارج ہوتی رہتی ہیں اور انسان کے جسم میں دَور کرتی رہتی ہیں۔

روحانی علم کا باب ''انسان کی زندگی پر رنگوں کا اثر'' ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کے اندر ہمہ وقت بے شمار رنگوں کی لہریں دوڑتی رہتی ہیں۔ ان بے شمار لہروں میں سے تقریباً ساٹھ رنگ سائنس نے دریافت کر لئے ہیں۔ اندر کا آدمی (روحانی انسان) اس بات کو جانتا اور سمجھتا ہے کہ رنگین لہروں کی کمی بیشی سے فہم و فراست، صحت اور بیماری کا

براہِ راست تعلق ہے۔ اگر رنگوں میں اعتدال باقی نہ رہے تو آدمی بیمار ہو جاتا ہے اور اس کے فیصلے صحیح نہیں ہوتے۔ کوئی نگینہ یا پتھر مخصوص رنگ کی کمی کو دور کر کے رنگوں کو اعتدال میں لے آتا ہے۔

نماز میں حضورِ قلب پیدا ہو

سوال: ایسی نمازیں جو حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق حضورِ قلب پیدا کریں اور فواحشات، منکرات سے روک دیں کس طرح ادا کی جاسکتی ہیں؟

جواب: نماز کی فرضیت ہمیں حضور علیہ الصّلوٰۃ و السّلام سے منتقل ہوئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ پر نماز کب فرض ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو نبوت سے پہلے ہی ایسا ذہن عطا فرمایا تھا جس کا رخ نورانی دنیا کی طرف تھا اور نورانی دنیا کی طرف متوجّہ رہنے کے لئے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نے وہ تمام اعمال ترک فرمادیئے تھے جن سے ذہن کثیف دنیا کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔

حضور ﷺ کی مقدّس زندگی ہمارے سامنے ہے۔ آپ ﷺ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، کبھی خیانت نہیں کی۔ آپ ﷺ سے کبھی کوئی ایسا عمل سرزد نہیں ہوا جو بے حیائی کے زمرے میں آتا ہو۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ بے کسوں کی دستگیری کی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ گوشہ نشین ہو کر اور ہر طرف سے ذہن ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجّہ رہے اور آپ ﷺ نے اپنی توجّہ اللہ تعالیٰ کی طرف اتنی زیادہ مرکوز فرمائی کہ قربت سے سرفراز ہوئے اور معراج میں اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''پھر اللہ نے بندہ پر وحی نازل فرمائی جو نازل فرمانا تھی دل نے دیکھی ہوئی چیز کو جھٹلایا نہیں۔'' (سورۃ النجم)

نماز میں حضورِ قلب کے لئے ضروری ہے کہ سیدنا حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کیا جائے۔ جس حد تک حضور ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر کسی امّتی کا عمل ہوگا اسی مناسبت سے نماز میں حضوری نصیب ہو جائے گی۔ قلب

میں جِلا پیدا کرنے کے لئے ان چیزوں سے دُوری پیدا کرنا ہوگی جو ہمیں پاکیزگی، صفائی اور نورانیت سے دُور کرتی ہیں۔ ہمیں اس ذہن کو رد ّ کرنا ہوگا جو ہمارے اندر نافرمانی کا ذہن ہے۔ آسان الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ جب تک کوئی بندہ اپنی روح سے وقوف حاصل نہیں کرلیتا اس وقت تک نماز میں حضورِ قلب نصیب نہیں ہوتا۔

روح سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مادّیت سے دلچسپیاں کم کرکے مراقبہ کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ وقت ذہن کو اللہ کی طرف متوجّہ رکھا جائے۔

روحانی تفسیر

سوال: قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تخلیق کے بعد اس سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ ''کیا نہیں ہوں میں ربّ تمہارا؟'' مخلوق نے اقرار کیا کہ ''بے شک آپ ہمارے ربّ ہیں''۔ اس آیت کی روحانی تفسیر کیا ہے؟

جواب: جب کچھ نہیں تھا تو اللہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ میری عظمت، ربوبیت اور میری خالقیت کا اظہار ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ میری عظمت کا اظہار ہو تو یہ بات خود بخود سامنے آجاتی ہے کہ عظمت کو پہچاننے کے لئے اور اللہ تعالیٰ کو جاننے کے لئے اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی ایسا ذہن ہو جو اللہ تعالیٰ کی صناعی کو سمجھ اور دیکھ سکے۔ اب یہ بات اس طرح سمجھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ میں پہچانا جاؤں۔ جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جو کچھ تھا یا ہے اس کی تخلیق عمل میں آگئی۔ تخلیق کے لئے ضروری تھا کہ کوئی ضابطہ و قاعدہ موجود ہو۔ اور ہر تخلیق کے جداگانہ فارمولے مرتّب کئے جائیں۔ یہ ضابطے قاعدے اور فارمولے بھی اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جو پروگرام تھا اس کو کن کہہ کر ظاہر فرما دیا۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا 'کن'۔۔۔۔۔۔ تو جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں تھا وہ قاعدوں، ضابطوں، فارمولوں اور شکل و صورت کے ساتھ عالمِ وُجود میں آگیا۔ جو کچھ عالمِ وُجود میں آگیا اس کا نام کائنات ہے۔ کائنات ایک ایسے

خاندان کا نام ہے جس میں بے شمار نَوعیں ایک کنبے کی حیثیت رکھتی ہیں جیسے ہی کن فیکون بنا تمام نَوعیں وجود میں آ گئیں۔ان نَوعوں میں جنّات، فرشتے، انسان، جمادات و نباتات، حیوانات، زمینیں، سماوات اور بے شمار کہکشانی نظام ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ساری نَوعیں ایک کنبے کی حیثیت سے قیام پذیر ہیں۔ کوئی نَوع یہ نہیں جانتی کہ میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟ میری تخلیق کا منشاء کیا ہے؟

تخلیق کے پہلے مرحلے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جب ان تمام نَوعوں کو شعور بخشا تو نظر وجود میں آ گئی۔ جب اللہ نے کہا ''میں ہوں تمہارا رب۔'' تو کائنات میں موجود تمام نَوعیں اس آواز کی طرف متوجّہ ہو گئیں اور نَوعوں نے دیکھا کہ اللہ ہمارا ربّ ہے۔ قانون یہ ہے کہ شعور اس وقت متحرّک ہوتا ہے جب صاحب شعور یہ جانتا ہے کہ میری اپنی ایک ہستی ہے اور میرے علاوہ دوسری ہستی بھی ہے۔ تخلیق کا دوسرا مرحلہ یہ بنا کہ کائنات نے جیسے ہی اللہ تعالیٰ کی آواز سنی اس کے اندر شعور کی دو صلاحیتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک سننے کی صلاحیت دوسری دیکھنے کی صلاحیت، مخلوق نے سننے اور دیکھنے کی صلاحیت کو استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھا تو شعور کے اندر تیسری سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ سننے، سیکھنے اور سمجھنے کے بعد چوتھی صلاحیت اپنے علاوہ دوسرے کو پہچاننے کی پیدا ہو گئی۔ پہچاننے کی صلاحیت کے بعد پانچویں صلاحیت پیدا ہوئی کہ نَوعوں نے خود کو پہچان لیا اور یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی کہ کسی عظیم اور بابرکت ہستی نے مجھے پیدا کیا ہے اور یہ ہستی اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے۔ کائنات نے اس بات کا اقرار کیا کہ ''جی ہاں! ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہمارے ربّ ہیں آپ نے ہمیں پیدا کیا ہے۔'' اس عالم میں کائنات (انسان) نے اللہ کو دیکھ لیا اور پہچان لیا۔ے صحیح نہیں ہوتے۔ کوئی نگینہ یا پتھر مخصوص رنگ کی کمی کو دور کر کے رنگوں کو اعتدال میں لے آتا ہے۔

روح سے وُقوف حاصل کرنا

سوال: روح کیا ہے؟ اس کو تفصیل سے بیان کریں اور روح سے وُقوف کیسے کیا جا سکتا ہے؟

جواب: قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے کہلوگ تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دو کہ روح میرے ربّ کے امر سے ہے۔ (سورۃ الِاسراء/سورۃ بنی اسرائیل—آیت 85) قرآن پاک کی آیات میں یہ بھی ارشاد ہوا کہانسان ناقابل تذکرہ شئے تھا۔ ہم نے اس کے اندر اپنی روح ڈال دی۔ یہ بولتا، سنتا، سمجھتا اور محسوس کرتا انسان بن گیا۔ (سورۃ الانسان/سورۃ الدّھر—آیت نمبر 1—2) بات سیدھی اور صاف ہے کہ انسان گوشت پوست اور ہڈیوں کے ڈھانچے کے اعتبار سے ناقابل تذکرہ شئے ہے۔ اس کے اندر اللہ کی پھونکی ہوئی روح نے اس کی تمام صلاحیتوں اور زندگی کے تمام اعمال و حرکات کو متحرّک کیا ہوا ہے۔ ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کا پورا جسم موجود ہونے کے باوجود اس کی حرکت ختم ہو جاتی ہے یعنی حرکت تابع ہے روح کے... در حقیقت روح ہی زندگی ہے اور روح کے اوپر ہی تمام اعمال و حرکات کا انحصار ہے۔ روح کی ہر حرکت میں مقداریں کام کرتی ہیں.. اور یہ معیّن مقداریں استعمال کر کے روح مختلف حیثیتوں اور رنگ و روپ میں اپنا تعارف پیش کرتی ہے۔

روح جب ان معیّن مقداروں کے تانے بانے کے ساتھ لباس تیار کرتی ہے، جس کو ہم درخت کہتے ہیں تو روح ہمیں درخت کی شکل میں نظر آتی ہے اور روح جب وہ مقداریں پیش کرتی ہے جو بکر میں ہوتی ہیں تب وہ ہمیں بکری نظر آتی ہے۔ علیٰ ہذالقیاس اس طرح جتنی نَوعیں اور نَوعوں کی شکل و صورت ہم دیکھتے ہیں یا ایسی نَوع جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے وہ روح کے لباس کی ہر لمحہ بدلتی ہوئی تصویریں ہیں۔ روح جب ملاءِ اعلیٰ کے لباس میں خود کو پیش کرتی ہے تب وہ ملاءِ اعلیٰ کہلاتی ہے۔ ملاءِ اعلیٰ میں گروہ جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل شامل ہیں۔ روح ہی کی تخلیق حاملان عرش، ملائکہ سماوی، ملائکہ ارضی اور ایسے سیّارے ہیں جن میں اربوں کھربوں انسان جنّات اور دوسری مخلوق آباد ہیں۔ روح ہمیشہ پردے میں رہتی ہے اور خود کو کسی نہ کسی لباس یا حجاب میں ظاہر کرتی ہے۔ روح کے بارے میں

جتنے تذکرے ملتے ہیں اور جن لوگوں نے روح کی تعریف بیان کی ہے انہوں نے روح کو کسی نہ کسی شکل وصورت میں بیان کیا ہے مثلاً روشنی، نور وغیرہ وغیرہ۔ روشنی بھی ایک شکل ہے اور نور کی بھی ایک تعریف ہے۔ فی الواقع روح کیا ہے؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟... اس کو واضح طور پر بیان کرنے کے لئے ہمارے پاس الفاظ (Vocabulary) نہیں ہے۔ روح جس نَوع کا لباس اختیار کرتی ہے اس کو زندہ رکھنے کے لئے تمام ضروری حواس بخشتی ہے۔ یہ حواس ہی ہیں جو الگ الگ مقدار رکھتے ہیں... زمان و مکان کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ حواس کی ذیلی تخلیق بھی روح کی تخلیق ہے۔ اس طرح جیسے انسان ہوائی جہاز بناتا ہے تو کہا یہ جاتا ہے کہ انسان ہوائی جہاز کا خالق ہے حالانکہ ہوائی جہاز کی تخلیق میں درجہ بدرجہ وہ تمام تحریکات موجود ہیں جو روح سے انسان کو منتقل ہوتی ہیں۔ جب کوئی انسان تخلیقی مقداروں سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس حد تک آزاد ہو جاتا ہے کہ روح کا بنایا ہوا لباس یا اپنے لئے روح کے مُتعیّن کردہ میڈیم کی نفی ہو جاتی ہے، تو وہ ایک حد تک جتنا اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں، روح سے وُقوف حاصل کر لیتا ہے اور یہ وُقوف انسان کو تمام فاصلوں اور تمام حدبندیوں سے آزاد کر دیتا ہے۔ روح سے وُقوف حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی توجّہ اپنے اندر (Inner) میں مرکوز کر دیں۔ جوں جوں ہماری فکر گہرائی میں اترتی چلی جائے گی ویسے ویسے ہم روح سے واقف ہو جائیں گے۔ اپنی توجّہ اپنے Inner میں مرکوز کرنے کے لئے مراقبہ پہلی سیڑھی ہے۔

نظر کا قانون

سوال: روحانی علوم پر بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ دوسرے علوم کی طرح روحانی یا ماورائی علوم پر بھی غیر مسلم دانشوروں کا تسلّط ہو گیا ہے۔ جب کہ مذہبی نقطہ نظر سے اور دینِ فطرت کے پیشِ نظر روحانیت مسلمانوں کا ورثہ تھا۔ ماورائی علوم میں یہ بات بطورِ خاص بتائی جاتی ہے کہ اگر نظر کو مسلسل کسی ایک نقطے پر قائم کر دیا جائے تو اس عمل سے روحانی صلاحیتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ براہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: ہم جب اپنے ارد گرد دنیااور دنیا سے نکل کر کائنات پر غور کرتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ ہر چیز حرکت میں ہے۔انتہا یہ ہے کہ ہر لمحہ اور ہر آن حرکت میں ہے۔ لیکن حرکت میں ہونے کے باوجود ہم اشیاء کو ٹھہرا ہوا دیکھتے ہیں۔ قانون یہ ہے کہ جب کوئی چیز ٹھہری ہوئی سامنے ہوتی ہے تو اس پر نظر پندرہ سیکنڈ تک قائم ہو جاتی ہے۔آنکھ جس کسی چیز کو دیکھتی ہے تو عکس دماغ کی سکرین پر منتقل ہوتا ہے اور روحانی علوم کی روشنی میں پندرہ سیکنڈ تک برقرار رہتا ہے۔ان پندرہ سیکنڈوں میں کسی چیز کا عکس منتقل ہونا،پرنٹ ہونا، ہلکا،مدہم ہو کر مٹ جانااور اس کی جگہ دوسرا عکس آجانا شامل ہے۔اب قانون یہ بنا کہ اگر کسی ٹارگٹ پر نظر کو پندرہ سیکنڈ سے زیادہ قائم کر دیا جائے تو ایک ہی عکس مسلسل دماغ پر وارد ہوتا رہے گا اور اس طرح اسپیس کی نفی ہونا شروع ہو جائے گی اور جب اسپیس کی نفی یعنی Less ہو جائے گا تو جو عکس بھی دماغ پر وارد ہو گا وہ اسپیس (Space) کی قید سے آزاد ہو جائے گا۔لوحِ محفوظ کا قانون یہ ہے کہ آنکھ کے ذریعے دماغ کے اوپر عکس اس وقت پلٹتا ہے جب آنکھ کے ڈیلوں کے اوپر پلکوں کی چوٹ پڑے۔چونکہ نظر قائم کرنے میں پلکوں کی حرکت ساکت ہو جاتی ہے،ڈیلوں کی حرکت معطل ہو جاتی ہے،اس لئے دماغ کی اسکرین پر دوسرا عکس منتقل نہیں ہوتا۔کوئی بھی شخص اگر اپنے اندر اس روحانی صلاحیت کو بیدار کر لے تو وہ اپنے ارادے سے اشیاء،واقعات،ماضی یا مستقبل کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

زمان و مکان (Time And Space)

سوال: آدمی مراقبے کے ذریعے زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ جب زمان و مکان نہیں رہیں گے تو محسوسات کی دنیا بھی نہیں رہے گی اور جب محسوسات کی دنیا ہی نہیں رہے گی تو آدمی کا Time&Space کی پابندیوں سے آزاد ہونا یا نہ ہونا دونوں کیوں کر زیر بحث آسکتے ہیں؟

جواب: یہ صحیح ہے کہ اگر زمان و مکان ناپید ہو جائیں تو کسی وجود کا تذکرہ ممکن نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جس حالت یا کیفیت کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے لئے قریب تر اور مناسب ترین الفاظ استعمال کئے جاتے

ہیں۔زمان و مکان کی آزادی کیا ہے؟اس کو سمجھنے کے لئے ہم ایک مثال کا سہارا لیتے ہیں۔ مثلاً بھوک کا تقاضہ ایک اطلاع ہے اور اس تقاضے کی تکمیل کیسے کی جائے یا کون سا کھانا کھایا جائے... یہ اطلاع میں معنی پہنانے کا عمل ہے۔انسان کا ذہن یادماغ بیک وقت دو طرزوں میں کام کرتا ہے۔ 1.ایک طرز یہ ہے کہ انسان خود کو پابند محسوس کرتا ہے،اور 2.دوسری طرز یہ ہے کہ انسان خود کو پابند محسوس نہیں کرتا۔پہلی طرز میں دماغ ایسے معنی پہناتا ہے جس میں زمانی اور مکانی فاصلے زیر بحث آتے ہیں،اور...دوسری طرز میں دماغ زمانی و مکانی فاصلوں کو گھٹا کر اتنا کم کر دیتا ہے کہ ہم اس کو وقت یا مکانیت میں بیان نہیں کر سکتے۔ مثلاً جب دماغ بھوک کی اطلاع کو معنی پہنائے گا تو ہمیں متواتر اور مسلسل کئی حد بندیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔پہلے ہم زمین کو ہموار کریں گے پھر ہل چلائیں گے،گیہوں بوئیں گے،پانی دیں گے،اس کی حفاظت کریں گے اور گیہوں جب تیار ہو جائے گا تو کاٹ کر بالیوں کو الگ کر کے گیہوں کو علیحدہ کریں گے اور چکی میں پیس کر آٹا گوندھیں گے۔آٹا گوندھنے کے بعد بھی توے اور چولہے کے عمل سے گزر کر ہی روٹی کھا سکیں گے۔

ہم خواب دیکھتے ہیں اور بعض مرتبہ خواب کے دوران بھی کھاتے ہیں۔خواب میں روٹی کھانے کا عمل بیداری میں روٹی کھانے کے عمل سے مختلف ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ خواب میں ہمیں بھوک لگی اور روٹی سامنے آگئی۔یہی صورتحال جنّت کی زندگی میں بھی ہے۔ جیسے ہی دماغ میں یہ اطلاع آئی کہ کچھ کھانا چاہئے فوراً ہی وہ چیز سامنے موجود ہو جاتی ہے۔ بیداری کے اعمال کی طرح روٹی کھانے کے لئے گیہوں بونا، کاٹنا، پیسنا وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ مراقبے کے ذریعے آدمی جب اس صلاحیت کا استعمال سیکھ جاتا ہے جس صلاحیت میں حد بندیاں نہیں ہیں تو زمان و مکان کی پابندیوں سے گزرے بغیر ہر وہ کام ہو جاتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور حضور پاک ﷺ کے دوست،اوّلیاءاللہ کے کتنے ہی واقعات اس قانون کے شاہد ہیں۔

بابِ ہشتم

شجرِ ممنوعہ کیا ہے؟

سوال: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ آدم کو خلیفۃُ الارض بنایا ہے۔ اگر وہ شجرِ ممنوعہ کے قریب نہ جاتا تو زمین پر کون آتا اور خلیفہ بنتا؟ جنّت میں شجرِ ممنوعہ کیوں رکھا گیا؟ اگر شجرِ ممنوعہ نہ ہوتا تو کیا انسان خلیفہ بنتا؟

جواب: اگر شجرِ ممنوعہ نہ ہوتا، اختیارات زیر بحث نہ آتے، انسان کی فضیلت اس بات میں ہے کہ صاحب اختیار ہے اور اپنے اختیار سے بھلائی اور اچھائی کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم زاد کو اچھائی اور برائی اپنانے کا اختیار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اے آدم اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔" (سورۃ البقرۃ–35)

آپ غور فرمائیں کروڑوں میل کے رقبے پر جنّت آباد ہے۔ ہر جگہ جانے آنے اور کھانے پینے کی آزادی ہے۔ ایک جگہ جانے سے اللہ تعالیٰ منع فرما دیتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ تم اس درخت کے قریب گئے تو تم اپنے اوپر ظلم کرو گے۔ آدم سہواً اس درخت کے قریب چلے گئے بعد میں پچھتائے اور اللہ تعالیٰ سے عفو و درگزر کی درخواست کی۔ یہ بات کہ درخت نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟۔۔۔۔۔ تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جنّت نہیں ہوتی، یہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ اس طرز کے خیالات غیر یقینی طرزِ فکر سے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے اجتناب کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ استغفار کرنا چاہئے۔

کائنات کا بنیادی مسالہ

سوال: ہر پیدا ہونے والی چیز میں کوئی نہ کوئی رنگ ضرور ہوتا ہے۔ کیوں؟

جواب: پھول اگر رنگین ہے تو درخت کا پھول الگ رنگ لئے ہوئے ہے۔ اس کی رنگ سازی کا عالم یہ ہے کہ کوئی پھول اس قدر سرخ ہوتا ہے کہ نَوعِ انسانی کا اس قدر سرخ رنگ بنانا آسان نہیں۔ پھول کے رنگوں میں کہیں سفید کہیں سبز اور کہیں اُودا (جامنی)۔ مطلب یہ ہے کہ بے شمار رنگ زمین سے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شان بھی کیسی عجیب شان ہے کہ زمین ایک ہے، ہَوا بھی ایک ہے، سورج کی روشنی بھی ایک ہے، پانی بھی ایک ہے، پیدائش کا طریقہ بھی ایک ہے لیکن ہر چیز ایک دوسرے سے مختلف ہے!

اور دوسری بات جو بہت زیادہ توجّہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والی شئے میں کسی نہ کسی رنگ کا غلبہ ضرور رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو بے رنگ ہو۔ یہ بے رنگ اور رنگ دراصل خالق اور تخلیق کے درمیان ایک پردہ ہے۔ خالق سے مخلوق کو جو چیز الگ اور ممتاز کرتی ہے وہ رنگ ہے۔

انسان کے اندر جب تخلیقی صفات کا مظاہرہ ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کے اندر تخلیقی صلاحیتوں کا علم بیدار کر دیتے ہیں تو اس کے اوپر یہ بات منکشف ہو جاتی ہے کہ تخلیق کا مطلب ہی یہ ہے کہ کوئی خیال ہے بے رنگ خیال جب رنگین ہو جاتا ہے تو تخلیق بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بحیثیت خالق کے جو کچھ بھی ہیں اس کا الفاظ میں احاطہ ممکن نہیں ہے۔ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ بحیثیت خالق کے ظاہر ہو گئے ہیں ان کا ارشاد بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ ایسی ماوراء ہستی ہیں کہ جو تمام مخلوقات سے الگ اور ممتاز ہیں۔

حضور قلندر بابا اؤلیاءؒ نے ''لوح قلم'' میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو ورائے بے رنگ فرمایا ہے۔ یعنی:

رنگ

بے رنگ، اور

ورائے بے رنگ۔

اللہ تعالیٰ نے جب کائنات کو بنانے کا ارادہ فرمایا تو جو کچھ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا اس کا ارادہ کیا اور فرمایا کن، اور وہ چیز وجود میں آگئی یعنی ورائے بے رنگ سے نزول کر کے اللہ تعالیٰ کے خیال نے ایک رنگ اختیار کیا۔ جس کو سمجھنے کے لئے تصوّف نے بے رنگی کا نام دیا۔ یعنی ایسا رنگ جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا اور جس کی الفاظ میں تشریح نہیں کی جا سکتی۔ پھر اس بے رنگی میں حرکت پیدا ہوئی تو رنگین وجود تخلیق میں آگیا اور یہی وجود مختلف صورتوں میں اور مختلف رنگوں میں اور مختلف صلاحیتوں کے ساتھ مجسّم اور متشکّل ہو گیا۔ اس بات سے یہ پتہ چلا کہ کائنات کی تخلیق میں بنیادی عنصر یا بنیادی مسالہ رنگ ہے۔

اِرتکازِ توجّہ

سوال: روحانی علوم میں بہت سی ایسی مشقیں ہیں جو اِرتکازِ توجّہ کی مشقیں کہلاتی ہیں، جبکہ مراقبہ بھی اِرتکازِ توجّہ کا عمل ہے۔ اس بات کی وضاحت کریں کہ توجّہ کو ایک نقطے پر مرکوز کرنے اور روحانی بیداری کا کیا تعلق ہے؟ نیز ان دونوں مشقوں کے نام اور طریقے الگ الگ کیوں ہیں؟

جواب: آپ کو کبھی نہ کبھی اس بات کا تجربہ ہوا ہو گا کہ آپ بیٹھے ہیں اور بے خیالی میں آپ کی نگاہیں کسی نقطے پر جم جاتی ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ نقطہ نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس وقت ماحول کا احساس کسی حد تک دب جاتا ہے۔ کسی نقطے پر نگاہیں مرکوز کرنے سے وہ نقطہ غائب کیوں ہو جاتا ہے یا ماحول کا احساس مغلوب کیوں ہو جاتا ہے؟ اس بات کو سمجھنا ضروری ہے۔ بیداری میں آنکھ کے ڈیلوں پر جِلدی غلاف متحرّک رہتا ہے۔ جب یہ غلاف حرکت کرتا ہے تو ڈیلوں پر ہلکی ضرب لگاتا ہے اور آنکھ کو ایک لمحے کے لئے روشنیوں اور مناظر سے منقطع کر دیتا ہے۔

غلاف کی اس حرکت کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خارجی چیزیں جس قدر ہیں، آنکھ ان سے بتدریج مطلع ہوتی ہے اور جس طرح مطلع ہوتی جاتی ہے، ذہن کو بھی اطلاع پہنچاتی رہتی ہے۔ اصول یہ بنا کہ مادّی اشیاء کا احساس ہلکی ضرب کے بعد روشنیوں کا اِنقطِاع چاہتا ہے۔ اس اثناء میں وہ ذہن کو بتادیتا ہے کہ میں نے کیا دیکھا ہے۔ جن چیزوں کو ہم مادّی خدوخال میں محسوس کرتے ہیں ان چیزوں کے احساس کو بیدار کرنے کے لئے آنکھوں کے مادّی ڈیلے اور غلاف کی مادّی حرکات ضروری ہے۔ اگر ہم ان چیزوں کی معنوی یا باطنی شکل وصورت کا احساس بیدار کرنا چاہیں تو اس عمل کے خلاف اہتمام کرنا ہوگا۔ اس صورت میں آنکھ کو بند کرکے آنکھ کے ڈیلوں کو معطّل اور غیر متحرّک کردینا ضروری ہے۔ مادّی اشیاء کا احساس مادّی آنکھ میں نگاہ کے ذریعے واقع ہوتا ہے اور جس نگاہ کے ذریعے مادّی احساس کا یہ عمل وقوع میں آتا ہے وہی نگاہ کسی چیز کی معنوی شکل وصورت میں بھی استعمال ہوتی ہے یا یوں کہئے کہ نگاہ مادّی حرکات اور روحانی حرکات میں ایک مشترکہ آلہ ہے۔ دیکھنے کا کام بہرصورت نگاہ ہی انجام دیتی ہے۔ جب ہم آنکھوں کے مادّی وسائل کو معطّل کردیں گے اور نگاہ کو متوجّہ رکھیں گے تو نگاہ معنوی یا روحانی شکل وصورت کو لازمی دیکھے گی۔

ہمارے شعور کے اندر بہنے والی رَو میں جیسے جیسے ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے۔ آنکھ کے ڈیلوں کی حرکات بھی ساکت ہونے لگتی ہیں۔ ٹھہراؤ کی مناسبت سے ہماری آنکھ میں واقع ہونے والی بصارت کا عمل بھی تعطّل کا شکار ہوجاتا ہے۔ جب یہ ٹھہراؤ (اِرتکاز) بڑھ کر ایک خاص حد تک پہنچ جاتا ہے تو نگاہ کی طرز بدل جاتی ہے۔ بصارت کا مادّی عمل، باطنی بینائی یا باطنی نظر سے ردّوبدل ہوجاتا ہے۔ شعوری طور پر اس کا قانون یہ ہے کہ ذہنی رجحانات یا ذہنی مرکزیت کو زیادہ سے زیادہ دیر تک ایک نقطہ پر مرکوز رکھا جائے۔ مراقبہ میں جب آنکھیں بند کی جاتی ہیں تو ڈیلوں کی حرکات معطّل ہونے لگتی ہیں۔ جب بند آنکھوں سے ذہن ایک خیال یا تصوّر پر متواتر مرکوز رہتا ہے تو رفتہ رفتہ ظاہری حواس یا آنکھ کے ڈیلوں کی حرکات میں ٹھہراؤ واقع ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ مادّی آنکھ سے دیکھنے کا عمل ساکت ہوجاتا ہے اور باطنی نظر کام کرنے لگتی ہے۔

ذہن کو ایک نقطے پر مرکوز کرنے اور ڈیلوں کی حرکات کو معطّل کرنے کا دوسرا طریقہ اِرتکازِ توجّہ کی مختلف مشقیں ہیں۔ ان مشقوں میں پلک جھپکائے بغیر کسی ایک نقطے پر نظریں جمائی جاتی ہیں۔ پلک نہ جھپکانے سے آنکھ کے ڈیلوں پر ضرب لگانے کا عمل رک جاتا ہے اور ڈیلے کی حرکات میں سکُوت واقع ہونے لگتا ہے۔ جب متواتر نظریں ایک نقطے پر مرکوز رہتی ہیں تو تصوّر میں اِضمحلال پیدا ہونے لگتا ہے اور اسی مناسبت سے آنکھ کے ڈیلوں کی حرکات کا سکُوت بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس مشق سے نہ صرف ڈیلوں کی حرکات انسان کے قابو میں آجاتی ہیں بلکہ مشق کرتے ہوئے ڈیلے اس حد تک معطّل ہو جاتے ہیں کہ باطنی نگاہ کام کرنے لگتی ہے۔ اِرتکازِ توجّہ اور مراقبہ کی مشقوں میں فرق یہ ہے کہ مراقبہ میں آنکھیں بند رکھی جاتی ہیں تاکہ آنکھ کے پردوں کا دباؤ ڈیلے کی حرکات کے تعطّل میں مدد دے۔ اس کے ساتھ ساتھ بند آنکھوں سے ذہن کو کسی تصوّر پر قائم رکھا جاتا ہے تو یکسوئی کے زیادہ مواقع میسر آتے ہیں۔ اِرتکازِ توجّہ کی دیگر مشقوں میں نگاہوں کو ایک جگہ جما کر، پلک نہ جھپکا کر، ارادے کے ساتھ ڈیلوں کی حرکات کو معطّل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس مشق میں اِرتکازِ توجّہ کو نگاہ کے سامنے رکھا جاتا ہے۔

جسم میں لطیفے

سوال: میں چند سوالات کرنا چاہتا ہوں جس کے جوابات نہ صرف میرے لئے بلکہ دیگر قارئین کے لئے بھی فائدہ مند ہوں گے۔ آپ اس کے جوابات ضرور شائع کریں۔۔۔۔۔ ممنون رہوں گا۔۔۔۔۔ سوالات درج ذیل ہیں۔ 1۔ انسانی جسم میں لطیفے (روشن نقطے) ہوتے ہیں۔ لطیفے کا کیا مطلب ہے؟ 2۔ ’’علمِ لدُنّی‘‘ کون سا علم ہے؟۔۔۔۔۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ 3۔ پیر و مرشد کے وصال کے بعد مرید کس طرح رہنمائی حاصل کرے؟۔۔۔۔۔ یکسوئی حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ 4۔ وسوسوں اور خیالات سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جائے؟

جواب: ہم ایک مکان بناتے ہیں لیکن مکان کی اس وقت تک تکمیل نہ ہو گی جب تک پہلے اس کی بنیاد نہ رکھی جائے اور بنیاد کے اوپر دیواریں کھڑی نہ کی جائیں۔اسی طرح روح کی حقیقت یا بنیاد کو سمجھنے کے لئے اہلِ تصوّف نے تین حصے کئے ہیں اور ہر حصے کو دو رخ پر تقسیم کیا ہے۔اس طرح ان کی کل تعداد چھ ہو گئی.....یہی چھ رخ تصوّف میں لطیفے کہلاتے ہیں۔ہم جب کوئی عمل کرتے ہیں تو تین کیفیتوں سے گزرتے ہیں۔

خیال تصوّر،اور احساس۔کیفیت دو رخ پر قائم ہے اس طرح چھ رخ یا لطیفے مُتعیّن ہو گئے۔روح کے ایک حصّہ کو روح حیوانی، دوسرے حصّہ کو روح انسانی،اور تیسرے حصّہ کو روح اعظم کہا جاتا ہے۔روح حیوانی کے دو رخ..... لطیفہِ ُنفسی اور لطیفہ قلبی ہیں۔روح انسانی کے دو رخ...... لطیفہِ ُروح اور لطیفہ سری ہیں۔روح اعظم کے دو رخ...... لطیفہِ ُخفی اور اخفیٰ ہیں۔خفی،اخفیٰ میں.... خیال تشکیل پاتا ہے۔سری اور روح میں.... تصوّر کی منظر کشی ہوتی ہے۔قلب اور نفس میں..... کسی چیز کا احساس یا مشاہدہ ہوتا ہے۔

علمِ لدُنّی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی خاص رحمت سے عطا کرتے ہیں۔اوّلیاءاللہ کے وصال کے بعد ان کی روح سے فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔یاد رکھئے روح کبھی نہیں مرتی......روح ہمیشہ زندہ رہتی ہے کیونکہ وہ قائم بالذّات ہے۔یکسوئی حاصل کرنے کے لئے میرے تجربے میں مراقبہ سے زیادہ کوئی عمل موثر نہیں ہے۔مراقبہ کے ذریعے سالک کو یکسوئی کی اتنی زیادہ مشق ہو جاتی ہے کہ وہ نماز بھی یکسوئی سے قائم کرتا ہے۔محسوس کرتا ہے کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے اور میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔

مادری زبان میں خیالات

سوال: میں ٹیلی پیتھی کے موضوع پر آپ کی کتاب کا مطالعہ کر چکی ہوں۔اس موضوع پر ایک سوال میرے ذہن میں آیا ہے۔وہ یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں جو خیالات آتے ہیں وہ ہماری زبان میں ہوتے ہیں یعنی ہم جو کچھ سوچتے ہیں وہ مادری زبان میں ہوتا ہے۔اگر دو اشخاص کے درمیان خیالات کا تبادلہ ہوتا ہے اور دونوں کی مادری

زبانیں الگ الگ ہیں تو پیغام وصول کرنے والا، پیغام بھیجنے والے کی بات کو کس طرح سمجھے گا؟ کیونکہ دونوں کی زبانوں میں فرق ہے۔

جواب: انسان کا ذہن اطلاعات کا مجموعہ ہے۔ انسان کے ذہن میں جو حرکات واقع ہوتی ہیں ان کی تحریک اطلاع سے ملتی ہے۔ تمام طبعی تقاضے بھی اطلاع سے جنم لیتے ہیں۔ ہم جسے خیال کہتے ہیں وہ اطلاع یا انفارمیشن کا مظاہرہ ہے۔ مثلاً ہمارے ذہن میں بھوک کی اطلاع وارِد ہوتی ہے۔ یہی اطلاع گہری ہو کر خیال بن جاتی ہے۔ خیال میں تصویری خدوخال موجود ہوتے ہیں لیکن یہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں کہ ذہن انہیں صرف ادراک کی حدود میں محسوس کرتا ہے۔ خیال میں بھوک کی اطلاع کے ساتھ ساتھ اس کے معانی بھی شامل ہوتے ہیں یعنی بھوک کن چیزوں سے مٹائی جاتی ہے۔ چنانچہ اطلاع اور اس میں معانی دونوں رخ مل کر خیال کو تشکیل دیتے ہیں۔ خیال میں معنوی اعتبار سے پوری نَوعِ انسان نقطۂِ اِشتراک رکھتی ہے۔ جتنے بھی بنیادی تقاضے ہیں، انہیں ہر انسان ایک ہی طرح قبول کرتا ہے.... اسی طرح اشیاء کو سمجھنے میں بھی انسانوں کا ذہن مماثلت رکھتا ہے۔ نَوعِ انسان کا کوئی بھی فرد ہو جب وہ پانی کو دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں پانی کی صفات اور پانی کی معنویت آتی ہے۔ سارے انسان پانی کو ایک ہی طرح سے سمجھتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں۔ یہی حال دوسرے تمام بنیادی معاملات کا ہے۔ انسان اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے زبان کا استعمال کرتا ہے۔ وہ منہ اور زبان کی مدد سے آواز نکال کر اپنا مطلب مخاطب تک پہنچاتا ہے۔ مختلف آوازوں کے معانی مقرر کر لئے گئے ہیں اور ان معانی کی مدد سے ایک دوسرے کی بات سمجھ لی جاتی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ زبان و بیان کے معاملے میں بھی اوّلیت معانی کو حاصل ہے آواز یا الفاظ ثانویت رکھتے ہیں۔ ہم جب کوئی لفظ منہ سے ادا کرتے ہیں تو مخاطب تک لفظ نہیں اس کے معانی منتقل ہوتے ہیں۔ جب ہم لفظ پانی کہتے ہیں تو اس سے مراد.... پے، الف، نون، یے.... نہیں ہوتا بلکہ پانی کی معنویت اور پانی کی خصوصیت ہوتی ہے جو مخاطب سمجھتا ہے۔

پوری نَوع میں ایک ہی ذہن کارفرما ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے انسانوں میں بنیادی تقاضے اور ان کے معانی ایک جیسے ہیں۔ ہر شخص میں خیالات ایک ترتیب سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ انہیں ایک طرز پر محسوس کرتا ہے۔ اس وَحدت کا تعلق انسان کی روح سے ہے۔ روح وہ اکائی یا یونٹ ہے جس کے ذریعے سارے انسان ایک رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ روح ہی کی صلاحیت کے ذریعے انسان مختلف طریقۂ بیان استعمال کر کے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ جسے روح یا انسان کا لاشعور کہا جاتا ہے وہ تمام طریقوں سے واقف ہے۔ اسی لئے جب ٹیلی پیتھی کے ذریعے کوئی شخص اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے تو مادری زبان الگ ہونے کے باوجود مطلب دوسرے شخص پر واضح ہو جاتا ہے۔ انسان کے لاشعور میں ایک کمپیوٹر نصب ہے جو مترجم کا کام کرتا ہے جیسے ہی الفاظ کے جامے میں خیالات اس یونٹ تک پہنچتے ہیں وہ شعوری اُسلوب کے مطابق مادری زبان میں ترجمہ ہو جاتے ہیں مثلاً ایک پیغام بھیجنے والا انگریزی میں لفظ پانی ادا کرتا ہے تو اردو سمجھنے والے شخص کے ذہن میں اردو لفظ پانی ہی منتقل ہوگا۔ یہی حال دوسرے تمام خیالات کا ہے۔

تصوّرِ شیخ

سوال: علمِ روحانیت میں شاگرد کو استاد کا تصوّر پابندی سے کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے جسے اصطلاحاً تصوّرِ شیخ کہتے ہیں۔ تصوّرِ شیخ میں شاگرد مراقبے میں آنکھیں بند کر کے اپنے استاد کا تصوّر کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی شخص کا تصوّر کرنے سے روحانی علوم کی تحصیل کا کیا تعلق ہے؟

جواب: کائنات اجرام سماوی، موالید ثلاثہ وغیرہ کتنی ہی مخلوقات اور موجودات کا مجموعہ ہے۔ کائنات کے تمام اجزاء اور افراد میں ایک ربط موجود ہے۔ مادّی آنکھ اس رابطہ کو دیکھ سکے یا نہ دیکھ سکے اس کے وجود کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

جب ہم کسی چیز کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں، اسے دیکھتے ہیں تو دیکھنے سے ہمیں اس چیز کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور ہم اس کی صفات کو سمجھ لیتے ہیں۔ سمجھنے کی نسبت ذہن کے استعمال کی گہرائی سے تعلق رکھتی ہے۔ جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں یا اس کے بارے میں سوچتے ہیں یا سنتے ہیں تو اس چیز کی ذات اور صفات ہمارے اندر دَور کر جاتی ہیں۔ ہم آگ کو دیکھتے ہیں، اس کا تصوّر کرتے ہیں یا اس کا تذکرہ کرتے ہیں تو آگ کی صفات محسوسات بن کر ہمارے اندر سے گزر جاتی ہیں۔ یہ عمل بہت ہلکا ہو یا محض ادراک کی سطح پر ہو بہر حال ایسا ضرور ہوتا ہے۔ آگ کے تصوّر کے ساتھ ساتھ ہم گرمی اور روشنی کا احساس بھی کرتے ہیں۔ سرسبز و شاداب درخت کو دیکھ کر یا کسی ہرے بھرے باغ کا تذکرہ سن کر ہمارے اندر فرحت، شگفتگی اور ٹھنڈک کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اسی قانون کے تحت مثلاً جب ہم محمود کو دیکھتے ہیں یا محمود کا نام سنتے ہیں یا محمود کا تصوّر ہمارے ذہن میں آتا ہے تو ہمارے ذہن میں لفظ محمود یا محمود کے ہجے نہیں آتے بلکہ محمود کی ذات اور شخصیت آتی ہے جو کتنی ہی صفات کا مجموعہ ہے۔

انسان کو علم و فن یا کسی صلاحیت کی منتقلی دو طرح سے عمل میں آتی ہے۔ ایک طرز میں اسے کسی استاد کے آگے زانوئے تلمیذ طے کر بیٹھنا پڑتا ہے اور استاد سبقاً سبقاً کوئی علم سکھاتا ہے۔ استاد الفاظ تحریر اور عملی مظاہرات کی رُو سے تعلیم دیتا ہے اور شاگرد بتدریج اسے اپنے ذہن میں محفوظ کرتا جاتا ہے۔ علم کی گہرائی اور وسعت نیز شاگرد کے ذوق و شوق کی مناسبت سے علم کی منتقلی میں ہفتوں، مہینوں اور بسا اوقات سالوں کا عرصہ لگ جاتا ہے۔

منتقلی کی دوسری طرز میں الفاظ، تحریر یا کسی منظّم مظاہرے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ علم یا صلاحیت صرف توجّہ اور ذہنی تعلق کی وجہ سے منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کی واضح مثال مادری زبان ہے۔ بچہ اپنی ماں یا ماحول کے دوسرے افراد سے تحریری یا زبانی کوئی سبق نہیں لیتا۔ محض:

تخلیقی ربط،

ذہنی قربت اور تعلق

کی وجہ سے وہی زبان بولنے لگتا ہے جو اس کی ماں بولتی ہے یا ماحول کے دوسرے افراد بولتے ہیں۔ بچہ زبان کی ساخت، الفاظ اور جملوں کے بغیر بتائے وہی مطلب اخذ کرتا ہے جو دوسرے افراد سمجھتے ہیں۔ نہ صرف مادری زبان بلکہ دوسری بہت سی صلاحیتیں عادات و اطوار بچے کو ماحول سے اس طرح منتقل ہو جاتے ہیں کہ بچے کو انہیں سیکھنے کے لئے شاگرد کا مروّجہ کردار ادا نہیں کرنا پڑتا۔

روحانی علوم کی منتقلی میں بنیادی طور پر دوسری طرز کام کرتی ہے۔ شاگرد اور استاد کے درمیان روحانی قلبی رشتہ کی بدولت استاد کے علوم، استاد کی طرزِ فکر اور استاد کے انوار شاگرد کو منتقل ہوتے رہتے ہیں اور شاگرد کا شعور ان چیزوں کے مفہوم کو آہستہ آہستہ سمجھتا رہتا ہے.... استاد ثانوی طور پر روحانی علوم کو درجہ بندی کے ذریعے اسباق کی صورت میں اور مظاہرات کی شکل میں شاگرد سے متعارف کراتا ہے تاکہ حافظہ ایک ترتیب وار شکل میں اسے یاد رکھنے کے قابل ہو سکے۔

شاگرد اور استاد کے درمیان ذہنی تعلق میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے اسی مناسبت سے استاد کی صلاحیتیں شاگرد کو منتقل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ عملی طور پر اس ربط کو مضبوط کرنے کے لئے تصوّر کے قانون سے مدد لی جاتی ہے۔ شاگرد تصوّر کی قوّت سے استاد کی شخصیت کو اپنے اندر جذب کرتا ہے۔ اسی عملی مشق کا نام تصوّرِ شیخ ہے۔ تصوّرِ شیخ کے ذریعے استاد سے قائم ذہنی تعلق میں توانائی آجاتی ہے۔ جب کوئی روحانی شاگرد، اپنے استاد کا تصوّر کرتا ہے تو اوپر بیان کئے گئے قانون کے تحت استاد کی صفات اور صلاحیتیں اس کے اندر گردش کرنے لگتی ہیں۔ جتنی دیر وہ استاد کی طرف متوجّہ رہتا ہے استاد کی صفات اور استاد کے انوار اس کے ذہن کی سطح پر منعکس ہوتے رہتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاگرد کے اندر بھی وہی صلاحیتیں اور صفات حرکت میں آجاتی ہیں جو استاد کی ذات کا حصّہ ہیں۔ تصوّرِ شیخ کی مسلسل مشق سے ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے شاگرد کا روحانی ربط ہر وقت استاد کی ذات سے قائم رہتا ہے اور استاد کے انوار مسلسل شاگرد کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب

شاگرد اپنے استاد کا عکس بن جاتا ہے یعنی اس کے اندر وہی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو استاد کے اندر موجود ہیں۔ اس مقام کو فنافی الشیخ کہتے ہیں۔

کشش کیوں ہوتی ہے؟

سوال: عورت مرد اور مرد عورت میں ہی کشش کیوں محسوس کرتا ہے؟

جواب: تخلیقی قانون میں یہ مشاہدہ کرایا جاتا ہے کہ عورت اور مرد دراصل دو رخ یا یا دو پارٹ ہیں جن کے یکجا ہونے سے مرد کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہی حال عورت کا بھی ہے۔ جب عورت اور مرد کے دو یونٹ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو عورت کا وجود ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ عورت کا رخ اگر چھپا ہو اور مغلوب ہو تو مرد کے خدوخال ظاہر ہوتے ہیں۔ مرد کا رخ مغلوب ہو تو عورت کا سراپا ظاہر ہوتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ مرد کے اندر عورت کا پورا وجود موجود ہے اور عورت کے ساتھ مرد کا پورا وجود رہتا ہے۔ جو رخ غالب ہو جاتا ہے وہی خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ جنسی کشش کا قانون بھی یہی ہے۔ مغلوب رخ چونکہ ظاہر نہیں ہوا اس لئے وہ اپنی کمی پوری کرنا چاہتا ہے۔ یعنی یہ کہ مرد کے اندر عورت کا چھپا ہوا رخ اپنی تکمیل کے لئے عورت کے مکمل رخ سے وابستہ ہونے کے لئے بے قرار رہتا ہے اور عورت کے اندر چھپا ہوا مرد اپنی تکمیل کے لئے مرد کے سراپا کو ہم آغوش کرنے کیلئے بے تاب رہتا ہے۔

معجزہ، کرامت، اِستدراج کیا ہے؟

سوال: تصوّف میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو عام عقل و شعور کے دائرہ کار سے باہر محسوس ہوتی ہیں اور ان کو خرقِ عادات، کرامات، اِستدراج اور معجزے کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ درخواست ہے کہ خرقِ عادات کے بارے میں کچھ وضاحت فرمادیں۔

جواب: 1۔ معجزہ 2۔ کرامت 3۔ اِستدراج سب سے پہلے ان تینوں کا فرق سمجھنا ضروری ہے۔اِستدراج وہ علم ہے جو اَعراف (اَعراف وہ مقام ہے جہاں مرنے کے بعد انسان قیام کرتا ہے) کی بُری روحوں یا شیطان پرست جنّات کے زیرِ سایہ کسی آدمی میں خاص وجوہ کی بناء پر پرورش پاجاتا ہے۔اس کی مثال حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے دَور میں بھی پیش آئی ہے۔علمِ نبوّت کے زیرِاثر جب کوئی خرقِ عادت نبی سے صادِر ہوتی تھی اس کو معجزہ کہتے تھے، اور جو کوئی خرقِ عادت ولی سے صادِر ہوتی ہے تو اس کو کرامت کہتے ہیں لیکن یہ بھی علمِ نبوّت کے زیرِاثر ہوتی ہے۔ معجزہ اور کرامت کا تصرّف مستقل ہوتا ہے۔ مستقل سے مراد یہ ہے کہ جب تک صاحبِ تصرّف اس چیز کو خود نہ ہٹائے وہ نہیں ہٹے گی۔ لیکن اِستدراج کے زیرِاثر جو کچھ ہوتا ہے وہ مستقل نہیں ہوتا اور اس کا اثر فضا کے تاثرات بدلنے سے خود بخود ضائع ہو جاتا ہے۔اِستدراج کے زیرِاثر جو کچھ ہوتا ہے اس کو جادو کہتے ہیں۔

قوّت ارادی کیا ہے؟

سوال: میں ایک عرصے سے روحانی ڈائجسٹ کا قاری ہوں۔ آپ اپنے مضامین میں اکثر وبیشتر ''یقین'' پر بہت زور دیتے ہیں۔ کیا یقین قوّت ارادی ''وِل پاور'' ہے؟۔۔۔۔۔۔ براہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: اگر کبھی قرآنِ پاک کے مطالعے کا موقع ملے تو آپ کو جگہ جگہ ایمان اور ایمان والوں کا تذکرہ ملے گا۔اسی ایمان کا اردو ترجمہ یقین ہے۔ صفحات کی کمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یقین کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ:

یقین جملہ مظاہرات کا سرچشمہ ہے۔ قوّت ارادی بھی یقین ہی کا ایک یونٹ ہے۔یقین کے حُصول کے لئے مشاہدہ ضروری ہے اور مشاہدے کی تکمیل صرف اسی صورت میں ہو گی جب یقین کے تین مدارج علمُ الیقین، عینُ الیقین، اور حق ُالیقینکو درجہ بدرجہ طے کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر آپ کے سامنے پہلی بار کوئی سیب کا نام لیتا ہے اور اس کے رنگ، بناوٹ، ذائقے اور فوائد کا تذکرہ کرتا ہے۔ آپ کا علمُ الیقین ہو گیا۔ یہ مشاہدے کا پہلا قدم ہے۔ دوسرے قدم پر آپ سیب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور اس کے رنگ اور بناوٹ کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ یہ عینُ الیقین کا درجہ ہے۔ تیسرے درجے میں جسے آپ حقُ الیقین کہتے ہیں، یہ آپ کو سیب، سیب کے رنگ، اس کی بناوٹ، اس کے ذائقہ اور فوائد کا نہ صرف علم ہُوا بلکہ اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ بھی کر چکے ہیں۔ اپنے طور پر سیب کر کھا کر اُس کا تجربہ بھی کر لیا ہو۔ یقین کی تکمیل صرف اُسی وقت ممکن ہے جب آپ کسی بات یا کسی چیز کی کُنہ تک پہنچ جائیں۔ زندگی اور زندگی کا ہر قدم، ہر سانس یقین کے گرد گھومتا ہے۔ یقین ہی زندگی کے جملہ نشیب و فراز، مسائل، افکار و اعمال کی پیدائش کا باعث ہے۔

اگر انسان کے اندر یقین کی وہ طاقت اور صلاحیت پیداا اور بیدار ہو جائے جس کا تذکرہ قرآنِ پاک میں خالقِ کائنات اللہ نے کیا ہے تو انسان ایسے ایسے کام انجام دے سکتا ہے جس کا گزر نَوعِ انسانی کی برادری کے شعور میں کبھی نہیں ہوا۔ یقین کی اس صلاحیت، طاقت، اس کے مظاہرے کے واقعات اور تذکرے، قرآنِ پاک میں جابجا موجود ہیں مثلاً حضرت سلیمان علیہ السّلام کے واقعے میں اسی یقین کا مظاہرہ ایک آدم زاد بندے نے اس طرح کیا کہ سارے درباری یہ منظر دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ پلک جھپکنے سے پہلے ہزاروں مِیل دُور سے حضرت سلیمان علیہ السّلام کے دربار میں بلقیس کا تخت موجود ہو گیا۔

تخلیقی اختیارات

سوال: قرآن کے مطابق انسان اشرف المخلوقات اور اللہ کا خلیفہ ہے۔ قرآن کی آیات اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ کسی تفسیر یا تشریح کی علیحدہ سے ضرورت نہیں پڑتی۔ یعنی انسان کی حیثیت علمُ الاسماء کے حُصول سے پہلے ایسی تھی جو فساد اور خون خرابہ برپا کرنے والا ہے اور علمُ الاسماء کے بعد وہ اس مقام پر فائز ہو جاتا ہے کہ فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔ یعنی علمُ الاسماء کے حُصول سے انسان اللہ کا نائب بن گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہیں ہر شئے یا ہر حکم کو

بدل سکتے ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ کیا علمُ الاسماء کے حامل بندے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اختیارات یا تخلیقی اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں؟

جواب: قلندر شعور کی تعلیمات کے مطابق انسان کی فضیلت اور کائنات میں دوسری مخلوقات کی نسبت اس کا ممتاز ہونا اور اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے انسان کا مُتّصِف ہونا اور انسان کے لئے ملائکہ کا مسجود ہونا اور انسان کے لئے کائنات کا مسخر ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کو اللہ نے اپنی ان صفات کا علم عطا کر دیا ہے جو کائنات میں موجود دوسری کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کو جان کر، پڑھ کر کوئی بندہ کائنات میں اپنی ممتاز حیثیت سے واقف ہو جاتا ہے۔ یہ سارا کا سارا علم اس نظام سے متعلق ہے جس نظام کے تحت کائنات چل رہی ہے۔

ایک صاحب علم بندہ اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ سورج کیا ہے؟ چاند کیا ہے؟ ستارے کیا ہیں؟ فرشتوں کی مخلوق کیا ہے؟ اللہ نے جنّات کو کس شکل و صورت میں پیدا کیا ہے؟ اور جنّات کی عادات واطوار کیا ہیں؟ ایک نظامِ شمسی میں کتنے سیّارے کام کرتے ہیں؟ اور ایک کہکشاں میں کتنے نظام ہائے شمسی متحرّک ہیں؟

وہ بندہ جو اللہ کی امانت کے علم کا امین ہے۔ یہ جان لیتا ہے کہ اللہ کی تخلیق میں اللہ کی صفات اور اللہ کی مشیئت کا کس طرح عمل دخل ہے؟ اس کے علم میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ آدمی مرنے سے پہلے عالم ناسوت کی زندگی کن تخلیقی فارمولوں کے تحت گزارتا ہے؟ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ پیدائش سے پہلے آدمی کہاں تھا؟ پیدائش سے پہلے آدم زاد جہاں تھا اس سے پہلے کا عالم کیا ہے؟ اگر اس عالم کا نام برزخ ہے تو برزخ سے پہلے کون سا عالم ہے؟ برزخ سے پہلے کے عالم کا نام اگر عالمِ ارواح ہے تو عالمِ ارواح سے پہلے کون سا عالم ہے؟

عالمِ ارواح میں کائنات کے افراد نَوعی اعتبار سے کس قسم کے حواس اور کس قسم کا ادراک رکھتے ہیں؟ اور کُن سے پہلے افراد کائنات کی حیثیت کیا تھی؟ یہ بات بھی اس کے علم میں ہوتی ہے کہ پیدا ہونے کے بعد سے قیامت

تک کی زندگی کن ضابطوں پر قائم ہے؟وہ یہ بھی جاتا ہے کہ ایک وجود کے اوپر روشنیوں کے کتنے غلاف چڑھے ہوتے ہیں؟اللہ کے اس علم کی بدولت اس کے مشاہدے میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ روشنیوں کے وجود کے اوپر نور کے کتنے غلاف ہیں؟نور اور تجلی میں کیا فرق ہے؟ تجلی اور تدلّی کیا ہے؟

یہ سب علوم اسے اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب وہ اس علم سے واقف ہو جاتا ہے جس علم کو اللہ نے اپنی امانت قرار دیا ہے۔ایسی امانت جو صرف انسان کو ہی حاصل ہے، یہ وہی امانت ہے جس کی وجہ سے انسان اللہ کا نائب ہے اور خلیفہ ہے۔''نیابت اور خلافت''کا مفہوم یہ ہے کہ جو جس کا نائب ہوتا ہے اس کے اختیارات اسے حاصل ہوتے ہیں۔اللہ خالق ہے، اللہ کے اپنی ذاتی اختیارات تخلیقی ہیں، انسان جب زمین پر اللہ کا نائب بنادیا گیا تو اسے بھی اللہ کے تخلیقی اختیارات منتقل ہو گئے۔ان ہی تخلیقی اختیارات کو نافذ کرنے والے بندوں کے گروہ کو''اہل تکوین'' یا خلیفہ فی الارض کہا گیا ہے۔ہم زندگی میں جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اختیارات کے تحت کرتے ہیں۔یہی اختیارات ہمارے لئے جزا اور سزا کا تعیّن بھی کرتے ہیں۔

باب نہم

بغیر استاد کیا نقصان ہوتا ہے؟

سوال: ٹیلی پیتھی کے اسباق میں یہ بات کئی بار کہی جا چکی ہے کہ ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم اور اس نوع کی دیگر مشقیں جن کا مقصد ذہنی قوتوں کو بیدار کرنا ہوتا ہے کسی ماہر استاد کی اجازت و نگرانی کے بغیر نہیں کرنی چاہئیں۔ یقیناً اس تنبیہہ کے پسِ پشت ٹھوس حقائق ہوں گے۔ کیا آپ اس امر پر روشنی ڈالیں گے کہ بغیر استاد کی نگرانی کے اس قسم کی مشقیں کرنے سے آدمی کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟

جواب: اگر کوئی شخص از خود اس قسم کی مشقیں شروع کر دے جس میں شعوری سکت نہیں ہے یا کم ہے تو وہ بہت جلد جسم میں خون کی کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ سارا جسم سوکھنے لگتا ہے۔ معدے کا فعل بگڑ سکتا ہے اور پھیپھڑوں کی کارکردگی کم ہو سکتی ہے۔ شعور کے اوپر اگر سکت سے زیادہ وزن پڑ جاتا ہے تو آدمی کا دماغی توازن خراب ہو جاتا ہے۔ ٹیلی پیتھی کی مشقیں کرنے سے لاشعور کو تحریک ملتی ہے جس کی وجہ سے شعور پر دباؤ پڑتا ہے۔ لہٰذا وہ دماغ کو بھاری کر کے ان مشقوں سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ بھاری پن سخت اشتعال، جذباتی گھٹن، سماجی اونچ نیچ اور گہرے احساس کمتری کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے روحانی استاد مشقیں شروع کرنے سے پہلے طلبہ اور طالبات کے ذہنوں کی صفائی پر بطورِ خاص زور دیتے ہیں۔ بلا اجازت مشقیں کرنے سے جنسی جذبات بھڑک اٹھنے اور جنسی امراض پیدا ہو جانے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے جبکہ ان مشقوں کے دَوران جنسی توانائی کو محفوظ رکھنے کی بالخصوص ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کو اندھا دھند خرچ کرتے رہنے سے یہ مشقین نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

میرے پاس ایک لڑکی کو لایا گیا۔ شکایت یہ بتائی گئی کہ اس کی آنکھیں آسمان کو گھورتی رہتی ہیں اور کچھ دیر بعد اس کے اعصاب اکڑ جاتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ خواب آور تیز دوائیں بھی کام نہیں کرتیں اور یہ لڑکی مستقل بہتر 72 گھنٹے سے جاگ رہی ہے۔ سب ٹیسٹ نارمل ہیں، جسمانی طور پر کوئی خرابی نہیں معالجین کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ لڑکی کو کوئی سایہ نظر آتا ہے جس سے وہ باتیں کرتی رہتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ سوالات اور تحلیلِ نفسی کے بعد یہ عقدہ کھلا کہ لڑکی نے کسی رسالے میں ٹیلی پیتھی کے اوپر شائع ہونے والی کہانی سے متاثر ہو کر سورج بینی شروع کر دی تھی اور گھر والوں کے علم میں لائے بغیر دوپہر کو چھت پر جا کر سورج دیکھا کرتی تھی۔ قصہ کوتاہ! یہ علاج تجویز کیا گیا کہ لڑکی کو دن کی روشنی میں کمرہ سے باہر نہ نکالا جائے۔ خواہ یہ کتنا بھی احتجاج کرے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بچی ٹھیک ہو گئی۔ اگر یہی مشق قاعدے قرینے سے کسی استاد کے زیرِ نگرانی کی جاتی تو نتائج منفی نہ ہوتے۔ بلکہ مثبت نتائج مرتّب ہونے سے دماغ طاقتور اور حافظہ روشن ہو جاتا۔ چہرہ میں مقناطیسیت کے چراغ جلتے بجھتے۔ فہم و فراست کے خزانے کھل جاتے۔ غیب بینی کی صلاحیت متحرّک اور بیدار ہو جاتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوتی کہ انسانی رشتوں میں محبت کی چاشنی پیدا ہو جاتی۔ ہر علم میں استاد کی جگہ خالی ہے۔ جب تک استاد نہ ہو یہ جگہ پُر نہیں ہوتی۔ ہر پیدا ہونے والے بچہ کو استاد کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر بچے کا پہلا استاد اس کی ماں اور اس کا باپ ہوتا ہے۔

سورج بینی کا کیا فائدہ ہے؟

سوال: یہ بتائیں کہ سورج بینی سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ مختلف مذاہب یا ماورائی علوم کے اسکولز میں اور روحانی سلاسل میں سورج بینی کسی نہ کسی طرح رائج ہے۔ نظر تیز کرنے اور عینک کے نمبر کم کرنے کے لئے بھی سورج بینی کی جاتی ہے۔ کس اصول پر سورج بینی سے بینائی بحال ہو جاتی ہے؟

جواب: سورج کی طرف دیکھنے سے فضا میں جو لہریں گشت کرتی ہیں وہ لہریں آنکھوں، چہرے اور بالوں کے ذریعے دماغ کے اندر داخل ہوتی ہیں۔ دماغ اور آنکھوں کے ریشوں میں جو فیکٹریاں کام کرتی ہیں وہ (بذریعہ اِنجذاب) اپنے لئے ان لہروں سے توانائی حاصل کرتی ہیں۔ صبح طلوعِ آفتاب کے وقت فضا میں ایسی توانائی کا ذخیرہ ہوتا ہے جن سے بطورِ خاص انسانی حواس، دل و دماغ کی بہت سی قوّتیں اور صلاحیتیں نمو پاتی ہیں۔ ان صلاحیتوں میں دیکھنے کی صلاحیت بھی ہے۔

سرخ نکلتے سورج کی ٹکیہ کا عکس جب آنکھ کے ریشوں اور عضلات پر پڑتا ہے تو آنکھ کے تمام عضلات اور اعصاب کو خصوصی نشو نما ملتی ہے اور سورج کی شعاعیں توانائی بخشتی ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ توانائی بینائی بحال ہونے کا ذریعہ اور مقام بن جاتی ہے اور آنکھوں سے چشمہ اتر جاتا ہے۔ سورج بینی کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ نکلتا ہوا سورج ایک منٹ سے زیادہ نہ دیکھا جائے اور جس جگہ بیٹھ کر سورج بینی کی جائے وہاں کا ماحول صاف ستھرا ہو۔ فضا میں دھواں یا گرد و غبار نہ ہو۔ آسمان اگر ابر آلود ہو تب بھی وقت مقررہ پر مشرق کی جانب منہ کر کے بیٹھ جانا چاہیئے۔

تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ اگر مسلسل چھ ماہ تک سورج بینی کی جائے تو آنکھ سے چشمہ اتر جاتا ہے۔

رحمت للعالمین

سوال: میں آپ کی تحریروں کو بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ ایک سوال میرے ذہن میں بہت دنوں سے موجود ہے۔ براہ مہربانی اس کی وضاحت فرمایئے۔ اہلِ روحانیت کی کتابوں سے معلوم ہوا ہے کہ ہماری زمین کے علاوہ بھی بے شمار دنیائیں ہیں اور ان دنیاؤں میں اَن گنت مخلوقات آباد ہیں۔ آپ کی تحریروں سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے۔ ان دنیاؤں میں بھی ہماری دنیاؤں کی طرح انسان، حیوان، نباتات اور جمادات موجود ہیں۔ وہاں کے انسانوں میں بھی ہماری طرح انسانی تقاضے موجود ہوتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آقائے نامدار ﷺ جنہیں اللہ نے تمام

عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے، آپ ﷺ کا پیغام کیسے پہنچایا گیا؟ ان بے شمار دنیاؤں کی مخلوقات رسول اللہ ﷺ کی رحمت سے کس طرح مستفیض ہوتی ہیں؟

جواب: کائنات کی تخلیق کا جب تذکرہ ہوتا ہے تو لامحالہ خالق اور مخلوق زیرِ بحث آتے ہیں۔ خالقِ کائنات اللہ تعالٰی نے مخلوق کو پیدا فرمایا اور اس کی ضروریات اور تقاضوں کی تکمیل کے لئے وسائل مہیا کئے۔ وسائل سے مراد یہ ہے کہ مخلوق ان سے بیزار نہ ہو جائے۔ وسائل ضرورت کی کفالت بھی کرتے رہیں اور آنکھوں سے اوجھل بھی ہوتے رہیں۔ اگر وسائل اوجھل نہ ہوں گے تو مخلوق ان وسائل سے بیزار ہو جائے گی۔ اس فارمولے پر غور و فکر کریں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان، حیوان، زمین، سماوات اور پوری کائنات کی زندگی غیب و شُہود دو رخوں پر قائم ہے۔ غیب سے مراد نظروں سے اوجھل اور شُہود سے مراد نظر آنا ہے۔ آسان الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ کائنات کی زندگی فنا و بقا پر قائم ہے اگر فنا نہیں ہوگی تو بقا کا تذکرہ نہیں ہوگا۔ اگر بقا نہ ہوگی تو فنا بھی زیرِ بحث نہیں آئے گی۔ فنا اور بقا ایک ایسا عمل ہے جس کو کائنات کا تغیّر یا کائنات کی حرکت کہتے ہیں۔ خالق اس ہستی کو کہا جاتا ہے جس میں تغیّر نہیں ہوتا تبدیلی نہیں ہوتی جبکہ مخلوق کا مفہوم ہی یہ ہے کہ اس کے اندر تغیّر ہوتا ہے۔ مخلوق محتاج ہوتی ہے جبکہ خالق کی ذات احتیاج، تغیّر اور تعطّل سے پاک ہے۔ خالق کی شناخت یہ ہے کہ وہ مخلوق کے بالکل برعکس ہے۔ اللہ تعالٰی نے جب فرمایا "ہو جا" (کن) تو کائنات بن گئی۔ انسان، حیوانات، نباتات، جمادات، زمین اور آسمان میں جتنی بھی مخلوقات ہیں سب وجود میں آ گئیں۔ اب اس نظام کو قائم رکھنے کے لئے مخلوق اور خالق کے درمیان ایک ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو ہستی خالق سے قریب ترین بھی ہو لیکن مخلوق ہو چنانچہ جو ہستی پیدا فرمائی اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُورِي

"اللہ نے سب سے پہلے میرا نور تخلیق کیا"۔

بحیثیت مخلوق کے کائنات کا اوّل رخ سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو بنایا تو اپنے اور مخلوق کے درمیان پردہ رکھنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے نور کو تخلیق کیا۔ کائنات کی کسی مخلوق میں اتنی سکت نہیں ہے کہ کائنات میں جاری و ساری نظام کی تجلّیات کو براہِ راست قبول کر سکے۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک پاور اسٹیشن ہے جہاں سے بجلی بن کر ہائی ٹینشن لائنوں میں مرحلہ بہ مرحلہ ہمارے روز مرّہ استعمال میں آتی ہیں۔ اگر ہائی ٹینشن سے آنے والی 20,000 واٹ بجلی سے براہِ راست بلب جلائیں تو وہ راکھ ہو جائے گا۔ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح اللہ کی تجلّیات کا نزول پہلے سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام پر ہوتا ہے۔ نور نور کو قبول کرتا ہے۔ نور سے پھر نشریات ہوتی ہیں تو روشنی میں تبدیل ہو کر مخلوقات تک پہنچتا ہے۔ عالم ازل سے جو کچھ نزول ہو رہا ہے وہ پروگرام پہلے حضور ﷺ قبول فرماتے ہیں اور پھر وہ پروگرام نشر ہو کر عالمِ ارواح میں پھیل جاتا ہے۔ پھر یہاں سے ساری مخلوقات میں پھیل جاتا ہے۔ اگر یوم ازل میں کُن کے بعد سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی وساطت سے تمام روحوں کی تخلیق نہ ہوتی تو کسی کا وجود نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہستی تخلیق کی جس کے اندر یہ تقاضے پیدا کر دیئے کہ جسے بذاتِ خود وسائل استعمال کرنا ہیں اور ان وسائل کو تقسیم بھی کرنا ہے۔ وسائل تقسیم کرنے والے بندے کے متعلق فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (سورة الأنبياء – ١٠٧)

"اور ہم نے آپ کو تمام عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے ربُّ العالمین کی صفات کا اعلان فرمایا ہے یعنی اللہ ایسا ربّ ہے یا رزق تقسیم کرنے والی ایسی ہستی ہے جو عالمین کو رزق پہنچاتی ہے۔ اس آیت مبارکہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس زمین کے علاوہ اور بھی سیّارے، ستارے اور کہکشانی نظام ہیں۔ اللہ پاک نے اپنے محبوب ﷺ کے لئے رحمۃ للعالمین کا اعلان فرمایا ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جس طرح ربّ العالمین ہے، رزق فراہم کرنے والا ہے، پروٹیکشن دینے والا ہے، اسی طرح

حضور خاتم النبیین ﷺ سارے عالمین کے لئے اسی طرح رحمت ہیں جس طرح اس زمین کے لئے رحمت ہیں۔ حضور پاک ﷺ ہر سیّارے ہر ستارے اور کہکشانی نظاموں میں اسی طرح پیغمبر اور آخری نبی ہیں جیسے زمین کے اوپر رہنے والی مخلوق انسانوں کے لئے پیغمبر ہیں۔ سائنسی نقطہ نظر سے اس کی مثال یوں ہے۔ایک ٹی وی اسٹیشن ہے اور کروڑوں ٹی وی سیٹ ہیں۔ٹی وی اسٹیشن سے نشر ہونے والا، ہر بندہ بشر، کروڑوں ٹی وی سیٹ پر نہ صرف آتا ہے بلکہ پیغام بھی پہنچارہا ہے۔مثال کتنی ہی ناقص ہو لیکن اس مثال سے بہت حد تک مسئلہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔یہ مقصد ہر گز نہیں کہ ہم (نعوذ باللہ) نبی کو ٹی وی اسٹیشن کہہ رہے ہیں اور سیّاروں کو ٹی وی سیٹ لکھ رہے ہیں۔ یہ صرف سمجھانے کے لئے ایک معمولی مثال ہے ورنہ حضور پاک ﷺ کا اعلیٰ مرتبہ ساری کائنات سے افضل ہے۔

وہاں کی زبان کو سمجھنا

سوال: اس دنیا میں مختلف جگہ الگ الگ زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔دنیا میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ہر آدمی دوسرے آدمی تک اپنا خیال پہنچانے کے لئے کسی زبان یا لینگویج کا محتاج نظر آتا ہے۔ مقامات کی تبدیلی کے علاوہ زمانے کے بدلنے سے بھی زبان بدل جاتی ہے۔ مثلاً دو سو سال پہلے کی اردو آج سے قطعی مختلف تھی۔اسی طرح شیکسپیئر کے دور کی انگریزی سمجھنے کے لئے ضخیم ڈکشنری سے مدد لینی پڑتی ہے۔سوال یہ ہے کہ ہم سب کو مر کر دوسری دنیا میں جانا ہے۔اس دنیا میں بھی مختلف زمانوں کے لوگ موجود ہیں مصری،اشوری،یونانی اور نہ جانے کون کون سی تہذیبوں اور زبانوں کے لوگ۔فرض کیجئے ایک آدمی کا انتقال ہو جاتا ہے وہ مرنے کے بعد جس دنیا میں جائے گا وہاں کی زبان کیسے سمجھے گا؟دوسری بات یہ کہ جنّت کے باسیوں کی زبان کیا ہو گی؟فرشتوں اور جنّات کی زبان کیا ہے اور ایک روحانی آدمی یہ زبان کیسے سمجھتا ہے؟

جواب: حضرت سلیمان علیہ السّلام کے عظیم الشان اور بے مثال دربار میں انسانوں کے علاوہ جن اور حیوانات بھی درباری خدمات کے لئے حاضر رہتے تھے اور اپنے مراتب اور سپرد کردہ خدمات پر بے چون وچرا عمل

کرتے تھے۔ دربارِ سلیمان علیہ السّلام پورے جاہ وحشم کے ساتھ منعقد تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام نے جائزہ لیا تو ہد ہد کو غیر حاضر پایا۔ ارشاد فرمایا:

''ہدہد کو موجود نہیں پاتا۔ کیا وہ واقعی غیر حاضر ہے؟ اگر اس کی غیر حاضری بے وجہ ہے تو میں اس کو سخت سزا دوں گا۔ یا ذبح کر ڈالوں گا۔ یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی کوئی معقول وجہ بتائے۔''(سورۃ النّمل ــ 21-20) ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہدہد حاضر ہو گیا اور حضرت سلیمان علیہ السّلام کی بازپرس پر اس نے کہا: ''میں ایک ایسی یقینی خبر لایا ہوں جس کی اطلاع آپ کو نہیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ یمن کے علاقے میں سبا کی ملکہ رہتی ہے اور خدا نے اسے سب کچھ دے رکھا ہے اور اس کا تختِ سلطنت اپنی خوبیوں کے اعتبار سے عظیم الشان ہے۔ ملکہ اور اس کی قوم آفتاب پرست ہے۔ شیطان نے انہیں گمراہ کر دیا ہے اور وہ خدائے لاشریک کی پرستش نہیں کرتے۔''(سورۃ النّمل ــ 22، 23، 24) حضرت سلیمان علیہ السّلام نے کہا۔ ''تیرے جھوٹ اور سچ کا اِمتحان ابھی ہو جائے گا۔ تو اگر سچا ہے تو میرا یہ خط لے جا اور اس کو ان تک پہنچا دے اور انتظار کر کہ وہ اس کے متعلق کیا گفتگو کرتے ہیں۔''(سورۃ النّمل ــ 28 ــ 27) ہدہد یہ خط لے کر پہنچا تو ملکہ سبا سورج دیوتا کی پرستش کے لئے جا رہی تھی۔ ہدہد نے راستہ ہی میں خط ملکہ کے سامنے ڈال دیا۔ قرآن مجید میں ہی حضرت سلیمان علیہ السّلام کا چیونٹی سے ہم کلام ہونا بھی موجود ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ چیونٹی اور ہدہد کی زبان کیا ہو گی؟ کیا یہ زبانیں الگ الگ ہوں گی؟

انسانوں کے درمیان ابتداءِ آفرینش سے بات کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ آواز کی لہریں جن کے معنی متعیّن کر لئے جاتے ہیں، سننے والوں کو مطلع کرتی ہیں۔ یہ طریقہ اس ہی تبادلۂ خیال کی نقل ہے جو اَنا کی لہروں کے درمیان ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ گونگا آدمی اپنے ہونٹوں کی خفیف سی جنبش سے سب کچھ کہہ دیتا ہے اور سمجھنے کے اہل سب کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی پہلے طریقے کا عکس ہے۔ جانور آواز کے بغیر ایک دوسرے کو اپنے حال سے مطلع کر دیتے ہیں۔ یہاں بھی انا کی لہریں خیالات کی منتقلی کا کام کرتی ہیں۔ درخت میں بھی ہوتی ہے جو ہزاروں میل کے فاصلے

پر واقع ہیں۔ یہی قانون جمادات میں بھی رائج ہے۔ کنکروں، پتھروں، مٹّی کے ذروں میں مَن و عَن اسی طرح تبادلۂ خیال ہوتا ہے۔

سائنس کا عقیدہ یہ ہے کہ زمین پر موجود ہر شئے کی بنیاد یا قیام لہر یا روشنی کے اوپر ہے۔ جب ہر شئے شعاعوں یا لہروں کا مجموعہ ہے تو ہم شعاعوں یا لہروں کو دیکھے یا سمجھے بغیر یہ کیسے جان لیتے ہیں کہ یہ درخت ہے، پتھر ہے یا یہ چیز پانی ہے؟ ہم جب کوئی پھول دیکھتے ہیں تو ہمارے دماغ پر پھول کے متعلق خوبصورتی، خوشبو، فرحت و انبساط کا تاثر قائم ہوتا ہے حالانکہ ہم نے ابھی پھول کو نہ چھوا ہے، نہ سونگھا ہے۔ اسی طرح ایک ایسے آدمی کا چہرہ ہمارے سامنے آتا ہے جو طبعاً تخریب پسند ہے یا ہم سے مخاصمت رکھتے ہیں، تو اس آدمی کے خیالات سے ہم متاثر ہوتے ہیں اور ہماری طبیعت کے اوپر اس کا ردِّ عمل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کوئی آدمی ہم سے دلی تعلق رکھتا ہے تو اسے دیکھ کر ہماری طبیعت میں اس کے لئے محبت اور انسان شناسی کے جذبات ابھرتے ہیں حالانکہ ان دونوں آدمیوں میں سے کسی نے بھی ہمارے ساتھ نہ کوئی بات کی ہے اور نہ ہمیں کوئی نقصان یا نفع پہنچایا ہے۔ دنیا میں ہزاروں زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن جب پانی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہر آدمی اسے پانی سمجھتا ہے اسی طرح دوسری زبانیں بولنے والے جل، آب، ماء، واٹر، Water وغیرہ کہتے ہیں.... لیکن پانی پانی ہے۔ جب کوئی اردو دان کسی انگریز کے سامنے لفظ درخت کہتا ہے تو اس کے ذہن میں درخت ہی آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انگریز اس کو Tree کہتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطہ پر جب ہم آگ کا تذکرہ کریں گے تو اس خطّے پر بولی جانے والی مادری زبان کچھ بھی ہو لوگ اسے آگ ہی سمجھیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ کوئی چیز اپنی ماہیئت خواص اور اپنے افعال سے پہچانی جاتی ہے۔ نام کچھ بھی رکھا جائے ہر چیز کا قیام لہر پر ہے۔ ایسی لہر جس کو روشنی کے علاوہ کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ روحانیت کا اصل اصول بھی یہی ہے جس طرح پانی لہروں اور روشنیوں کا مجموعہ ہے اسی طرح خیالات بھی لہروں اور روشنیوں کا مجموعہ ہیں۔ اسی طرح خیالات بھی لہروں کے اوپر رواں دواں ہیں۔ ہم سب کسی چیز کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں تو ہمارے خیالات کے اندر کام کرنے والی لہریں اس چیز میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا

ہے کہ ہم جب کسی آدمی کی طرف متوجّہ ہو کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم پیاسے ہیں تو دوسرا آدمی اس بات کو سمجھ جاتا ہے حالانکہ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں پانی پلاؤ۔

خیالات کو سمجھنے اور خیالات میں معانی پہنانے کے لئے الفاظ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کائناتی لاشعور کا مطالعہ کیا جائے تو یہ عقدہ کھلتا ہے کہ الفاظ کا سہارا لینا ضروری نہیں ہے۔ درختوں، چوپایوں، پرندوں، درندوں اور حشرات الارض کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ یہ سب باتیں کرتے ہیں اور سب اپنے خیالات کو آپس میں ردّ و بدل کرتے ہیں لیکن الفاظ کا سہارا نہیں لیتے۔ موجودہ زمانے نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اب یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ درخت بھی آپس میں باتیں کرتے ہیں، درخت موسیقی سے بھی متاثر ہوتے ہیں، اچھے لوگوں کے سائے سے درخت خوش ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کی قربت سے جن کے دماغ پیچیدہ اور تخریب پسند ہیں درخت ناخوش ہوتے ہیں۔ یہ بات میں اپنے مشاہدے کی بناء پر لکھ رہا ہوں۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ تمام مخلوق کی سوچنے کی طرزیں ایک نقطہ مشترک رکھتی ہیں۔ مخلوق میں انسان، حیوانات، نباتات، جمادات، جنّات، فرشتے، لاشمار کہکشانی نظام اور ان نظام ہائے میں بسنے والے انسان، جنّات اور فرشتے بھی شامل ہیں۔ کائنات کا یہ نقطۂ مشترک ہمیں دوسری مخلوقات کی موجودگی کا علم دیتا ہے۔ انسان کا لاشعور کائنات کے دُور دراز گوشوں سے مسلسل ایک ربط رکھتا ہے۔ زبان دراصل خیالات ہیں اور خیالات ہی اپنے معنی اور مفہوم کے ساتھ نَوعِ انسانی اور دوسری تمام نَوعوں میں ردّ و بدل ہوتے رہتے ہیں۔ الفاظ کا سہارا دراصل شعوری کمزوری کی علامت ہے اس لئے کہ شعور الفاظ کا سہارا لئے بغیر کسی چیز کو سمجھ نہیں پاتا۔ جب کوئی بندہ روحانیت کے اصول وضوابط کے تحت خیالات کی منتقلی کے علم سے وُقوف کر لیتا ہے تو اس کے لئے دونوں باتیں برابر ہو جاتی ہیں چاہے کوئی خیال الفاظ کا سہارا لے کر منتقل کیا جائے یا کسی خیال کو لہروں کے ذریعے منتقل کر دیا جائے ہر آدمی کے اندر ایسا کمپیوٹر نصب ہے جو خیالات کو معنی اور مفہوم پہنا کر الگ الگ کر دیتا ہے۔

مراقبہ کا حکم

سوال: آپ روحانی طالب علموں کو معرفت و طریقت میں کامیابی اور غیب کے مشاہدے کے لئے مراقبہ کی تلقین کرتے ہیں اور اس کے بہت سے فوائد بتاتے ہیں اور یہ کہ مراقبہ حضرت محمد ﷺ کی غار حرا میں پہلی سنت ہے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو مراقبہ کا حکم نہیں دیا بلکہ نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ حالانکہ مراقبہ نماز سے کہیں آسان ہے اور اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے مراقبہ کا حکم نہیں دیا ہے؟

جواب: مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جس میں انسان عالمِ ظاہر کی طرح اپنے اندر موجود متحرّک اور مسلسل عمل کرنے والی مخفی دنیا سے روشناس ہوتا ہے۔ جس طرح ہم خواب کی حالت میں جسم کے تقاضوں سے آزاد ہو کر اس دنیا میں سفر کرتے ہیں، جس دنیا کو بیداری کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اس طرح مراقبے میں ہم اس دنیا کو دیکھتے ہیں جس دنیا کو ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی ہے۔ ہم جب بیدار ہوتے ہیں تو مرحلہ وار یہ دنیا ہمارے لئے ایک تجرباتی دنیا بن جاتی ہے۔ یہ تجربہ ہی دراصل ہماری زندگی ہے۔ اِسی طرح جب پیراسائیکالوجی کے طالب علم کی نظر اپنے باطن میں کھلتی ہے تو عالمِ غیب میں بسنے والی دنیاؤں کے تجربات شروع ہو جاتے ہیں۔ جیسے جیسے غیب کی دنیا میں اِنہماک ہوتا ہے۔ غیب میں بسنے والے افراد سے تعارف ہوتا رہتا ہے اور غیب کی دنیا کے شب و روز سے پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ غیب کی دنیا ہو یا مظاہراتی دنیا، دونوں تجربات کے مدار پر گھوم رہی ہیں۔ جس طرح پیدائش کے بعد رفتہ رفتہ شعور حاصل ہوتا ہے اسی طرح غیب کی دنیا میں بھی ترقی پذیر شعور کارفرما ہے۔ غیب کی دنیا کا ترقی پذیر شعور مظاہراتی دنیا کا تصوّر ہے۔ مظاہراتی دنیا میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد: 1. پہلے ماں کی خوشبو کا احساس کرتا ہے۔ 2. پھر وہ ماں کو پہچانتا ہے۔ 3. اس کے ماحول میں قریب رہنے والے افراد باپ، بھائی، بہنوں، دادی، نانی اور دادا، نانا کو پہچانتا ہے۔ 4. اس کے بعد قریبی رشتہ داروں سے مانوس ہوتا ہے 5. پھر شعور میں اتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیاوی علوم حاصل کر کے اپنا ایک مقام بنالیتا ہے اور دنیا میں اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔

اسی طرح پیراسائیکالوجی کا طالب علم جب اپنے اندر میں موجود غیب کی دنیا سے روشناس ہو جاتا ہے تو اس کی نگاہ میں اتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زمان کے دونوں کناروں کو احاطہ کرلیتا ہے۔ زمان کے غیب کی دنیا میں جو کچھ ہے اسے چھولیتا ہے۔ زمین سے باہر افراد کائنات سے ملاقات کرنا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، ستاروں میں گھومنا اور افلاک کی سیر کرنا اس کے لئے شعوری زندگی بن جاتا ہے۔

نظریۂ رنگ و نور کی روشنی میں جو غیب مشاہدہ بن جاتا ہے وہ غیب نہیں رہتا۔ افلاک کے بے شمار نظاموں میں فرشتوں کی مخلوق اور اس مخلوق کی کارکردگی سے واقف ہو کر فرشتوں سے ہمکلام ہونا آسان کام بن جاتا ہے۔ وہ یہ دیکھ لیتا ہے کہ کائنات کی ساخت میں کس قسم کی روشنیاں برسرِ عمل ہیں؟ ان روشنیوں کا سورس کیا ہے؟ یہ روشنیاں کس طرح بن رہی ہیں؟ یہ روشنیاں افراد کائنات میں کس طرح تقسیم ہو رہی ہیں؟ اور روشنیوں کی مقداروں کے ردِّ عمل سے کائنات کے نقوش کس طرح بن رہے ہیں؟ تجلی نزول کر کے نور کیسے بنی؟ اور نور نزول کر کے روشنی کس طرح بنا؟ نور اور روشنی کن قاعدوں اور کن ضابطوں پر قائم ہے؟

کائنات کا ایک ممتاز فرد انسان جب نزولی دائرے سے نکل کر لاشعوری دائرے میں قدم رکھتا ہے تو اس کے اوپر انکشاف ہوتا ہے کہ شعوری حواس ذات سے دُور کرتے ہیں اور لاشعوری حواس ذات سے قریب کرتے ہیں۔ ذات سے قربت صعود ہے اور ذات سے دُوری نزول ہے۔ ذات سے قریب ہونے اور وجدان حاصل کرنے کے لئے موثر اور یقینی عمل مراقبہ ہے۔ آخری کتاب قرآن شریف نزولی اور صعودی کیفیات کو متحرّک کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ قرآن کے اس پروگرام کی بنیاد نماز اور زکوٰۃ ہے۔ نماز اور زکوٰۃ دونوں روح اور جسم کا وظیفہ ہیں۔ نماز یا صلوٰۃ روح کا وظیفہ ہے اور زکوٰۃ جسم کا وظیفہ ہے۔ ہم جب نماز کے ارکان اور نماز کے اندر حرکات و سکنات کو بغور دیکھتے اور سمجھتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ نماز مجموعی طور پر ایک ایسا عمل ہے جس عمل میں تمام انسانی حرکات و سکنات موجود ہیں۔ مثلاً کھڑے ہو کر ہاتھ باندھنا، سیدھا کھڑے ہونا، ہاتھ اوپر اٹھانا، بولنا، پڑھنا، سننا، دیکھنا، ہاتھ باندھنا، جھکنا، جھک

کر دوبارہ کھڑے ہونا، کھڑے ہونے کے بعد لیٹنا، لیٹنے کے بعد بیٹھنا، بیٹھنے کے بعد پھر لیٹنا (یعنی سجدہ کرنا) پھر کھڑے ہونا اِدھر اُدھر دیکھنا وغیرہ وغیرہ۔ نماز کے پروگرام سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نماز زندگی کے ہر عمل اور زندگی کی ہر حرکت کا احاطہ کرتی ہے۔ نماز میں ساری جسمانی حرکات و سکنات کا تعلق اس حقیقت پر قائم ہے کہ بندہ ساری حرکات خالقِ کائنات اللہ کے لئے کر رہا ہے یعنی نماز ایک ایسا پروگرام ہے جس پر عمل کر کے انسان زندگی کی ہر حرکت میں خالقِ کائنات کے ساتھ اپنی وابستگی قائم کر لیتا ہے۔ پروگرام کی کامیابی کے نتیجے میں وہ دیکھ لیتا ہے کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے۔ بندے کے مشاہدے میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔ نایز کا یہ تربیتی پروگرام دس بارہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے۔ اور اٹھارہ بیس سال تک اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اگر اٹھارہ بیس سال تک اس پروگرام کی تکمیل نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نماز کی تکمیل نہیں ہوئی۔ نماز کے اثرات مرتّب ہونے چاہئے تھے لیکن اس لئے مرتّب نہیں ہوئے کہ نماز کا پروگرام نتیجے کو سامنے رکھے بغیر کیا جا رہا ہے۔ کوئی پروگرام نتیجہ سے خالی ہو تو اس کی اہمیت نہیں ہوتی۔ بندہ پندرہ بیس سال تک جب وظیفہ اعضاء کی حرکت کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر اس بات کی مشق کرتا ہے کہ اس کے ہر عمل اور ہر حرکت میں خالقِ کائنات کے ساتھ وابستگی قائم ہو جائے تو وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں خالق کی طرف متوجّہ رہنے اور ساتھ ساتھ دنیا کے سارے کام انجام دینے کا عادی ہو جاتا ہے۔

دوسرا پروگرام زکوٰۃ کا ہے۔ زکوٰۃ ایک ایسا عمل ہے جس کا منشاء مخلصانہ اور بے لوث خدمت خلق ہے۔ زکوٰۃ زندگی کا ایک ایسا پروگرام ہے جو اللہ کا اپنا شعار ہے۔ جب بندہ مخلصانہ قدروں میں اللہ کی مخلوق کی خدمت کرتا ہے تو دراصل اس نے وہ کام شروع کر دیا ہے جو خالقِ کائنات خود کرتا ہے۔ خالق کا ذاتی وصف یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی خدمت کرتا ہے۔ اللہ کے ساتھ وابستگی حاصل کرنے کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی امّت کو نماز (صلوٰۃ) کا پروگرام عطا کیا ہے۔ علمِ لدُنّی میں صلوٰۃ کا ایک ترجمہ ''مراقبہ'' بھی ہے۔ صلوٰۃ کے ذریعے انسان اپنے اندر مخفی علوم کو تلاش کر لیتا ہے۔ ذہنی یکسوئی اور یقین کے پیٹرن کے ساتھ صلوٰۃ (مراقبہ) قائم کرنے سے بندہ اس کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے جس کیفیت کو پیغمبرِ اسلام ﷺ نے مؤمن کی معراج کہا ہے اور جب کوئی فرد صلوٰۃ کے پروگرام کے بعد

زکوٰۃ کا پروگرام پورا کرلیتا ہے تو وہ اللہ کی عادت (مخلوق کی خدمت) کا ایک یونٹ بن جاتا ہے اس کے اوپر عرفان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

انسانی کوشش کا عمل دخل

سوال: ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ یہ بات بھی ہمارے یقین میں شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ پہلے سے لکھ دیا ہے جبکہ کسی مصیبت سے بچنے، کامیابی کے لئے تگ ودو کرنے یا رزق کے لئے دوڑ دھوپ کرنا بھی انسان پر لازم ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک چیز جو پہلے سے لکھ دی گئی ہے اس میں انسانی کوشش کا عمل دخل کتنا ہے؟

جواب: بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر چیز کو لکھ کر محفوظ کر دیا ہے۔ لیکن کوشش کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ کے فرمان کا حصّہ ہے۔ کوئی بندہ جتنی سعی و کوشش کرتا ہے اس کا اسے اَجر یا نتیجہ ملتا ہے۔

کائنات کی تمام حرکات و سکنات ایک فلم کی صورت میں ریکارڈ ہیں۔ جس جس طرح اس فلم میں کائناتی مظاہر کے نقوش موجود ہیں اسی طرح بے شمار کہکشانی نظاموں میں نشر ہو رہے ہیں۔ بات جدّ وجہد، کوشش اور اختیار کی ہے۔ اگر جدّ وجہد اور کوشش نہیں کی جاتی تو زندگی میں خلاء واقع ہو جاتا ہے۔ یہ عمل انفرادی اور قومی صورتوں میں ازل تا ابد جاری ہے۔ اللہ کا قانون ہے کہ جب کوئی بندہ جدّ وجہد اور کوشش کرتا ہے اور اس جدّ وجہد اور کوشش کا ثمر کسی نہ کسی طرح اللہ کی مخلوق کے کام آتا ہے تو وسائل میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

زمین پر اللہ نے جتنی بھی اشیاء تخلیق کی ہیں ان کے اندر بے شمار راستے کھل جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ نے لوہا تخلیق کیا۔ مِن حَیثُ القوم یا انفرادی طور پر جب لوہے کی صفات اور لوہے کے اندر کام کرنے والی صلاحیتوں کا سراغ لگایا جاتا ہے تو لوہا ایک ایسی چیز بن کر سامنے آتا ہے جس میں لوگوں کے لئے بے شمار فائدے ہیں۔ آج کی سائنس

اس کا کھلا ثبوت ہے۔ سائنسی ترقی میں مشکل سے کوئی ایسی چیز ملے گی جس میں کسی نہ کسی طرح لوہے کا دخل نہ ہو۔ صورتِ حال کچھ یوں بنی کہ لوحِ محفوظ میں انفرادی زندگی بھی نقش ہے اور قومی زندگی بھی نقش ہے۔ انفرادی حدود میں کوئی بندہ جب کوشش اور جدّوجہد کرتا ہے تو اس کے اوپر انفرادی فوائد ظاہر ہوتے ہیں۔ قومی اعتبار سے ایک دو چار دس بندے جب کوشش کرتے ہیں تو اس جدّوجہد اور کوشش سے پوری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اللہ کہتا ہے۔

''میں قوموں کی تقدیر نہیں بدلتا، جو قومیں اپنی حالت بدلنا نہیں چاہتیں''۔ (سورۃ الرّعد–11)

لوحِ محفوظ پر یہ بات بھی نقش ہے کہ جو قومیں خود اپنی حالت بدلنے کے لئے کوشش کرتی ہیں ان کو ایسے وسائل مل جاتے ہیں جن سے وہ معزز اور محترم بن جاتی ہیں اور جو قومیں اپنی تبدیلی نہیں چاہتیں وہ محروم اور ذلیل زندگی گزارتی ہیں۔

لوحِ محفوظ پر لکھے ہوئے نقوش یہ ہیں بندہ اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات کو اگر صحیح سمتوں میں استعمال کرتا ہے تو اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اگر غلط طرزوں میں استعمال کرتا ہے تو منفی نتائج مرتّب ہوتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ بندہ اللہ کے عطا کردہ اختیارات کو اس طرح استعمال کرے کہ جس سے اس کی اپنی فلاح اور اللہ کی مخلوق کی فلاح کا سامان میسر ہو۔ انفرادی فلاح اللہ کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ اللہ خالق ہے ربّ ہے اور ربوبیّت کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ کے انعامات اور اکرامات اور اللہ کے پیدا کئے ہوئے وسائل سے ساری مخلوق فائدہ اٹھائے۔ مختصر اس بات کو اس طرح سمجھا جائے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب لوحِ محفوظ میں ریکارڈ ہے۔ اس فلم میں لوگوں کا عروج و زوال بھی لکھا ہوا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ قومیں اگر ان صحیح طرزوں میں عملی زندگی بسر کریں گی تو ان کو عروج نصیب ہوگا اور اگر غلط طرزوں میں عملی زندگی بسر کریں گی تو غلام بنادی جائیں گی۔

اسفل زندگی سے نکلنا

سوال: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کو بہترین صناعی سے بنایا گیا اور یہ اسفل میں گر گیا۔ رہنمائی فرمائیں کہ اسفل میں گرا ہوا انسان زندگی کس طرح گزارے کہ وہ جنّت کا دائمی سکون حاصل کرے اور اسفل زندگی سے نکل کر اعلیٰ مقام پر فائز ہو جائے۔

جواب: آسمانی کتابوں کے مطابق سکون حاصل کرنے کا موثر طریقہ یہ ہے کہ انسان غصہ نہ کرے قانون فطرت میں کہیں جھول نہیں ہے۔ ہر چیز وقت کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ وقت جس طرح سے چابی بھر دیتا ہے شئے حرکت کرنے لگتی ہے۔ وقت اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے۔ تو کھلونے میں چابی ختم ہو جاتی ہے۔ کل پُرزے سب ہوتے ہیں لیکن قوت Energy باقی نہیں رہتی۔ وقت، قوّت کا مظاہرہ ہے۔ قوّت ایک توانائی ہے، ایک مرکز ہے اور اسی مرکز کو آسمانی کتابیں قدرت کے نام سے متعارف کرواتی ہیں۔ قدرت ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے جس نقطہ کے ساتھ پوری کائنات کے افراد بندھے ہوئے ہیں۔ وجود اور عدم دونوں اس میں گم ہیں۔ انسان جب کائنات کے مرکزی نقطہ سے اپنا رشتہ تلاش کر لیتا ہے اور خالقِ کائنات کو جان لیتا ہے تو دنیا سے اس کی ساری توقعات ختم ہو جاتی ہیں اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو مسرتیں اس کے گرد طواف کرتی ہیں اور موت کی آنکھ اسے مامتا سے دیکھتی ہے۔ ملک الموت اس کے قریب آنے سے پہلے دستک دیتا ہے اور اجازت کا طلب گار ہوتا ہے۔

حضرت بہاءالدین زکریا ملتانیؒ کے حالات میں مذکور ہے کہ حالت نزع سے پہلے ایک بزرگ نے دروازہ پر دستک دی۔ بڑے صاحب زادے باہر گئے۔ تو ایک بزرگ نے ایک لفافہ انہیں دیا اور کہا کہ اپنے والد صاحب کو دے دیں۔ حضرت بہاءالدین زکریاؒ نے خط پڑھا اور تکیہ کے نیچے رکھ دیا اور صاحب زادے سے کہا کہ باہر جا کر کہو کہ آدھے گھنٹے کے بعد آئیں۔ اس کے بعد انہوں نے لوگوں کی امانتیں واپس کیں، وضو کر کے نوافل ادا کیے، دعا کر کے بستر پر لیٹ گئے اور ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ تدفین کے بعد صاحب زادے کو خیال آیا کہ وہ بزرگ کون

تھے، جنہیں ابا جان نے آدھے گھنٹے کے بعد بلایا تو تکیہ کے نیچے سے لفافہ اٹھا کر دیکھا تو اس کے اندر پرچی پر یہ تحریر لکھی ہوئی تھی:

''بڑی سرکار سے آپ کا بلاوا آیا ہے۔ میں حاضر ہوں میرے لئے کیا حکم ہے؟

عزرائیل ملک الموت۔''

کہا جاتا ہے کہ ٹھیک آدھ گھنٹے کے بعد زکریا ملتانیؒ عالمِ اسفل سے عالمِ اعلیٰ میں تشریف لے گئے۔ کوئی انسان مندرجہ ذیل باتوں پر صدق دل سے عمل کرلے تو موت سے آشنا ہو کر جنّت کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔

1. بات ہمیشہ سچی کرے

2. وعدہ خلافی نہ کرے

3. امانت میں خیانت نہ کرے

4. آنکھوں کو نظر بازی سے دُور رکھے

5. کسی پر ظلم نہ کرے

6. مخلوق کی خدمت کرے

7. اسلام میں پورا پورا داخل ہو جائے

اسمِ اعظم کیا ہے؟

سوال: اسمِ اعظم کیا ہے اور اس کے جاننے اور پڑھنے سے انسان کے اندر کیا کیا روحانی صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں؟ یہ اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ اکثر حضرات کو دیکھا کہ اسمِ اعظم جاننے اور اسے پڑھنے کے لئے تلاش میں رہتے ہیں۔ مجھے بھی یہ شوق پیدا ہوا کہ اسمِ اعظم کو سمجھوں اور اسے اپناؤں۔ آپ میرے لئے مناسب اسمِ اعظم تجویز فرما کر اس کے وِرد کی اجازت مرحمت فرمادیں۔ کیا آپ کے عطا کردہ اسمِ اعظم کی اجازت صرف میرے لئے ہو گی یا دیگر خواتین و حضرات بھی اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں؟ یہ وضاحت ضرور فرمادیں۔

جواب: لوحِ محفوظ کا قانون ہمیں بتاتا ہے کہ ازل سے ابد تک صرف لفظ کی کارفرمائی ہے۔ حال، مستقبل اور ازل سے ابد تک درمیانی فاصلہ ''لفظ'' کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہے سب کا سب اللہ کا فرمایا ہوا ''لفظ'' ہے اور یہ لفظ اللہ تعالیٰ کا ''اسم'' ہے۔ اسی اسم کی مختلف طرزوں سے نئی تخلیقات وجود میں آتی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ لفظ یا اسم ہی سے پوری کائنات کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ سردار اسم بھی اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے اور اسی کو ''اسمِ اعظم'' کہتے ہیں۔ اسماء کی حیثیت روشنیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ایک طرز کی جتنی روشنیاں ہیں ان کو کنٹرول کرنے والا اسم بھی ان ہی روشنیوں کا مرکب ہوتا ہے اور یہ اسماء کائنات میں موجود اشیاء کی تخلیق کے اجزاء ہوتے ہیں۔ مثلاً انسان کے اندر کام کرنے والے تمام تقاضے اور پورے حواس کو قائم کرنے یا رکھنے والا اسم ان سب کا سردار ہوتا ہے۔ اور یہی ''اسمِ اعظم'' کہلاتا ہے۔

نوعِ جنّات کے لئے الگ اسمِ اعظم ہے۔ اسی طرح نَوعِ انسان، نَوعِ ملائکہ، نَوعِ جمادات و نباتات کے لئے بھی الگ الگ اسمِ اعظم ہیں۔ کسی نَوع سے متعلق اسمِ اعظم کو جاننے والا صاحبِ علم اس نَوع کی کامل طرزوں، تقاضوں اور کیفیات کا علم رکھتا ہے۔ اسمِ ذات کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا ہر اسم اللہ تعالیٰ کی ہر صفَت کو کامل طرزوں کے ساتھ اپنے اندر رکھتا ہے اور تخلیق میں کام کرنے والا سب کا سب قانون اللہ کا نور ہے۔ اَللّٰهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (سورۃ النّور —

35)ترجمہ: اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا یعنی اللہ کا نور لہروں کی شکل میں نباتات، جمادات، حیوانات، انسان، جنّات اور فرشتوں میں زندگی اور زندگی کی پوری تحریکات پیدا کرتا ہے۔ پوری کائنات میں قدرت کا یہ فیضان ہے کہ ہر کائنات میں ہر فرد نور کی ان لہروں کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔انسان کے اندر دو حواس کام کرتے ہیں۔ایک دن کے اور دوسرے رات کے۔ان دونوں حواسوں کی کیفیات کو جمع کرنے پر ان کی تعداد تقریباً گیارہ ہزار ہوتی ہے۔اور ان گیارہ ہزار کیفیات پر ایک اسم ہمیشہ غالب رہتا ہے یا یوں کہہ لیں کہ زندگی میں اللہ تعالیٰ کے جو اسماء کام کرتے ہیں ان کی تعداد گیارہ ہزار ہے اور ان گیارہ ہزار میں سے ساڑھے پانچ ہزار دن اور ساڑھے پانچ ہزار رات میں کام کر رہے ہیں۔انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے اس کے اندر کام کرنے والا ہر اسم دوسری نَوع کے لئے اسمِ اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔یہی وہ اسماء ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے آدم کو سکھایا ہے۔ تکوین یا اللہ تعالیٰ کے ایڈمنسٹریشن کو چلانے والے حضرات یا صاحبِ خدمت اپنے اپنے عہدوں کے مطابق ان اسماء کا علم رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا اسم "یَا حَیُّ یَا قَیُّوم" اسمِ اعظم ہے۔آپ اس اسم کا وِرد کثرت کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، وقت بے وقت، وضو بغیر وضو کر سکتے ہیں۔آپ کو اور آپ کی طرح کے تمام قارئین حضرات و خواتین کو جو واقعی ذہنی سکون کے متلاشی ہیں اور اللہ کی رضا و تسلیم چاہتے ہیں، ان سب کو اجازت عام ہے۔اسمِ اعظم وِرد کرنے کے ضمن میں یہ بات ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ ان گنت مرتبہ بغیر لالچ اور صلہ و ستائش کے وِرد کرنا چاہئے۔اس طرزِ فکر کے ساتھ اسمِ اعظم وِرد کرنے سے اللہ تعالیٰ کا عرفان نصیب ہوتا ہے اور دنیاوی تمام کام بھی غائبانہ طور سے سر انجام پاتے ہیں۔

ہر شئے دو رخوں پر ہے

سوال: زندگی کے دو رخ سے کیا مراد ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کو دو رخوں پر کیوں تخلیق کیا ہے؟

جواب: سماعت، بصارت، احساس، قوّتِ گویائی کے حواس، اَلَستُ بِرَبِّکُم.... کہنے سے پہلے کائنات کو حاصل نہیں تھے۔ کائنات اور کائنات کے اندر اربوں، کھربوں زمینوں کی حرکات و سکنات پر تفکر کیا جائے تو یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے کہ ہر حرکت اور عمل اور ہر احساس کہیں سے آرہا ہے اور کہیں جا کر گم ہو رہا ہے۔ کائنات نزول و صعود میں مسلسل حرکت کر رہی ہے اور ہر نزولی و صعودی حرکت ایک مخفی رشتے کے ساتھ بندھی ہوئی ہے اور یہی مخفی رشتہ کسی ایک نَوع یا نَوع میں سے کسی ایک فرد کا احساس یا شعور بن رہا ہے۔

فرد کی ایک حرکت جسمانی خدوخال کے ساتھ واقع ہوتی ہے لیکن جسمانی خدوخال کے ساتھ واقع ہونے والی حرکت کو ہم منفرد یا اختیاری حرکت نہیں کہہ سکتے۔ یہ حرکت بہر حال کسی نہ کسی حرکت کے تابع ہے۔ جسمانی حرکات جن کو خارجی زندگی کہا جاتا ہے کے برعکس جس مخفی احساس کے اوپر جسمانی وجود حرکت کرتا ہے وہ داخلی زندگی یا فرد کا لاشعور ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ساری کائنات کا ایک ہستی کے ساتھ منسلک ہونا کائنات کا اجتماعی شعور ہے۔ آخری کتاب قرآن میں ہے کہ ''ہم نے سب چیزوں کو دو قسموں میں پیدا کیا ہے''۔ (سورۃ الذّاریات—49) دو قسمیں یا دو رُخ مل کر ایک وجود ہوتے ہیں اس کی مثال پانی کی ضرورت یا تشنگی ہے، پیاس شئے کا ایک رخ ہے اور پانی دوسرا رخ ہے۔ پیاس روح کی شکل و صورت اور پانی جسم کی شکل و صورت ہے۔ جب ہم پیاس کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں دو رخ آتے ہیں۔ ایک رخ روح اور دوسرا رخ ہم خود۔ یہ دونوں رخ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ قانون یہ بنا کہ اگر دنیا سے پیاس کا احساس فنا ہو جائے تو پانی بھی فنا ہو جائے گا۔ پانی اس لئے موجود ہے کہ پانی کی روح موجود ہے، روح کی موجودگی سے جسم کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جسم کی موجودگی سے روح کا موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

روز مرّہ کا مشاہدہ ہے کہ آدمی مر جاتا ہے۔ جسمانی حیثیت برقرار رہتی ہے لیکن حرکت نہیں رہتی اور اگر اس جسم کو جس کے ساتھ روح متّصِل نہیں ہے کچھ عرصہ پڑا رہنے دیا جائے تو جسم ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے اور

بالآخر مٹی کے ذرّات میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن اس کے برعکس جسمانی خدوخال کے ساتھ جب روح موجود ہے، جسم نہ گھلتا ہے، نہ سڑتا ہے۔ روح والا رُخ تمثّل ہے اور مادّی رخ جسم ہے۔ کائنات اور کائنات کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے کے لئے یا زندگی سے متعارف ہونے کے لئے ہم جب تفکر کرتے ہیں تو خود کو ٹائم اور اسپیس میں مقید محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ زندگی کا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جس کو ہم زمان و مکان سے باہر دیکھ سکیں۔ جب بھی کائنات یا کائنات کے خدوخال کا تذکرہ آئے گا انسانی علم مجبور ہے کہ وہ ٹائم اسپیس میں قید ہو کر بات کرے۔ زندگی کا تعارف خدوخال اور نقش و نگار کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ زندگی کا ایک حصّہ خدوخال اور نقش و نگار پر مشتمل ہے اور دوسرا حصّہ رفتار کے اوپر قائم ہے۔

اگر دنیا میں کہیں وبائی امراض پھوٹ پڑیں تو اللہ کے قانون کے مطابق یہ امر یقینی ہے کہ اس کی دوا پہلے سے موجود ہو گی۔ جب ہم گرمی محسوس کرتے ہیں تو اس وقت احساس کے اندرونی رخ پر سردی کا احساس ہوتا ہے، جب تک اندرونی طور پر سردی کا احساس باقی رہتا ہے۔ خارجی طور پر گرمی محسوس ہوتی ہے۔ اس بات کو زیادہ وضاحت سے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر گرمی سردی دونوں رخوں میں سے کوئی ایک رخ فنا ہو جائے تو ہم نہ گرمی کا تذکرہ کر سکتے ہیں، نہ سردی کا تذکرہ کر سکیں گے۔ اصل میں دو رخ مل کر ہی ایک احساس بنتے ہیں۔ جب تک دونوں رخ موجود نہ ہوں حرکت زیر بحث نہیں آتی۔ ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو مخصوص خدوخال اور نقش و نگار کے ساتھ ساٹھ ستر سال زندہ رہتا ہے، نقش و نگار اور خدوخال میں جیسے جیسے تبدیلی واقع ہوتی ہے جیسے جیسے قد و قامت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے وہ نظر آتا ہے لیکن پیدائش سے ساٹھ ستر سال کا وقفہ ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتا۔

زندگی جس وقت (ٹائم) پر رواں دواں ہے۔ جس کو شعور دن اور ماہ و سال میں ریکارڈ کرتا ہے اس کو ہماری ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ زندگی کا ایک رخ آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور دوسرا رخ آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے۔ وہ رخ جو آنکھوں کے سامنے ہے اور جس میں ہم نقش و نگار اور خدوخال کا بڑھنا گھٹنا دیکھتے ہیں سب کا سب مکان،

اسپیس ہے اور جس خلاء میں یہ خدوخال گھٹ رہے ہیں اور بڑھ رہے ہیں اور جو آنکھوں سے اوجھل ہے وہ زمان (ٹائم) ہے۔ یعنی انسان جہاں سے آیا ہے، انسان کا بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا جہاں گیا وہ ٹائم ہے اور انسان نے جس طرح بچپن، جوانی اور بڑھاپے کو خدوخال کے ساتھ محسوس کیا وہ مکان (اسپیس) ہے۔

جب ہم زمان یا ٹائم کا تذکرہ کرتے ہیں تو روحانی نقطۂ نظر سے ساری کائنات زمانیت میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم رشتہ ہے اور جب مکانیت کا تذکرہ کرتے ہیں تو کائنات نَوعی اعتبار سے اور انفرادی اعتبار سے الگ الگ ہے۔ ہم بھیڑ، بکری، بندر، چوہا، کتا اور انسان کی زندگی کا تذکرہ کرتے ہیں تو زندگی اور انرجی سب میں مشترک ہے۔ لیکن جب ہم نَوعی اعتبار سے کائنات کا تذکرہ کرتے ہیں یا اسپیس کی حدود کا تذکرہ کرتے ہیں تو چوہا، بندر اور ہاتھی الگ خدوخال میں نظر آتے ہیں۔ تخلیقی فارمولا یہ بنا کہ زندگی دو رخوں پر قائم ہے۔ ایک رخ وہ جو قائم ہے اور دوسرا رخ وہ ہے جو ایک طرف سے گھٹتا ہے اور دوسری طرف بڑھتا ہے اور تیسری طرف فنا ہو جاتا ہے۔ زندگی جس رخ پر قائم ہے سب کا سب ٹائم ہے۔ زندگی جس رخ پر گھٹ رہی ہے، بڑھ رہی ہے یا فنا ہو رہی ہے سب کا سب اسپیس ہے۔ زمانیت یا ٹائم میں کائنات کا ہر فرد اپنے دوسرے کو پہچانتا ہے اور ایک دوسرے سے متعارف ہے۔ سورج کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ سورج جس طرح ہماری خدمت گزاری میں مصروف ہے۔ نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلے پر جب ہم زمین سے سورج کو دیکھتے ہیں تو ہماری نگاہ کور چشمی محسوس نہیں کرتی۔ اس کا مفہوم یہ نکلا کہ جب ہم اپنا رشتہ زمانیت سے قائم کر لیتے ہیں تو ہمارے لئے فاصلے معدوم ہو جاتے ہیں۔ ہماری آنکھ جو چند سو فٹ سے آگے نہیں دیکھ سکتی، نو کروڑ تیس لاکھ میل دُور دیکھ لیتی ہے۔

کائنات میں یا افراد میں تعارف کے لئے جو روشنی ذریعہ بن رہی ہے وہ ازل سے ایک ہی طرز پر قائم ہے۔ کائنات کے تمام افراد کی ''انا'' ''نفس'' یا ''روح'' ایک ہے، لیکن جسمانی خدوخال الگ الگ ہیں۔ جہاں انا ایک ہے وہاں ہر شئے میں اِشتراک ہے۔ مثلاً بھوک بکری کو بھی لگتی ہے کہ انسان کو بھی لگتی ہے، شیر کو بھی بھوک لگتی

ہے۔ بھوک کا لگنا زمانیت ہے لیکن انفرادی طور پر جب خدوخال مکانیت بنتے ہیں، شیر پتے نہیں کھاتا اور بکری گوشت نہیں کھاتی۔ بھوک لگنا زمانیت پر قائم ہے اور بھوک کو الگ چیزوں سے رفع کرنا اسپیس یا مکانیت ہے۔ آپس میں تعلق کا ذریعہ ایک روشنی ہے۔ یہ روشنی دو قسم کی ہے ایک قسم ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتی، داخلی آنکھ (روحانی آنکھ) سے نظر آتی ہے...اور دوسری روشنی وہ ہے جسے ظاہری آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ ایک نگاہ سے نظر آنے والے خدوخال کی روشنی میں کسی قسم کا تغیّر نہیں ہے۔ بھوک رفع کرنے کا مسئلہ آتا ہے تو اس میں تغیّر واقع ہو جاتا ہے۔ تغیّر اور تبدل کی لاتغیّر حیثیت گریز اور کشش ہے۔ ایک چیز اپنے محور سے نکل کر اپنے محور کی طرف رجوع کر رہی ہے یا واپس پلٹ رہی ہے۔ یہ گریز ہے اور یہی چیز اپنے محور سے ہٹ کر کسی ایک مقام میں گریز کے ساتھ ساتھ قائم بھی ہے۔ یہ کشش (Gravity) ہے۔ روشنی کی ایک اصل غیر متغیّر ہے۔ روشنی کی غیر متغیّر اصل ھَیُولیٰ ہے۔ یہ روشنی محض روشنی نہیں ہے۔ یہ روشنی خدوخال بھی رکھتی ہے۔ اس روشنی کے اندر جسم بھی ہوتا ہے اور نقش و نگار بھی ہوتے ہیں۔ اس کو ہم روشنی کا جسم کہہ سکتے ہیں۔ داخلی نگاہ اسے دیکھتی، ادراک اسے محسوس کرتا ہے، روشنی کا یہ جسم، جسمِ مثالی Aura ہے۔

مؤکل کیا ہوتے ہیں؟

سوال: وظائف کی زکوٰۃ کیا ہوتی ہے؟ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ فلاں اسم کے مؤکل، فلاں آیت کے مؤکل، فلاں سورۃ کے مؤکل ہوتے ہیں.... یہ مؤکل کیا چیز ہیں؟

جواب: مرشدِ کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے اپنی کتاب لوح و قلم میں نہایت وضاحت سے یہ فرمایا ہے کہ:

"یہاں کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ جس کی شکل و صورت نہ ہو۔"

انتہا یہ کہ کسی شخص کو بخار ہے تو اس بخار کی بھی شکل و صورت ہے۔ ٹائیفائیڈ بخار کی الگ شکل و صورت ہے۔ گردن توڑ بخار کی الگ شکل و صورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں جتنی بھی چیزیں ہیں شکل و صورت کے ساتھ ساتھ اُن کا ایک منفرد وصف بھی ہے۔ ان کے اندر اپنی ایک طاقت بھی ہے۔ مثلاً اگر بخار کے اندر طاقت نہ ہو تو بخار ہاتھی کو نہیں گرا سکتا۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ بخار ہاتھی کو بھی گرا دیتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہاتھی کی طاقت کے مقابلے میں بخار کی طاقت زیادہ ہے۔ جب ہی تو وہ ہاتھی کو گرا دیتا ہے۔ ہاتھی گرانے والی اس طاقت کی جب کوئی شکل و صورت نہ ہو اور اس کے اندر کوئی طاقت نہ ہو تو وہ ہاتھی کو کیسے گرا دے گی۔

ہوا کی مثال لے لیجئے، ہَوا ہر وقت چلتی رہتی ہے۔ محسوس بھی ہوتی ہے۔ اگر ذرا سی تیز ہَوا چلے تو جسم کے اوپر اس کی چوٹ بھی پڑتی ہے۔ ہَوا بھاری ہو تو محسوس بھی ہوتی ہے۔ لطیف ہو تو وہ بھی محسوس ہوتی ہے۔ ہَوا میں خنکی اگر زیادہ ہو اس کے بھی تاثرات قائم ہوتے ہیں۔ ہَوا اگر لو بن جائے تو اس کے بھی تاثرات قائم ہوتے ہیں۔ یعنی تاثر قائم ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اس چیز کے اندر انرجی بھی ہے اور اس چیز کے اندر طاقت بھی ہے اور اس چیز کی اپنی شکل و صورت بھی ہے۔ بیکٹیریا کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ایک سوئی کی نوک پر کئی لاکھ بیکٹیریا آ جاتے ہیں۔ جس نے بھی اس کو خوردبین سے دیکھا تو اسے بیکٹیریا نظر آیا۔ اب اگر صورت نہیں تھی تو بیکٹیریا کو کیسے دیکھ لیا۔

جِنّین پر آج کل بڑی ریسرچ ہو رہی ہے۔ یہ وہ مادہ ہوتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ اَولاد تخلیق کرتا ہے۔ جسے جِنّین کہتے ہیں۔ ایک ایک قطرے میں کئی کئی لاکھ اور کروڑ ہوتے ہیں۔ اور ان میں کچھ زندہ ہوتے ہیں اور کچھ مردہ ہوتے ہیں۔ کچھ بیمار ہوتے ہیں۔ ایک جِنّین کا لیبارٹری میں اگر تجزیہ کریں تو اس جِنّین کے اندر یہ بھی نظر آتا ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کے بال بھورے ہیں کہ کالے، آنکھیں اس کی کالی ہیں کہ بھوری، اس کا قد کتنا ہے، اس کا رنگ کیسا ہے؟ اگر جِنّین میں اپنی ذاتی شکل و صورت نہ ہو تو کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ آدمی کے بال ایسے ہیں، آدمی کی آنکھ ایسی ہے، آدمی کا قد کیسا ہے، آدمی کا رنگ کیسا ہے؟

آپ نے بڑ کا درخت دیکھا ہوگا۔ بڑ کے درخت کی عمر سینکڑوں سال ہوتی ہے اور ایک بڑ کا درخت اتنا بڑا ہوتا ہے کہ کبھی اس کے نیچے باراتیں ٹھہر جاتی تھیں۔ پانچ سو ہزار آدمی بڑے آرام سے بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھ سکتے ہیں اور یہ اس قدر گھنا ہوتا ہے کہ اس درخت کے نیچے بارش نہیں آتی۔ اب اس بڑ کے درخت کا بیج اگر آپ دیکھیں تو وہ خشخاش کے دانے سے بھی آدھا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اتنی چھوٹی چیز خشخاش کے دانے سے بھی چھوٹی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا درخت چھپایا ہوا ہے۔ اب آپ غور کریں کہ کوئی چیز چھوٹی سے چھوٹی بھی ہے تو اس کے اندر آپ کو بڑی سے بڑی چیز مل جائے گی۔

یہ قدرت کا نظام ہے۔ بظاہر ایک چھوٹا سا بیج ہے لیکن اس کے اندر بلند و بالا اور گھنا درخت چھپا ہوا ہے۔

حضور قلندر بابا اؤلیاءؒ کی تعلیمات کے مطابق کوئی چیز یہاں ایسی نہیں ہے جس کی شکل و صورت نہ ہو اور اس کی اپنی خاصیت نہ ہو۔ اس قانون کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ جب ہم بولتے ہیں، ہمارے کہے ہوئے الفاظ کے اندر شکل و صورت نہ ہو تو ان الفاظ کا دباؤ نہیں پڑ سکتا۔ مثلاً ایک آدمی غصے سے بات کرتا ہے، تو دوسرے آدمی کے دماغ پر اس غصے کا اثر پڑتا ہے، وہی آدمی وہی بات پیار سے ادا کرتا ہے تو اس کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ لہجے میں بھی ایک طاقت ہے۔ اگر آپ زور سے نفرت سے بولیں گے تو دوسرے آدمی کو برا لگے گا۔ وہی الفاظ آپ پیار محبت سے کہیں گے تو دوسرے آدمی کو برا محسوس نہیں ہوگا۔ قرآنِ پاک سے جب ہم رجوع کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (سورۃالنّور–35)

ترجمہ: اللہ زمین و آسمان کی روشنی ہے

اس کا مطلب یہ ہوا کہ زمین اور تمام آسمان، زمین کے اندر تمام مخلوقات اور آسمان کے اندر تمام مخلوقات روشنیوں کے غلاف میں بند ہیں۔یعنی ہر چیز کے اوپر روشنی کا ایک غلاف ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ہر چیز روشنی ہے۔اس روشنی کی بھی اپنی طاقت ہے۔روشنی بہت لطیف بھی ہوتی ہے۔ مثلاً X-Ray کی روشنیاں، یہ اتنی لطیف ہوتی ہیں کہ نظر نہیں آتیں، لیکن پورے جسم میں سے اور ہڈیوں میں سے گزر کر فلم بنادیتی ہیں۔لیزر کی روشنی تو اتنی زیادہ لطیف ہے کہ اس سے آنکھ کا آپریشن کر لیا جاتا ہے۔ایک خبر چھپی تھی کہ کسی خلائی جہاز میں سوراخ ہو گیا تھا اور اس کے زمین پر گر جانے کا خطرہ تھا۔لیکن یہاں سے سائنس دانوں نے سینکڑوں میل دُور سے لیزر شعاعیں بھیج کر اس سوراخ کو بند کر دیا اور خلائی جہاز ٹھیک ہو کر اپنے مدار میں گھومتا رہا۔اب تک کی گفتگو سے اس قانون کی کافی وضاحت ہو گئی ہے کہ یہاں ہر چیز کے پس پردہ اس کی ہیئت روشنی کی صورت میں ہے۔

چنانچہ نقطہ یہ سامنے آیا کہ یہاں ہر لفظ روشنی ہے۔جب ہم کسی اسم کا وِرد کرتے ہیں یا کسی آیت کا وِرد کرتے ہیں تو اس وِرد سے ہمارے اندر اس لفظ کی یا اس کی یا آیت کی یا سُورۃ کی روشنی ہمارے اندر منتقل ہو کر ذخیرہ ہو جاتی ہے جیسے جیسے وہ روشنیاں ذخیرہ ہوتی ہیں،ان روشنیوں کا ایک تشخّص بنتا ہے،ایک ہیئت بن جاتی ہے،ایک شکل و صورت بن جاتی ہے۔اس شکل و صورت کو روحانی لوگ "مؤکل" کہتے ہیں۔یعنی کسی اسم کا روشن پہلو یا کسی اسم کی روشن شکل وصورت کا نام مؤکل ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں فرماتے ہیں۔

"اگر ہم قرآن کو پہاڑوں پر نازل کرتے تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے۔"(سورۃ الحشر–21)

جب ہم قرآن کے الفاظ کا تذکرہ کرتے ہیں تو قرآن کا ہر لفظ روشنی اور نور ہے۔قرآن کا کوئی نقطہ، کوئی آیت اور کوئی بھی سورۃ روشنی ہے اور اس کی شکل وصورت بھی ہے اور اسی شکل وصورت کو مؤکل کہا جاتا ہے۔جب کوئی آدمی کوئی اسم یا آیت پڑھتا ہے اور بار بار پڑھتا ہے اور اس پڑھائی میں الفاظ کی تکرار کرتا ہے کہ اس کی طاقت سوا

لاکھ (125000) مرتبہ ہو جائے تو وہ اس مؤکل سے یعنی اس کی طاقت سے قریب ہو جاتا ہے۔ جو سورۃ کے اندر، آیت کے اندر موجود ہے، اور جب وہ اس سے قریب ہو جاتا ہے تو اس سے واقف ہو جاتا ہے۔ شعوری طور پر چاہے وہ اس سے واقف نہ بھی ہو لیکن لاشعوری طور پر وہ اس سے ضرور واقف ہو جاتا ہے۔ اس واقفیت کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ اجازت یافتہ ہے اور اس نے آیت کی طاقت کو اور اس آیت میں جو روشنی ہے اس کو حاصل کر لیا ہے اور وہ صاحب اجازت ہو گیا ہے۔ اس کے بعد آپ کے اندر کتنا یقین ہے اس یقین کے مطابق اللہ کے اسم یا آیت میں مخفی طاقت کام کرتی ہے اور اس پر عملدرآمد کرتی ہے۔ کسی بھی اسم یا آیت کی زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے روحانی استاد کی اجازت اور نگرانی ضروری ہے۔

بابـــب دھـــم

مذہب کی حقیقت کیا ہے؟

سوال: جب ہم مذہب اور غیر مذہبیت کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ دونوں طرزوں کا کوئی عقیدہ ضرور ہوتا ہے۔ مذہب کا اپنا عقیدہ ہوتا ہے اور لا مذہبیت کا اپنا عقیدہ ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کو نہ ماننے والے سکون کی زندگی نہیں گزارتے تو ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مذہب کو ماننے والے بھی بے سکون زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی زندگی بھی بے یقینی سے بھرپور ہوتی ہے۔ درخواست ہے یہ بتایئے کہ مذہب کیا ہے؟ مذہب کی حقیقت کیا ہے، مذہب کو ماننے والے کو غیر مذاہب کے پیروکاروں کے مقابلہ میں کس قسم کا فائدہ حاصل ہونا چاہئے یا ہوتا ہے؟

جواب: آدمی جس معاشرے میں تربیت پا کر جوان ہوتا ہے وہ معاشرہ اس کا عقیدہ بن جاتا ہے۔ اس کا ذہن اس قابل نہیں رہتا کہ اس عقیدے کا تجزیہ کر سکے۔ چنانچہ وہ عقیدہ یقین کا مقام حاصل کر لیتا ہے حالانکہ وہ محض فریب ہے۔ کیونکہ آدمی جو کچھ خود کو ظاہر کرتا ہے حقیقتاً وہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہے۔ اس قسم کی زندگی گزارنے میں اسے بہت سی مشکلات پیش آتی ہیں۔ ایسی مشکلات جن کا حل اس کے پاس نہیں ہے۔ اب قدم قدم پر اسے خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا عمل تلف ہو جائے گا اور بے نتیجہ ثابت ہو گا۔

بعض اوقات یہ شک یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کی زندگی تلف ہو رہی ہے اور اگر تلف نہیں ہو رہی تو سخت خطرے میں ہے۔ یہ سب کچھ ان دماغی خلیوں کی وجہ سے ہے جن میں تیزی سے ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے۔ جب آدمی کی زندگی وہ نہیں ہے جسے وہ گزار رہا ہے یا جسے وہ پیش کر رہا ہے، جس پر اس کا عمل ہے، اس عمل سے وہ نتائج حاصل کرنا چاہتا ہے، جو اس کے حسبِ خواہ ہوں لیکن دماغی خلیوں کی تیزی سے ٹوٹ پھوٹ اور

ردّوبدل قدم قدم پر اس کے عملی راستوں کو بدلتی رہتی ہے اور وہ یا تو بے نتیجہ ثابت ہوتے ہیں یا ان سے نقصان پہنچتا ہے یا ایسا شک پیدا ہوتا ہے جو قدم اٹھانے میں رکاوٹ بنتا ہے۔

آدمی کے دماغ کی ساخت سے مراد دماغی خلیوں میں تیزی سے ٹوٹ پھوٹ، اعتدال میں ٹوٹ پھوٹ یا کم ٹوٹ پھوٹ ہونا ہے۔ یہ محض اتفاقیہ امر ہے کہ دماغی خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کم سے کم ہو جس کی وجہ سے وہ شک سے محفوظ رہتا ہے لیکن جس قدر شک اور بے یقینی دماغ میں کم ہو گی اسی قدر آدمی کی زندگی کامیاب گزرے گی اور جس مناسبت سے شک اور بے یقینی کی زیادتی ہو گی زندگی ناکامیوں میں بسر ہو گی۔

آدمی کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس نے اللہ کے عطا کئے ہوئے علوم کو خود ساختہ اور غلط بنیادوں پر پرکھا اور ان سے انکاری ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر علم کی بنیاد روشنی کو قرار دیا ہے۔ آدمی کو چاہئے تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ روشنیوں کی قسمیں اور روشنیوں کا طرز عمل معلوم کرتا لیکن اس نے کبھی اس طرف توجّہ نہیں کی اور یہ چیز ہمیشہ پردے میں رہی۔

آدمی یہ قاعدے معلوم کرنے کی طرف متوجّہ ہی نہیں ہوا جو روشنیوں کے خلط ملط سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر آدمی یہ طرز عمل اختیار کرتا تو اس کے دماغی خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کم سے کم ہو سکتی تھی اور وہ یقین کی طرف قدم اٹھاتا۔ اس نے روشنیوں کی قسمیں معلوم نہیں کیں، نہ روشنیوں کی طبیعت کا حال معلوم کرنے کی کوشش کی۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ روشنیاں ہی اس کی زندگی ہیں اور اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ وہ صرف مٹی کے پُتلے سے واقف ہے اس پُتلے سے جس کے اندر اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہے۔ جس کو اللہ نے سڑی ہوئی مٹی سے بنایا ہے۔ حقیقت وہ ہے جو اللہ نے روح کی شکل میں پھونکی ہے۔

مذہب ہمیں یقین کے اس پیٹرن میں داخل کر دیتا ہے جہاں شک و شبہات اور وسوسے ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنی باطنی نگاہ سے غیب کی دنیا اور غیب کی دنیا میں موجود چلتے پھرتے فرشتوں کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ خالق کی صفات کو اپنے اوپر محیط دیکھتا ہے۔ روحانی نقطۂ نگاہ سے اگر کسی بندے کے اندر باطنی نگاہ متحرّک نہیں تو ایمان کے دائرے میں

داخل نہیں ہوتا۔ جب کوئی بندہ ایمان کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کی طرزِ فکر میں سے تخریب اور شیطنیت نکل جاتی ہے اور اگر بندے کے اوپر یقین (غیب کی دنیا) منکشف نہیں ہوتی تو ایسا بندہ ہر وقت تخریب اور شیطنت کے جال میں گرفتار رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بے شمار ایجادات اور لا متناہی آرام و آسائش کے باوجود ہر شخص بے سکون، پریشان اور عدم تحفّظ کا شکار ہے۔ سائنس چونکہ میٹر (Matter) یعنی مادہ پر یقین رکھتی ہے اور مادہ عارضی اور فکشن (Fiction) ہے اس لئے سائنس کی ہر ترقی، ہر ایجاد اور آرام و آسائش کے تمام وسائل عارضی اور فنا ہو جانے والے ہیں۔ جس شئے کی بنیاد ہی ٹوٹ پھوٹ اور فنا ہو اس سے کبھی حقیقی مسرت حاصل نہیں ہو سکتی۔

مذہب اور لا مذہب میں یہ بنیادی فرق ہے کہ:

لا مذہبیت انسان کے اندر شکوک و شبہات، وسوسے اور غیر یقینی احساسات کو جنم دیتی ہے... جبکہ

مذہب تمام احساسات، خیالات، تصوّرات اور زندگی کے اعمال و حرکات کو ایک قائم بالذّات اور مستقل ہستی سے وابستہ کر دیتا ہے۔

موجودہ دَور بے یقینی کا دور اس لئے بن گیا ہے کہ آدمی کا عقیدہ واحد ذات اللہ کے ساتھ کمزور ہو گیا ہے۔

خدا نے دنیا میں یہ سارے وسائل اس لئے پیدا کئے ہیں کہ آدم زاد ان کو اپنے آرام و آسائش کے لئے خوش ہو کر استعمال کرے۔ لیکن باغی آدم زاد نے یہ سمجھ لیا ہے کہ.... دنیا ہمارے لئے.... ہم دنیا کے لئے.... ہیں۔ ایک مشفق باپ اپنے بیٹے کو طرح طرح کے خوشنما کھلونے لا کر دیتا ہے۔ بیٹا ان کھلونوں میں اس طرح مگن اور گم ہو جاتا ہے کہ باپ کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ کیا کوئی باپ بیٹے کی اس غلط روش کو پسند کرے گا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ پھر جب نَوعِ انسانی اللہ کے دیئے ہوئے وسائل کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لے اور اپنے خالق اللہ سے اس کا تعلق صرف

زبانی جمع خرچ کی طرح رہ جائے تو اسے سکون کیسے مل سکتا ہے۔ مذہب کی بنیاد ہی یہ ہے اوّل آخر، ظاہر باطن، بندہ کی مرکزیت خالقِ کائنات اللہ ہو۔ یہی وہ طرزِ فکر ہے جس کو مستحکم کرنے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ نَوعِ انسانی نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ ایک شیطان کے پُر فریب جال میں پھنس کر بے سکون ہو گئی۔

حواس کہاں سے آتے ہیں؟

سوال: انسانی زندگی کا دار و مدار حواس پر ہے۔ حواس کہاں سے آتے ہیں اور حواس میں خوشی اور ناخوشی کیا معنی رکھتی ہے؟

جواب: روح کا جب تذکرہ آتا ہے تو قرآنِ پاک کے ارشاد کے مطابق ہمیں یہ علم حاصل ہو جاتا ہے کہ روح ایک ایسا وصف ہے جو براہ راست اللہ کی ذات سے ہم رشتہ ہے، یعنی بحیثیت خالق کے، اللہ کل ہے اور اللہ کی صفتِ خالقیت کل کا ایک جُزو ہے.... کل کے اس جُزو کا نام روح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آدمی ناقابل تذکرہ شئے تھا، ہم نے اس کے اندر اپنی روح پھونک دی پس یہ دیکھتا، سنتا، بولتا اور محسوس کرتا آدمی بن گیا۔ یعنی جب تک انسان کے اندر اللہ نے اپنی روح منتقل نہیں کی، آدمی کی حیثیت ایک لوتھڑے کی تھی اور جب اس لوتھڑے کو روح نے سنبھال لیا تو اس کے اندر حواس منتقل ہو گئے۔

بولنا، دیکھنا، چکھنا، محسوس کرنا یہ سب روح کی صفات ہیں اور روح کا تعلق براہِ راست اللہ کی ذات سے ہے۔ روح کو جاننے اور سمجھنے کے لئے پہلا مرتبہ آدمی کے اندر یقین کی طرزیں مستحکم ہونا ہے۔ اگر بندے میں یقین کی طرزیں مستحکم نہیں ہیں تو وہ روحانی علم نہیں سیکھ سکتا۔ یقین کی طرزوں سے مراد وہ یقین نہیں ہے جو لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ دنیا کی بیشتر آبادی اللہ کے ہونے کا اعتراف کرتی ہے لیکن چونکہ اللہ کو ماننا محض زبانی جمع خرچ ہے۔ اس لئے اس کے اندر یقین کا پیٹرن نہیں بنتا۔ سورہ بقرہ میں اس بات کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے "یہ کتاب اس میں شک و

شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور اس کے مندرجات میں ”نور“ ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو لوگ متقی ہیں اور متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر یقین رکھتے ہیں۔“

یقین اس وقت یقین ہے جب مشاہدہ میں آجائے۔ مثلاً کسی جج کے لئے گواہی اس وقت قابلِ قبول ہوتی ہے جب گواہ چشم دید ہو۔ سنی سنائی بات پر عدالت گواہی قبول نہیں کرتی۔ قرآن میں چونکہ شکوک وشبہات نہیں ہیں اس لئے اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن سے استفادہ کرنے والے بندہ کا ذہن شکوک وشبہات سے آزاد ہو۔ قرآن کی زبان میں وہ لوگ قرآن سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو متقی ہیں۔ غیر متقی لوگوں کو قرآن ہدایت نہیں بخشتا۔ متقی لوگوں کی تعریف یہ ہے کہ وہ غیب پر ایمان (یقین) رکھتے ہیں اور مشاہدہ کے بغیر یقین کی تکمیل نہیں ہوتی اور قرآن ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو صلوٰۃ (تعلق) قائم کرتے ہیں، اللہ کے ساتھ۔ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں تو وہ جانتے ہیں یہ انہیں اللہ ہی نے دیا ہے۔

شرحِ صدر کیا ہے؟

سوال: روحانی ڈائجسٹ اگست 2003ء کے شمارے میں قرآنی انسائیکلوپیڈیا کے صفحات پر حضور پُرنور ﷺ کے سفر معراج کے واقعات پڑھنے کی سعادت ملی۔ پہلے تو آپ کو اس بات پر میں مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے شب معراج کے حوالے سے دہرائی جانے والی ایک فرسودہ روایت کو رد فرمایا یعنی یہ کہ 50 نمازیں گھٹا گھٹا کر 5 کردی گئیں۔ بلاشبہ یہ حضور ﷺ کی شانِ اقدس میں بے ادبی اور گستاخی ہے اور سراسر اسرائیلیت ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ بچپن میں حضور ﷺ کے پاس دو فرشتے آئے اور انہوں نے آپ ﷺ کا قلبِ مبارک صاف کیا۔ اس واقعہ کو شرحِ صدر کہا جاتا ہے۔ اس واقعہ کی روحانی توجیہ کیا ہے؟

جواب: روحانی نقطۂ نظر سے ہر انسان میں دو دماغ کام کرتے ہیں۔ جب کوئی بچہ دنیا میں آتا ہے تو بتدریج اس کے اوپر مادّی حواس کا غلبہ ہو جاتا ہے اور مادّی حواس کا یہ غلبہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ غیب کی چیزیں نہیں دیکھ سکتا۔

سیدنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام بچپن میں بھی غیب کا مشاہدہ کرتے تھے۔اس لئے کہ، حضرت جبرائیل علیہ السّلام کا نظر آنا، سینۂ مبارک کا شق ہونا، قلبِ اطہر کو طشتری میں رکھنا، اس کو دھونا اور سینۂ مبارک میں رکھ کر شگاف کو بند کرنا..... یہ سب غیب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔اس سارے واقعہ میں یہ بات بڑی فکر طلب ہے کہ بی بی حلیمہ، ان کے شوہر اور حضور ﷺ کے رضائی بھائی عبداللہ نے جب حضور ﷺ کو دیکھا تو سینے کے شق ہونے اور دل باہر نکالنے کے اثرات موجود نہیں تھے۔انتہا یہ کہ لباس پر خون کا کوئی داغ دھبہ تک نہیں تھا۔اس کا مطلب یہ ہُوا کہ حضور پاک ﷺ نے بچپن میں ہی ایسی ماورائی حالت یا کیفیت کا مشاہدہ کیا جو عام آدمی نہیں کر سکتا۔

تفکر کی صلاحیت

سوال: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کو بہترین صناعی سے بنایا گیا ہے اور یہ اسفل میں گر گیا۔قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ بار بار تفکر کی دعوت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ترکِ تفکر ہی اسفل ہے؟ تفکر کا مفہوم کیا ہے؟ کیا گہرائی میں فکر کرنے کو تفکر کہا جاتا ہے؟ ایمان وایقان کا تفکر سے کیا ربط ہے؟ اور کیا کوئی انسان تفکر کر کے کائنات کی حکمرانی میں اللہ کا نائب بن سکتا ہے؟ تفکر کی صلاحیت سے محروم انسان اور حیوانات میں کیا فرق ہے؟

جواب: جب ہم عقل و شعور کا موازنہ کرتے ہیں تو کوئی آدمی ہمیں زیادہ باصلاحیت نظر آتا ہے، کوئی آدمی کم صلاحیت اور کوئی آدمی بالکل بے عقل ہوتا ہے۔سائنس خلاء(Space) میں چہل قدمی کا دعویٰ کر سکتی ہے لیکن ایسی کوئی مثال سامنے نہیں آئی کہ بے عقل آدمی کو عقلمند بنا دیا گیا ہو۔اللہ ہی اپنی مرضی سے عقل و شعور بخشتا ہے۔آدمی کے اندر فکر و گہرائی عطا کرتا ہے۔لوگ سمجھتے ہیں کہ عقل و فکر ہمارا ذاتی وصف ہے لیکن جب فکر و گہرائی ان سے چھین لی جاتی ہے تو اس وقت وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

’’آپ کہہ دیجئے، مشاہدہ کرو جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے۔۔۔۔۔کیا تم مشاہدہ نہیں کرتے؟۔۔۔کیا تم غور وفکر نہیں کرتے؟۔۔۔کیا تم تدبیر نہیں کرتے؟۔۔۔خدا کی نظر میں بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو گونگے بہرے ہیں۔(یعنی گونگے بہرے جیسی زندگی گزارتے ہیں)اور تدبر سے کام نہیں لیتے۔‘‘(القرآن)

فطرت اور جبلّت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔جبلّت میں ہمارا دوسری انواع مثلاً بھیڑ، گائے، بھینس، کتے، بلی وغیرہ کے ساتھ ذہنی اشتراک ہے اور فطرت میں ہم اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔یہ مقام ہمیں ایک ہستی نے جو تمام انواع سے ماوراء ہے اور تمام افرادِ کائنات پر فضیلت رکھتی ہے، عطا کیا ہے اور یہ عطا ایک فاضل عقل یا تفکر کرنے کی صلاحیت ہے۔روحانی سائنس کا طالب علم اپنے مشاہدے اور تجزیے کی بناء پر اس مقصد سے آشنا ہوتا ہے کہ کائنات میں عناصر کی ترتیب، ہم آہنگی، نظم، افادیت و مقصدیت کور چشم شعور کی کارفرمائی نہیں ہے۔کوئی طاقت ہے، کوئی ہستی ہے جس کے حکم پر ازل تا ابد نظامِ حیات و کائنات قائم ہے۔

کائنات میں گھڑی بھر کا تفکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔جن قوموں نے کائنات کے اجزائے ترکیبی یعنی افراد کائنات کی تخلیق پر غور کیا، وہ سرفراز ہوئیں اور جس قوم نے کائنات پر تفکر سے اپنا رشتہ منقطع کیا وہ اقوام عالم میں مردہ قوم بن گئی۔قرآن، سائنسی فارمولوں کی ایک دستاویز ہے۔اس کی مقدّس آیات میں تفکر کیا جائے تو ہم خلائی تسخیر میں ایک ایسا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جہاں سائنس دان کھربوں ڈالر خرچ کر کے بھی نہیں پہنچ سکے ہیں۔قرآنِ پاک کے ارشاد کے مطابق تسخیر کائنات ہمارا ورثہ ہے۔قرآن کہتا ہے:’’زمین و آسمان میں اہل ایمان کے لئے حقائق وبصائر موجود ہیں۔‘‘

یعنی اہل ایمان کی خصوصیت یہ ہے کہ زمین و آسمان کی حقیقتوں اور اس کے اندر موجود تخلیقات کے فارمولوں پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ان کے مشاہدے کی طاقت کہکشانی نظاموں کی نقاب کشائی کرتی ہے۔قرآن بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ نشانیاں ایمان والوں کے لئے ہیں۔مفہوم یہ ہے کہ نشانیاں تو سب کے لئے ہیں مگر انسانوں

میں صرف ایمان والے لوگ ہی اللہ کی نشانیوں، آیتوں اور حکمتوں پر غور و فکر کرتے ہیں۔ غفلت اور جہالت میں ڈوبے ہوئے لوگ جو جانوروں کی طرح جیتے ہیں، ضدی اور ہٹ دھرم جو ''میں نہ مانوں'' کی زندہ متحرّک تصویر ہیں ان کے لئے اللہ کی نشانیوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

عشاء کا وقت افضل کیوں ہے؟

سوال: اکثر اَوراد و وظائف بعد نمازِ عشاء پڑھنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ یہ نہیں سنا کہ کوئی وظیفہ بعد نماز ظہر اور عصر کیا جائے۔ آخر اس کی توجیہ کیا ہے اور عشاء کا وقت اتنا افضل کیوں ہے؟

جواب: ہر نماز باعث برکت ہے لیکن ان کی خصوصیات الگ الگ ہیں۔ فجر کی نماز ادا کرنے والا بندہ دوسری تمام مخلوق کے ساتھ جب عبادت اور تسبیح میں مشغول ہوتا ہے تو دنیا کا پورا ماحول مصفّٰی، مجلّٰی اور پُر انوار ہو جاتا ہے اور ماحول کی اس پاکیزگی سے انسان کو روحانی اور جسمانی صحت نصیب ہوتی ہے۔ سورج کی تمازت ختم ہو کر جب زوال شروع ہوتا ہے تو زمین کے اندر سے ایک گیس خارج ہوتی ہے۔ یہ گیس اس قدر زہریلی ہوتی ہے کہ اگر آدمی کے اوپر اثرانداز ہو جائے تو وہ قسم قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دماغی نظام اس حد تک درہم برہم ہو سکتا ہے کہ اس کے اوپر ایک پاگل آدمی کا گمان ہوتا ہے۔ اس وقت جو بندہ ذہنی طور پر عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے تو اسے نماز کی نورانی لہریں اس زہریلی گیس سے محفوظ رکھتی ہے۔ ان نورانی لہروں سے یہ زہریلی گیس بے اثر ہو جاتی ہے۔ یہ ظہر کی نماز کی برکات ہیں۔ ہر ذی فہم انسان اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ سہ پہر کے وقت اس کے اوپر ایسی کیفیات طاری ہوتی ہیں جس کو وہ تکان اور اِضمحلال کا نام دیتا ہے۔ یہ تکان اور اِضمحلال جو اس پر لاشعوری حواس کی گرفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ عصر کی نماز شعور کو اس حد تک مضمحل ہونے سے روک دیتی ہے۔ جس سے دماغ پر خراب اثرات مرتّب ہوں۔ عصر کی نماز قائم کرنے والے بندے کے شعور مین اتنی طاقت آ جاتی ہے کہ وہ لاشعوری نظام کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے اور اپنی روح سے قریب ہو جاتا ہے۔ نماز عصر کی بہت سی برکات بیان کی گئی ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ

جس نے نماز عصر کھوئی اس نے دنیا کھوئی۔ آدمی بالفعل اس بات کا شکر ادا کرتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے رزق عطا فرمایا۔ ایسا گھر اور بہترین رفیقہ حیات عطا کی جس نے اس کی اور اس کے بچوں کی غذائی ضروریات پوری کیں۔ شکر کے جذبات سے وہ مسرور اور خوش و خرم اور پُر کیف ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر خالقِ کائنات کی وہ صفات متحرّک ہو جاتی ہیں جن کے ذریعہ کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔ جب وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ پُر سکون ذہن سے محو گفتگو ہوتا ہے تو اس کے اندر کی روشنیوں سے اَولاد کے دل میں ماں باپ کا احترام اور وقار قائم ہوتا ہے۔ بچے غیر ارادی طور پر ماں باپ کی عادتوں کو تیزی کے ساتھ اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور ان کے اندر ماں باپ کی اہمیت و عشق کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ مغرب کی نماز صحیح طور پر اور پابندی کے ساتھ ادا کرنے والے بندے کی اَولاد سعادت مند ہوتی ہے اور ماں باپ کے لئے ایک بہترین اثاثہ ہوتی ہے۔ اب میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں کہ آخر اکثر وظائف یا اوراد بعد نماز عشاء ہی کیوں پڑھنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ دراصل عشاء کی نماز غیب سے متعارف ہونے اور اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرنے کا ایک خصوصی پروگرام ہے کیونکہ عشاء کے وقت آدمی رات کے حواس میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی تعلیم و تربیت کے اسباق اور وظائف عشاء کی نماز کے بعد پورے کئے جاتے ہیں۔ اس لئے جب آدمی رات کے حواس میں ہوتا ہے تو وہ لاشعور اور روحانی طور پر غیب کی دنیا سے قریب اور بہت قریب ہو جاتا ہے اور اس کی دعائیں قبول کر لی جاتی ہیں۔ عشاء کی نماز اس نعمت کا شکریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیداری کے حواس سے نجات عطا فرما کر وہ زندگی عطا فرما دی ہے جو نافرمانی کے ارتکاب سے پہلے جنّت میں حضرت آدم علیہ السّلام کو حاصل تھی۔ یہی وہ حواس ہیں جن میں آدمی خواب دیکھتا ہے اور خواب کے ذریعہ اس کے اوپر مسائل، مشکلات اور بیماریوں سے محفوظ رہنے کا انکشاف ہوتا ہے۔ خواب کی تعبیر سے وہ مستقبل میں پیش آنے والی مصیبتوں سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد سونے والے بندے کی پوری رات لاشعوری طور پر عبادت میں گزرتی ہے اور اس کے اوپر اللہ کی رحمت نازل ہوتی رہتی ہے۔ ایسے بندے کے خواب سچے اور بشارت پر مبنی ہوتے ہیں۔ عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد چونکہ بندہ کے اندر

روحانی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں چنانچہ اس نماز کے بعد وہ اسماءِالٰہیہ کا وِرد کرتا ہے تو اس اسم یا کلام کے اندر کام کرنے والی روحانی طاقت کا جلدی اثر ہوتا ہے اور زیادہ فائدہ پہنچتا ہے

سعید روح اور شَقی روح کیا ہے؟

سوال: روح امرِ ربّی ہے۔ آدم کے اندر جب اللہ کریم نے اپنی روح پھونکی تو وہ معزز ہو گیا۔ یعنی روح کا تعلق بالواسطہ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہے اور تمام روحوں نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا اور اس کی ربوبیّت کا اقرار کیا۔ تو پھر کسی کو سعید روح اور کسی کو شَقی روح کہا جاتا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: شَقی روح اور سعید روح سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روحوں کو دو راستوں میں سے ایک راستے کے انتخاب کا حق دیا ہے۔ جن روحوں نے سعید راستے کا انتخاب کیا وہ سعید ہیں اور جن روحوں نے شقاوت کے راستے کا انتخاب کیا وہ شَقی ہیں اور اللہ تعالیٰ ان دونوں باتوں سے بے نیاز ہے۔ بندوں نے ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے قبول کر لیا۔ قرآنِ پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''دین میں جبر نہیں ہے۔'' (سورۃ البقرۃ –256)

اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے لیکن لوگوں نے ان کی بات نہیں سنی۔ ان کو جھٹلایا۔ ان کو جادوگر کے لقب سے پکارا لیکن وہ اپنے مشن میں مستقل مزاجی سے مشغول رہے اور جن لوگوں نے ان کی بات سنی وہ صحابی ہو گئے۔۔۔۔۔۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو عذاب سے بچا لیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اچھائی اور برائی کے بارے میں معلومات فراہم کر دیں اور انسان کو اچھائی اور برائی کے نفع و نقصان سے آگاہ کر دیا کہ اچھائی اور برائی کو قبول کرنے، نہ کرنے کا اختیار بھی دے دیا تو انسان کی مرضی ہے کہ جنّت میں جائے یا دوزخ میں۔ لیکن ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معافی کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ بڑے سے بڑا ظالم و جابر بھی جب اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرتا ہے تو اللہ اپنی رحمت سے اسے معاف کر دیتے ہیں لیکن جب کوئی انسان برائی پر ضد کرتا ہے

جبکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتادیا ہے کہ آگ ہاتھ جلادیتی ہے۔اور وہ آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ پھر وہ ضد میں یہ کہنے لگے کہ اللہ نے آگ بنائی ہی کیوں؟؟ تو یہ کٹ حجتی ہے، مکر ہے اور عقل کی کوتاہ اندیشی ہے۔اگر آدمی آگ میں ہاتھ ڈالے گا وہ ضرور جلے گا۔اللہ تعالیٰ نے دین کے بارے میں بھی فرمادیا ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے۔ ''اے محمد ﷺ! آپ توحید کا پیغام پہنچادیں لوگ سنیں یانہ سنیں۔آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔اس لئے کہ لوگوں کو اختیار دیا گیا ہے۔''
(سورۃ یونس–108)

رسول اللہ ﷺ بتوں کی پرستش سے منع فرماتے تھے جب لوگوں نے اپنا اختیار استعمال کیا۔عقل و شعور سے کام لیا۔اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی اور وہ اسلام پر گامزن ہوگئے اور اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے۔

حافظے کی سطح

سوال: میں گزشتہ پانچ سالوں سے ایک عجیب ذہنی کیفیت سے دوچار ہوں۔ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ فلاں واقعہ پہلے ہوچکا ہے اور بالکل اسی انداز سے ہوچکا ہے۔جس وقت حافظے سے یادداشت کی فلم ذہن کی سطح پر آتی ہے تو مجھے واضح طور پر محسوس ہوجاتا ہے کہ یہ واقعہ اسی طرح ہوچکا ہے۔اس کیفیت میں کبھی کبھی ترقی ہوجاتی ہے۔وہ اس طرح کہ جب کوئی شخص دوسرے سے سوال کرتا ہے یا کوئی بات کرتا ہے تو اچانک مجھے یاد آتا ہے کہ دوسرا شخص یہ جواب دے گا اور پھر دوسرا شخص وہی بات کرتا ہے جو میرے ذہن میں پہلے سے آچکی ہوتی ہے۔اسی طرح یہ بھی ذہن میں پہلے سے آجاتا ہے کہ فلاں شخص اب یہ عمل کرے گا اور پھر واقعی وہ شخص وہی عمل کرتا ہے۔یہ کیفیت ہر وقت طاری نہیں ہوتی بلکہ ایک ڈیڑھ ماہ کے وقفے سے اچانک کسی وقت یہ محسوسات بیدار ہوجاتے ہیں اور پھر چند منٹ کے بعد ختم ہوجاتے ہیں۔ میں اس عجیب وغریب کیفیت کی علمی توجیہ کے ساتھ ساتھ یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ کوئی روحانی صلاحیت ہے تو کیا اسے بڑھایا جاسکتا ہے اور اس کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے؟

جواب: شعوری اعتبار سے ہم زمانے کی تین حالتوں سے واقف ہیں۔ماضی، حال اور مستقبل۔۔۔۔۔اس تعارف کی بنیاد پر ہم کسی بھی واقعے کو ماضی، حال اور مستقبل کے خانوں میں رکھ کر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن علمِ روحانیت کے مطابق اصل زمانہ ماضی ہے باقی دو زمانے ماضی کی شعوری تقسیم کا نام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ماضی کے علاوہ اس کائنات میں کوئی چیز نہیں ہے۔ ہم جس چیز کو حال اور مستقبل سمجھتے ہیں وہی ماضی کے لمحات سے کسی وقفے میں متعارف ہونا یا نہ ہونا ہے۔ شعوری اعتبار سے بھی غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حال اور مستقبل کی کڑیاں ماضی کی زنجیر سے وابستہ ہیں۔ مرشدِ کریم ابدال حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے شعوری تقسیم کو ایک مثال کے ذریعے کتاب ''لوح و قلم'' میں یوں بیان فرمایا ہے:

''ماہر فلکیات کہتے ہیں کہ ہمارے نظام شمسی سے الگ کوئی نظام ایسا نہیں ہے جس کی روشنی ہم تک چار برس سے کم عرصہ میں پہنچتی ہو۔ وہ ایسے ستارے بھی بتاتے ہیں جن کی روشنی ہم تک ایک کروڑ سال میں پہنچتی ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم اس سیکنڈ میں جس ستارے کو دیکھ رہے ہیں وہ ایک کروڑ سال پہلے کی ہیئت ہے۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ موجودہ لمحہ ایک کروڑ سال پہلے کا لمحہ ہے۔ یہ غور طلب ہے کہ ان دونوں لمحوں کے درمیان جو ایک اور بالکل ایک ہیں، ایک کروڑ سال کا وقفہ ہے... یہ ایک کروڑ سال کہاں گئے؟۔۔۔۔۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک کروڑ سال فقط طرزِ ادراک ہیں۔ طرزِ ادراک نے صرف ایک لمحہ کو ایک کروڑ سال پر تقسیم کر دیا ہے۔ جس طرح طرزِ ادراک گزشتہ ایک کروڑ سال کو موجودہ لمحہ کے اندر دیکھتی ہے۔ اسی طرح طرزِ ادراک آئندہ ایک کروڑ سال کو موجودہ لمحہ کے اندر دیکھ سکتی ہے۔ اسی طرح یہ تحقیق ہو جاتا ہے کہ ازل سے ابد تک کا تمام وقفہ ایک لمحہ ہے جس کو طرزِ ادراک نے ازل سے ابد تک کے مراحل پر تقسیم کر دیا ہے۔ ہم اس ہی تقسیم کو مکان (Space) کہتے ہیں۔ گویا ازل سے ابد تک کا تمام وقفہ مکان ہے اور جتنے حوادث کائنات نے دیکھنے ہیں وہ سب ایک لمحہ کی تقسیم کے اندر مقید ہیں۔ یہ ادراک کا اعجاز ہے کہ جس نے ایک لمحہ کو ازل تا ابد کا روپ عطا کر دیا ہے۔''

وہ لمحہ جس میں کائنات کے تمام حوادث موجود ہیں۔ایک ریکارڈ ہے اور یہ ریکارڈ ہر لمحہ موجود ہے۔انسان کا ذہن اسی ریکارڈ کو پڑھتا ہے اور پڑھنے میں طرز ِادراک واقعات کو ماضی حال اور مستقبل کی نسبت سے محسوس کرتی ہے۔ چونکہ ریکارڈ ہر وقت موجود ہے اس لئے روحانیت میں اسے ماضی کہا جاتا ہے اس لئے کہ یہ وقوع پذیر ہو چکا ہے۔ قدرت نے انسان کے ذہن میں طرزِادراک کی ایک ایسی سطح رکھی ہے جس میں وہ زمانیت اور مکانیت کا پابند نہیں ہے۔ وہ ایک لمحہ میں وقوع پذیر ریکارڈ کو کہیں سے بھی پڑھ سکتا ہے یعنی وہ شعوری اعتبار سے لاکھوں سال پہلے کے واقعات دیکھ سکتا ہے اور لاکھوں سال بعد کے واقعات کا بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔یہی طرزِادراک انسان پر یہ بات بھی منکشف کر دیتا ہے کہ جو کچھ بحالت موجودہ ہورہا ہے، آئندہ ہو گا۔ وہ ایک لمحہ میں تمام کا تمام ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو چکا ہے اسی کو ہم حال اور مستقبل کی صورت میں محسوس کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن کی سطح پر اس طرزِادراک کا ہلکا سا عکس پڑ جاتا ہے اس وقت ذہن یہ بات محسوس کر لیتا ہے کہ وہ ماضی کا ریکارڈ دیکھ رہا ہے اور آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ فلاں واقعہ ہو چکا ہے۔ کبھی کبھی اس عکس میں گہرائی آجاتی ہے اور ذہن ماضی کے اندر موجود مستقبل کو پڑھ لیتا ہے۔ آپ اس بات سے واقف ہو جاتے ہیں کہ وہ شخص کیا کہے گا یا اس سے کیا عمل سرزد ہو گا۔

روحانی اصطلاح میں یہ صلاحیت کشف کا ایک درجہ ہے۔ کشف کے بہت سے درجات ہیں۔ کشف ہی سے ترقی کر کے کوئی روحانی طالب علم الہام، معائنہ، شُہود، سیر اور فتح کے درجات تک پہنچتا ہے۔ان روحانی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لئے کسی کامل روحانی استاد کی رہنمائی اور نگرانی اشد ضروری ہے۔آپ اپنے اندر موجود اس صلاحیت کو متحرّک اور مستحکم کرنے کے لئے حسب ذیل مراقبہ کریں۔

صبح سورج نکلنے سے پہلے آہستہ آہستہ چند گہری سانسیں لیں اور کسی آرام دہ نشست میں بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن کو ہر قسم کے خیالات سے آزاد کر کے اپنے دل کی گہرائی میں جھانکیں۔ تقریباً بیس منٹ تک یہ مراقبہ کریں۔

جو کچھ وارِدات و کیفیات ہوں انہیں ڈائری کی صورت میں لکھتے جائیں اور پندرہ روزہ رپورٹ بھیجتے رہیں۔ لفافہ کے اوپر ایک کونے پر جلی حرفوں سے لفظ "کیفیات مراقبہ" لکھ دیں۔

حسبِ خواہش نتیجہ نہ ملنا

سوال: کوشش اور جدّ وجہد کے باوجود حسب دلخواہ نتائج حاصل نہ ہونے کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: قانون قدرت یہ ہے کہ جب کوئی بندہ جدّ وجہد اور کوشش کرتا ہے اور اس جدّ وجہد اور کوشش کا ثمر کسی نہ کسی طرح اللہ کی مخلوق کے کام آتا ہے تو وسائل میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ زمین پر اللہ نے جتنی بھی اشیاء تخلیق کی ہیں ان کے اندر بے شمار صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ کوشش سے جب ان اشیاء کے اندر صلاحیتوں کو متحرک کر دیا جاتا ہے یا ان اشیاء میں محفوظ مخفی صلاحیتوں کا کھوج لگایا جاتا ہے تو ایجادات کے بے شمار راستے کھل جاتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ نے لوہا تخلیق کیا۔ مِن حَیثُ القوم یا انفرادی طور پر جب لوہے کی صفات اور لوہے کے اندر کام کرنے والی صلاحیتوں کا سراغ لگایا جاتا ہے تو لوہے سے لوگوں کے لئے بے شمار فائدے حاصل ہو جاتے ہیں۔ سائنسی ترقی میں مشکل سے کوئی ایسی چیز ملے گی جس میں کسی نہ کسی طرح لوہے کا عمل دخل نہ ہو۔

علمائے باطن اولیاءاللہ فرماتے ہیں کہ انفرادی زندگی اور قومی زندگی لوحِ محفوظ پر نقش ہے۔ انفرادی حدود میں کوئی بندہ جب کوشش اور جدّ وجہد کرتا ہے تو اس بندہ کے اوپر انفرادی فوائد ظاہر ہوتے ہیں۔ قومی اعتبار سے ایک، دو، چار، دس بندے جب تک کوشش کرتے ہیں تو اس جدّ وجہد اور کوشش سے پوری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔

''بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتے جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ لائے۔''(القرآن)

جو قومیں خود اپنی حالت بدلنے کے لئے کوشش کرتی ہیں ان کو ایسے وسائل فراہم کر دیئے جاتے ہیں جن سے وہ معزز اور محترم بن جاتی ہیں اور جو قومیں اپنی تبدیلی نہیں چاہتیں وہ محروم زندگی گزارتی ہیں۔ بندہ اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات کو اگر صحیح سمتوں میں استعمال کرتا ہے تو اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اگر غلط طرزوں میں استعمال کرتا ہے تو منفی نتائج مرتّب ہوتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ بندہ اللہ کے عطا کردہ اختیارات کو اسی طرح استعمال کرے کہ جس سے اس کی اپنی فلاح اور اللہ کی مخلوق کی فلاح کا سامان میسر ہو۔ اللہ خالق ہے، ربّ ہے اور ربوبیّت کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ کے انعامات اور اکرامات اور اللہ کے پیدا کئے ہوئے وسائل سے ساری مخلوق فائدہ اٹھائے۔ اس بات کو اس طرح سمجھا جائے کہ: دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب ریکارڈ ہے۔ اس ریکارڈ میں لوگوں کا عروج و زوال بھی لکھا ہوا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ... قومیں اگر صحیح طرزوں میں عمل زندگی بسر کریں گی تو ان کو عروج نصیب ہو گا اور....

اگر غلط طرزوں میں عملی زندگی بسر کریں گی تو غلام بنادی جائیں گی۔ ذلیل و خوار ہو جائیں گی۔ ترقی اور تنزّل جب زیر بحث آتا ہے تو ذہن اس طرف متوجّہ ہوتا ہے کہ آخر ترقی یا تنزّل میں کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ انفرادی یا اجتماعی جدّ و جہد کے نتیجہ میں ترقی نصیب ہوتی ہے اور انفرادی یا اجتماعی تساہل اور عیش پسندی کے نتیجے میں قومیں عروج کے بجائے زوال پذیر ہو جاتی ہیں۔ ترقی کے دو رخ ہیں۔ ترقی یا عزت و توقیر کی ایک حالت یہ ہے کہ کسی فرد یا کسی قوم کو دنیاوی عزت اور دنیاوی دبدبہ اور دنیاوی شان و شوکت نصیب ہو۔ ترقی کا دوسرا رخ جو فی الواقع حقیقی رخ ہے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ظاہری حالت میں رہتے ہوئے مخفی دنیا میں جس فرد یا قوم کی رسائی ہوتی ہے وہی اصلی ترقی ہے۔

بے شک وہ قومیں جنہوں نے علوم میں تفکر کیااور جدّوجہد کے بعد نئی نئی اختراعات کی ہیں وہ دنیاوی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہی ترقی یافتہ قومیں سکون اور اطمینانِ قلب سے محروم ہیں۔ قلبی اطمینان اور روحانی سکون سے اس لئے محروم ہیں کہ حقیقت سے ان کا واسطہ یا تعلق نہیں ہے۔ حقیقت میں ذہنی انتشار نہیں ہوتا۔ حقیقت کے اوپر کبھی خوف اور غم کے سائے نہیں منڈلاتے، حقیقی دنیا سے متعارف لوگ ہمیشہ پر سکون رہتے ہیں۔ موجودہ دَور بے شک ترقی کا دور ہے لیکن اس ترقی کے ساتھ ساتھ جس قدر صعوبتیں، پریشانیاں، بے سکونی اور ذہنی انتشار سے نَوعِ انسانی دوچار ہوئی ہے اس کی نظیر پہلے کے دَور میں نہیں ملتی۔ اس ترقی کے پیچھے انفرادی ہو یا قومی، ذاتی منفعت اور دولت پرستی ہے۔ اور جب ترقی خالصتاً اللہ اور نَوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے ہوتی ہے تو قوموں کو اطمینان اور سکون نصیب ہوتا ہے۔

انفرادی یا اجتماعی ذہن کا تعلق طرزِ فکر سے ہے۔ طرزِ فکر میں اگر یہ بات ہے کہ ہماری کوشش اور اِختراعات سے اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچے گا تو یہ طرزِ فکر انبیاء کی طرزِ فکر ہے اور یہی طرزِ فکر اللہ کی طرزِ فکر ہے۔ اللہ کی طرزِ فکر یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی خدمت کرتا ہے اور اس خدمت کا کوئی صلہ نہیں چاہتا۔ بندہ جب اختیاری طور پر اس طرزِ فکر کو اختیار کر لیتا ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کی مخلوق کے کام آئے تو اسے ماورائی شعور منتقل ہو جاتا ہے اور ماورائی شعور میں بندہ کا ذہن ہر آن، ہر لمحہ اس طرف متوجّہ رہتا ہے کہ میں وہ کام کر رہا ہوں جو اللہ کے لئے پسندیدہ ہے۔ بار بار اس عادت یا عمل کا اعادہ ہونے سے پہلے اس کے مشاہدات میں یقین شامل ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے جو کچھ ہو چکا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ''ہر شئے اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔'' (القرآن) اس دنیا میں ہر انسان پابند بھی ہے اور بااختیار بھی۔ انسان وہی غذا کھاتا ہے جو اس کے لئے مقرر ہے۔ قوانین کائنات اس کے اوپر محیط ہیں۔ کوئی انسان اس بات پر اختیار نہیں رکھتا کہ سورج کو طلوع ہونے یا غروب ہونے سے منع کر دے۔ کسی انسان میں یہ جرأت بھی نہیں ہے کہ بارش برسانے کا دعویٰ کر سکے۔ وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتا۔ انسانی ایجادات بھی اللہ تعالیٰ ہی کی کسی نہ کسی تخلیق کی محتاج ہیں۔ سائنس ترقی کی کسی منزل پر بھی پہنچ جائے،

سائنسدان موت کے شکنجہ سے آزاد نہیں ہے۔اے انسان!۔۔۔۔۔غور کر۔ تیرا جینا، تیرا مر نا سب اللہ کے کرم کا محتاج ہے۔ تُو کیوں خالق و مالک اللہ سے رجوع نہیں کرتا۔۔۔۔۔؟کون نہیں جانتا جو پیدا ہوا ہے اسے کچھ وقت اس دنیا میں گزار کر رخصت ہو جانا ہے۔ جب تک اس دنیا میں ہے مسافروں کی طرح قیام کر چاہے بابیادہ چل۔ چاہے ہوائی جہازوں میں پرواز کر۔ زمین پر اللہ کا دستر خوان بچھا ہوا ہے۔ شہر کے ایک سرے پر چٹنی رکھی ہوئی ہے اور شہر کے دوسرے کنارے پر پلاؤ، قورمہ، دستر خوان پر سجا ہوا ہے۔ کم ہمت لوگ چٹنی پر گزارہ کر لیتے ہیں اور باہمت افراد اللہ کی پھیلائی ہوئی نعمتیں حاصل کرنے کے لئے جدّ و جہد کرتے ہیں۔ ایک قانون اور ضابطے کے ساتھ۔۔۔۔۔وسائل انسان کے لئے تخلیق کئے گئے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''آسمانوں اور زمین میں ہر شئے انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہے۔''

جو ئندہ پا ئندہ

(جو کوشش کرتا ہے۔ پالیتا ہے)

نیگیٹیو بنی کیا ہے؟

سوال: آپ اکثر لوگوں کو مختلف تکالیف کے اِزالہ کے لئے نیگیٹیو بنی کا مشورہ دیتے ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک کالی تصویر دیکھنے سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟

جواب: دنیا میں کوئی بھی طریقہ علاج ہو، ایلو پیتھی، یونانی، ہومیو پیتھی یا ایکو پنکچر وغیرہ ہر طریقہ علاج کے پیچھے ایک تھیوری ہوتی ہے اور اس تھیوری کے پس منظر میں لوگوں کا تجربہ ہوتا ہے۔ کوئی آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ بخار کونین کی ایک گولی کھا لینے سے کس طرح اتر جاتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی ہو گا کہ اس دوا میں بخار کو کم کرنے کی تاثیر موجود ہے۔ اسی صورت سے ایکو پنکچر ایک طریقہ علاج ہے اور چائنہ میں ہزاروں سال سے رائج ہے۔

انہوں نے کچھ پوائنٹ(Points)مقرر کئے ہوئے ہیں۔سوئی سے اُن پوائنٹ کو چھیڑا جاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک پوائنٹ سے دوسرا پوائنٹ چونکہ جڑا ہوا ہے تو سوئی کی نوک جب ایک سرے پر لگتی ہے تو جسم کے اندر ایک خاص قسم کا کرنٹ Flow ہوتا ہے۔آپ نے دیکھا ہو گا کہ پیر میں سوئی لگتی ہے تو دماغ میں جھنجھلاہٹ سی ہوتی ہے کبھی آپ کو چیونٹی کاٹ لے تو دماغ میں جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ جس سسٹم کے اوپر یہ جسم قائم ہے،اُس سسٹم کو چھیڑ دینے سے(Chemical Changes)پیدا ہوتی ہیں اور ان کیمیاوی تبدیلیوں کی بنیاد پر انسانی جسم میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

اسی صورت سے یونانی علاج ہے ان کا طریقہ علاج یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب جسم کے اندر اگر کچھ ایسی رطوبتیں جمع ہو جائیں جن کا خارج ہو ناضروری ہو تو اس سے کئی قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے یعنی اس طریقہ علاج میں جو اخلاط زائد ہو جائیں ان کا تدارک کیا جاتا ہے۔اب یہ سوال ہے کہ جڑی بوٹی جسم میں جا کے کیسے خلط کو صاف کر دیتی ہے اس کا بھی جواب یہی ہے کہ ہر جڑی بوٹی کے اندر اپنی ایک خاصیت ہوتی ہے۔اس خاصیت کی بنیاد پر جسم کے اندر جو زائد چیزیں(رطوبتیں)ہوتی ہیں وہ نکال دیتی ہے اور جن چیزوں کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے ان کو محفوظ کر لیتی ہے۔تو اب بات یہ سامنے آئی کہ اس زمین پر جو کچھ ہے نباتات ہوں،جمادات ہوں یا حیوانی اجزاء ہوں،ہر ایک کی اپنی ایک خاصیت ہوتی ہے۔ایک طریقہ علاج تو یہ ہوا کہ مرض کی کیفیت دیکھ کر ایسی کوئی دوا تجویز کی جائے کہ جس میں یہ خاصیت اللہ نے رکھ دی ہو کہ اس مخصوص مرض کا اس سے اِزالہ ہو جاتا ہے۔یہ ایک ماڈی علاج ہے۔اس کے برعکس ایک اور علاج ہے جس کو آپ روحانی علاج کہتے ہیں۔ماڈی علاج میں اور روحانی علاج میں کچھ فرق ہے گو کہ روحانی علاج والے بھی ماڈی چیز کا سہارا لیتے ہیں۔چیز کی خاصیت کو بدلنے میں تبدیلی ہو جاتی ہے مثلاً جیسے کہ ابھی سوال کہ.... نیگیٹیو بنوا کر دیکھنے سے کس طرح کا فائدہ ہو جاتا ہے،کس قسم کے مرض ختم ہو جاتے ہیں؟

نفسیاتی امراض میں مثلاً ڈپریشن، ٹینشن، نیند نہ آنے کی شکایت، خوف وغیرہ میں بطور روحانی علاج ہم نے کئی مرتبہ نیگیٹیو بینی کا مشورہ دیا ہے۔ جیسا کہ میں نے تمہید میں آپ سے بیان کیا ہے کہ ہر چیز میں خاصیت ہوتی ہے۔ اس کلیہ کے تحت نیگیٹیو میں بھی کچھ خاصیت موجود ہے۔اس میں دو باتیں زیر بحث آتی ہیں ایک تو یہ کہ یہ علاج زیادہ تر دماغی امراض میں استعمال ہوتا ہے مثلاً ڈپریشن میں کہ ایک شخص کو مختلف منفی خیالات آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کو خیال آتا ہے کہ میرے اوپر جادو ہو گیا۔ اب اسے ہر چند کہا جائے کہ تمہارے اوپر جادو نہیں ہے لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ میرے اوپر جادو ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مریض کا ذہن ایک منفی خیال پر ٹھہر گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو اس کیفیت سے نکلنا چاہتا ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ نکلنا بھی نہیں چاہتا۔

اب اس کا روحانیت میں طریقہ علاج یہ ہے کہ جس آدمی کا ذہن ایک خیال پر مرکوز ہو گیا اور قائم ہو گیا اس بندے کو اس خیال سے ہٹا کر کسی دوسرے خیال میں ڈال دیا جائے۔ منفی خیال سے ہٹانے کیلئے روحانیت میں یہ طریقہ ہے کہ اس بندے کو اس خیال جس میں وہ گرفتار ہے اس کو یہ نہ کہو کہ یہ غلط ہے۔ یہ بھی نہ کہو کہ اس کو چھوڑ دو۔ اس لئے کہ وہ خود ہی چھوڑنا چاہتا ہے جب وہ چھوڑنے میں ناکام ہوتا ہے، جب ہی تو آپ کے پاس آتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس خیال کو ہٹا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاؤ۔ خیال کو کسی ایک نقطے سے ہٹا کر دوسرے پر مرکوز کرنا ایک مشق ہوتی ہے۔ اب نیگیٹیو بینی کے عمل کی علمی توجیہ یہ ہے کہ تخلیق کے دو رخ ہیں۔ ایک مثبت رخ ہے اور ایک منفی رخ ہے۔ ایک نیگیٹیو ہے ایک پوزیٹیو۔ ساری کائنات بھی نیگیٹیو اور پازیٹیو پر بنی ہوئی ہے۔ کیمرے سے تصویر کشی کے ذریعے اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ جب کیمرے سے ہماری تصویر اتاری جاتی ہے تو پہلے نیگیٹیو بنتا ہے۔ یہ نیگیٹیو الٹا ہوتا ہے اور جب اس نیگیٹیو کو دوسرے کاغذ پر پلٹا جاتا ہے تو وہ تصویر سیدھی ہوتی ہے۔ یہ الٹا ہونا اور سیدھا ہونا ایک مسلسل عمل ہے اور ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ اس بات کو اب ہم اس طرح بیان کریں گے کہ ہمارا جسم جو ہمیں سیدھا نظر آرہا ہے۔ یہ پوزیٹیو ہے اور جس نیگیٹیو کی یہ تصویر ہے وہ نیگیٹیو روح ہے۔ روح اللہ تعالیٰ کے ایک سسٹم کے تحت اپنی تصویر بناتی ہے اسے جسم کہتے ہیں۔ گوشت پوست اور ہڈیوں کے اس جسم کا جب ہم نے کیمرہ کے

ذریعے سے نیگیٹیو بنوایا تو ہوا یہ کہ یہ ہماری جو سیدھی تصویر ہے یہ تصویر الٹ گئی۔ الٹ کے یہ نیگیٹیو ہوگئی۔ نیگیٹیو ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تصویر نیگیٹیو ہونے کے باعث کہا جاسکتا ہے کہ یہ تصویر روح سے قریب ہوگئی کیونکہ روح نیگیٹیو ہے اور جسم پوزیٹیو ہے۔ جب پوزیٹیو کا نیگیٹیو بنا تو روح سے قریب ہوگیا۔ روح میں بیماری نہیں ہوتی، روح میں کوئی پریشانی بھی نہیں ہوتی۔ روح میں ٹائم اسپیس بھی نہیں ہوتا، روح کو نزلہ کھانسی بھی نہیں ہوتی اور روح کو دماغی مرض بھی نہیں ہوتا۔ تو جب ایک مریض پوزیٹیو کی حیثیت سے نیگیٹیو کو بار بار دیکھے گا اور اس کی طرف متوجّہ رہے گا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس بات کو جان نہیں رہے لیکن آپ جسمانی وذہنی طور پر اپنی روح کی طرف متوجّہ ہو رہے ہیں۔ اب جتنی توجّہ آپ کی روح کی جانب منتقل ہو گی جتنی زیادہ روح کے ساتھ آپ یکسو ہو جائیں گے اتنا ہی زیادہ منتشر خیالات ٹوٹ کر روح کے ایک نقطے پر مرکوز ہو جائیں گے اور اسی حساب سے روح کی تحریکات روح کی روشنیاں پوزیٹیو کو منتقل ہو جائیں گی۔ اب آپ یوں سمجھیں کہ ایک آدمی کا نیگیٹیو ہے اس نیگیٹیو کے اوپر دھبے ڈال دیں۔ اب اگر یہ نیگیٹیو صاف ہے تو جتنا نیگیٹیو صاف ہو گا اتنی ہی تصویر صاف آئے گی، خوبصورت آئے گی۔ روح میں داغ دھبے نہیں ہیں۔ روح میں بیماری بھی نہیں ہے۔ جب ہم بار بار روح کی طرف متوجّہ ہونگے تو ظاہر ہے روح کی تحریکات بھی ہمیں منتقل ہونگی اور جب روح کی تحریکات ہمیں منتقل ہو جائیں گی تو جو آپ کو خیالات ستا رہے ہیں بیماری سے متعلق وہ خیالات آپ بھول جائیں گے اور جب وہ خیالات آپ بھول جائیں گے تو صحت کی جانب قدم اٹھا لیں گے۔ تو پوزیٹیو کی حیثیت سے ایک نقطہ سے ہٹ جائیں گے جیسے جیسے ایک مخصوص خیال سے ہٹ جائیں گے اسی مناسبت سے بیماری سے متعلق ذہن میں خیالات کمزور پڑتے جائیں گے اور صحت کی طرف قدم بڑھائیں گے۔

اس کتاب میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے

سوال: اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور یہ متقیوں کو ہدایت دیتی ہے اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک کی سورہ البقرۃ میں فرمایا ہے کہ یہ کتاب ایسی ہے کہ جس میں کسی قسم کا شک وشبہ یا وسوسہ یا ابہام نہیں ہے۔ یہ کتاب متقی لوگوں کیلئے ہدایت کا سرچشمہ ہے پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ متقی لوگ کون ہیں، متقی وہ لوگ ہیں جن کا غیب پر یقین ہوتا ہے۔ غیب پر ایمان کا مطلب ہے یقین اور ان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوتا ہے۔ تو یہ کتاب ان لوگوں کو ہدایت بخشتی ہے اور جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اس کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں اور ان کا ایمان ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ خرچ کر رہے ہیں یہ ہمارا نہیں بلکہ یہ سب اللہ کا ہے۔ خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی وسائل ہمارے لئے موجود ہیں۔ زمین کے اوپر جیسے ماں باپ ہوں، اولاد ہو، بیوی بچے ہوں، رشتہ دار ہوں، کاروبار ہو۔ یہ سب اللہ کی عنایت ہے۔ اللہ کا دیا ہوا ہے، وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ قرآن کی ان آیتوں سے یہ بات بالکل پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کو سمجھنے کیلئے قرآن سے ہدایت پانے کیلئے چار باتوں کا ہونا ضروری ہے۔

1. ایک یہ کہ آدمی متقی ہو۔ 2. دوسرے یہ کہ اس آدمی کا غیب پر یقین ہو۔ غیب کے یقین کو روحانی لوگ مشاہدہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ غیب کو دیکھتا ہو 3. تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا اس سے تعلق قائم ہو اور 4. چوتھے یہ کہ جو کچھ اس کو مل رہا ہے یعنی پیدا ہونا، مرنا، جینا، جوان ہونا، اولاد، کاروبار سب کو وہ منجانب اللہ سمجھتا ہو۔ جب یہ چاروں صفات کسی انسان کے اندر آجائیں گی اس کو قرآن سے ہداہت ملے گی اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

یا حي یا قیوم کا کیا مطلب ہے؟

سوال: تصوّف کی اصطلاح میں یا حي یا قیوم کا کیا مطلب ہے؟

جواب: یا حي یا قیوم تو اللہ کے نام ہیں۔ اصطلاح تو اسے کہتے ہیں کہ کوئی علم ہے اور اس علم کو سمجھانے کیلئے ایک نقطہ آپ اپنی طرف سے بناتے ہیں اور پھر اس کی تشریح کرتے ہیں مثلاً حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے لوح و قلم میں بہت ساری اصطلاحات قائم کی ہیں۔ ان میں سے ایک اصطلاح عالمِ ''جُو'' ہے۔ عالمِ جُو کا ترجمہ و معنی لغت میں نہیں ملیں گے تو وہ اس کی تشریح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب کائنات بنائی تو سارے کا سارا ریکارڈ لوح و محفوظ پر نقش ہو گیا۔ لوحِ محفوظ سے نزول کرے ایک اور اسٹیج سے وہ پروگرام نشر ہوتا ہے اسے لوح دوئم آپ کہہ سکتے ہیں۔ اب لوح دوئم کیلئے حضور باباصاحبؒ نے عالمِ ''جُو'' ایک اصطلاح قائم کر دی کہ عالمِ جُو کا مطلب ہے کہ لوحِ محفوظ کے نیچے بھی ایک اور لوحِ محفوظ ہے۔

اب اگر یہ کہتے ہیں کہ لوحِ محفوظ سے نیچے ایک اور لوحِ محفوظ ہے تو پھر یہ کہنا پڑتا ہے کہ لوحِ محفوظ نمبر 1 اور لوح محفوظ نمبر 2 یا لوحِ محفوظ نمبر 3... تو آدمی کے دماغ میں یہ بات آتی ہے کہ اتنی لوحِ محفوظ کس طرح ہو سکتی ہیں؟

لوحِ محفوظ کے بعد جو دوسرا مقام ہے یا زون ہے یا درجہ ہے یا مرتبہ ہے اس کے لئے انہوں نے عالمِ جُو کے نام سے ایک اصطلاح قائم کر دی۔ اب جہاں بھی لوح و قلم میں کوئی بندہ عالمِ جُو پڑھے گا وہ خود بخود یہ سمجھ لے گا کہ لوحِ محفوظ کے بعد جو دوسرا درجہ ہے اس کے بارے میں یہ بیان ہے۔ یا حي یا قیوم اللہ کے نام ہیں اللہ کے نام کی کوئی اصطلاح نہیں ہوتی ہے۔ نام، نام ہوتا ہے۔